قلابازیاں



پاکستانی سیاستدانوں کی

قلابازیاں

مصنف

یوسف خان

ادارۃ الاویسین ○ لاہور

کتاب .... "قلابازیاں"
مصنف .... یوسف خان
باہتمام .... مقصود احمد چغتائی
ناشر .... محمد اکمل اویسی پیرزادہ
زیر نگرانی .... راحیلہ بشیر
اشاعت .... جنوری 2007ء
تعداد 1000
ایڈیشن .... اول
قیمت .... 250 روپے
کمپوزنگ .... الاویس کمپوزنگ سنٹر
کمپیوٹر کوڈ 10i28

رابطہ خط و کتابت

ادارہ الاویس القرطبہ مارکیٹ 5-فیروز پور روڈ
مزنگ چونگی لاہور۔ فون:7575836



ادارہ الاویس لاہور

انتساب

جناب مجید نظامی

مدیرِ اعلیٰ روزنامہ نوائے وقت

چیف ایڈیٹر دی نیشن

کے نام

فہرست

حرف تحسین

یوسف خان ایک منجھے ہوئے قلمکار اور باخبر صحافی کی حیثیت سے خبر ونظر کے دائرے میں اپنی ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ان کا قلم ہمیشہ عوام کی امانت رہا ہے اور ان کی تحریریں حکرانوں کو آئینہ دکھاتی ہیں، کتاب کا انتساب بابائے صحافت ثانی مجید نظامی کے نام سے کیا ہے۔سیاستدانوں سے ان کی ذاتی تعلقات بہت محدود ہیں مگر سارے سیاستدانوں کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فضائیہ کے طیارے کی رفتار کیا ہے اور سیاستدانوں کی قلابازیاں کیوں اور کیونکر لگتی ہیں۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قلابازیاں کسی وقت جرات کی علامت ہوتی ہیں اور کسی وقت کھوکھلے پن کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یوسف خان نے بڑی مہارت سے سیاستدانوں کے رویوں کو اپنے کالموں میں اجاگر کیا ہے۔ موصوف نے بے نظیر سیاستدانوں سے لے کر شریف سیاستدانوں تک اپنے خامۂ عنبر شامہ سے سرفراز کیا اور سیاسی نشیب وفراز اور اقتدار کی جنگ کے دلچسپ واقعات کو صدر اور وزیراعظم کے درونِ خانہ معاندانہ رویوں کو خوبصورتی سے ہوا دی ہے یوسف خان نے الطاف حسین کی شادی سے لے کر ڈیانا کی قبر تک اور کراچی کے سیاستدانوں سے لے کر امریکی کھانوں کی یلغار کو بڑے افتخار سے پیش کیا ہے باپ بیٹے کی سیاست سے لے کر برادر نسبتی کی سیاست کے در پردہ حقائق کو بے نقاب کیا ہے یوسف خان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے سیاستدانوں کے فرصت اوقات میں جن مشاغل کا ذکر کیا ہے وہ کوئی محرم راز درونِ مے خانہ ہی ایسے واقعات کو منظر عام پر لاسکتا ہے یوسف خان ایک سچے، کھرے اور مضبوط کردار کے صحافی ہیں انہوں نے اپنے کالموں میں

مصوری نہیں کی بلکہ فوٹو گرافری کی ہے۔ ہمارے سیاستدانوں کے چہروں پر غازہ لگا کر کوئی ندرت پیدا نہیں کی بلکہ انہیں آئینہ دکھایا گیا ہے مجید لاہوری کہا کرتے تھے کہ ایک اچھا صحافی فوٹو گرافر ہوتا ہے وہ مصور نہیں ہوتا۔ وہ افریقہ کی کسی کالی کلوٹی خاتون کو امریکہ کی حسین و جمیل دوشیزہ ظاہر نہیں کر سکتا اور مصور کر سکتا ہے۔ یوسف خان نے مصوری نہیں کی بلکہ فوٹو گرافری کی ہے۔ وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ عالمی سیاح مقصود چغتائی نے ان کے کام کو آسان کر دیا ہے جنہوں نے ان کالموں کو یکجا کر کے کتابی صورت دے دی ہے اور نام بھی خوب انتخاب کیا ہے۔ ''قلابازیاں'' ہاں قلا بازیاں فضائیہ کے طیارے کی ہوں یا سیاستدانوں کی یہ کبھی کبھی جرات کی اور کبھی کبھی کھوکھلے پن کی نشاندہی کرتیں ہیں۔ یوسف خان نے آنے والی نسلوں کے لئے تاریخ لکھی ہے اور ایک مورخ کی حیثیت سے غیر جانبدارانہ رائے کا خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔ یہ کتاب مدتوں دانشوروں کے زیر مطالعہ رہے گی۔ سیاستدان اپنے عروج و زوال کی داستانیں پڑھ کر اپنی آئندہ کی سیاسی حکمت عملی کو تعمیری خطوط پر استوار کریں گے۔ یوسف خان کی کتاب سیاستدانوں کو علاج گردش لیل و نہار کے مختلف ادوار سے روشناس کراتی رہے گی آپ صحافی برادری کی ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ یوسف خان کے کالموں کے انتخاب پر مشتمل کتاب کی اشاعت عالمی سیاح مقصود چغتائی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ اس کی دیدہ زیبی اور تزئین و آرائش کے عقب میں پیرزادہ اکمل اویسی اور راحیلہ بشیر کی محنت شاقہ کی جھلک نظر آتی ہے۔

والسلام

محمد منشا قاضی

ایڈیٹر ہفت روزہ بدلتا عالم لاہور

حرف اول

سیاست پر گفتگو کرنا تو آسان بات ہو سکتی ہے مگر سیاست پر پوری ذمہ داری سے لکھنا بہت مشکل ہے۔

سیاستدان اگر حکومت میں ہوں تو ملک کی باگ سنبھالنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ملک کا نظم ونسق چلانے کے لئے صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے ورنہ حکومت کے ناکام ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سیاستدان اگر حکومت میں شامل نہ ہوں تو اپوزیشن کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی تالا بند ہڑتال، کہیں توڑ پھوڑ اور کہیں لاء اینڈ آڈر کے خلاف تحریک چلانے کی جستجو۔

سیاستدان کے اصول و رموز عادات اور مشاغل اور حرکات پر نظر رکھنا صحافیوں کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ یوسف خان کا نام پاکستان کے ان چند صحافیوں میں شمار ہوتا ہے جو پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مشاہدات کو تحریر کر رہے ہیں اور ان کی تحریروں میں انتہائی درجے کا توازن موجود ہے۔ ان کی تحریریں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہیں اور ان میں کسی ایک پارٹی کی طرف جھکاؤ نہیں نظر آتا۔ یقیناً یہ امر خود غرضی اور لالچ سے بالاتر ہو کر ہی ممکن ہے۔

ہم ان کی تحریریں پچھلے بائیس چوبیس سال سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی صلاحیتوں سے پوری طرح قائل ہیں۔ وہ دو سال کراچی پریس کلب کے جنرل سیکرٹری بھی

رہے ہیں اور وسیع حلقہ احباب رکھتے ہیں۔

دو سال قبل جب ان سے ملاقات ہوئی اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کی ذاتی شخصیت سے اور بھی زیادہ مرعوب ہوئے کیونکہ وہ انتہائی سادہ طبیعت، ہنس مکھ اور بے ضرر انسان ہیں۔

میں جناب یوسف خان صاحب کے لئے دعا گو ہوں کہ وہ ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کریں اور ایک محب وطن شہری اور بے باک صحافی کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

دعا گو
مقصود احمد چغتائی
سیاح و مصنف
394، بلاک G/4
محمد علی جوہر ٹاؤن، لاہور

پاکستانی سیاست دانوں کی قلابازیاں

ملک کے ممتاز سیاستدان افتخار گیلانی کی پاکستان پیپلز پارٹی سے مسلم لیگ میں واپسی سیاست میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہے یہ سیاستدان مسلم لیگ سے پی پی میں آئے تو کم وبیش اس نوعیت کی باتیں کی تھیں جیسی اب پی پی پی سے نکلتے وقت کی ہیں۔ایک صلاحیت ان کی یہ ہے کہ جس پارٹی میں جائیں اس کی لیڈر شپ کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ پیپلز پارٹی میں تھے تو بینظیر بھٹو کے قریب تھے ان کا بڑا اعتماد حاصل تھا۔نواز شریف کے پاس گئے تو ان کے بھی بہت کلوز ہوگئے۔اب افتخار گیلانی اپنے نئے لیڈر میاں اظہر کے قریب ہیں۔صدر مملکت جنرل پرویز مشرف سے مل چکے ہیں۔وزیر اعظم کے عہدہ کے لیے ان کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔اس لحاظ سے ٹاپ امیدواروں میں ان کو شامل سمجھا جا رہا ہے۔

فوجی حکومت کے لیے مشکل یہ آ پڑی ہے کہ اسے نواز شریف کے جانشین کی تلاش ہے۔اس کے لیے دس سے پندرہ امیدوار لائن لگائے کھڑے ہیں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔نواز شریف ایک بار مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے وزیر اعظم بنے اس سے پہلے ان کو وزیر اعظم بنایا گیا تو مسلم لیگ پنجاب کے صدر تھے۔نواز شریف نے کیریئر کی ابتدا کی تو اصغر خان کی تحریک استقلال میں گئے۔اصغر خان کی دیانتداری پر اعتماد کا اظہار کیا۔پھر ایک روز اصغر خان کو چھوڑ گئے جو بڑے افسوس سے آج تک لوگوں کو

بتاتے ہیں کہ نواز شریف میری پارٹی میں تھے۔ مگر نواز شریف نے یہ البتہ نہیں کیا کہ ایک دوسرے کی مخالف پارٹیوں میں چلے جائیں کبھی پیپلز پارٹی میں نہیں گئے۔ آخری بار جب اقتدار میں تھے یہ کہا کرتے تھے کہ پیپلز پارٹی کا نام سن کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ اصغر خان نے اپنے طویل کیریئر میں جس میں ان کو اب تک اقتدار نہیں ملا کئی پارٹیاں بدلیں مگر ان کی یہ صلاحیت ہے کہ خود نئی پارٹی ایک کے بعد دوسری پارٹی بنا لیتے ہیں۔ اپنا جب سیاسی کیریئر شروع کیا تو ذوالفقار علی بھٹو کے قریب تھے پھر ان سے اختلاف ہوگیا جسٹس پارٹی بنائی پھر اس کو ختم کر دیا۔ تحریک استقلال بنائی تو لوگ کہتے تھے ان میں تحریک تو ہے استقلال نہیں ہے مگر فوجی حکومت کے خلاف ڈٹے رہے۔ اپنی نظر بندی میں ''جنرلز ان پالیٹیکس'' لکھی۔ شاید اس طرح اس حقیقت کو بھلانے کی کوشش کی کہ بھٹو کے خلاف فوج کو آنے کی دعوت انہوں نے دی تھی۔ مگر ایک معاملہ میں ان کے مخالفین صحیح ثابت ہوئے۔

کراچی میں دو سیاسی کارکن احمد دارا اور ناہید افضال تحریک استقلال کے سرکردہ رہنما ہیں۔ دونوں سے ان کے دوست کہتے تھے کہ اصغر خان تحریک استقلال چھوڑ دیں گے آپ دونوں نہیں چھوڑیں گے۔ دونوں کہتے تھے ایسا کبھی نہیں ہوگا نہ اصغر خان چھوڑیں گے نہ ہم۔ ان کی پہلی بات غلط ثابت ہوئی۔ اصغر خان اپنی پارٹی تحریک استقلال کو چھوڑ کر اپنے بیٹے عمر اصغر کی پارٹی میں چلے گئے۔ تحریک استقلال کے کارکنوں کو صدمے کی کیفیت سے دوچار چھوڑ گئے بہت سے اب تک یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ اصغر خان ان کو چھوڑ چکے ہیں۔ عمر اصغر خان بنیادی طور پر این جی او کے آدمی تھے۔ سیاستدان نہیں تھے۔ مری اور ایبٹ آباد کی اِکا دُکا دیواروں پر ان کی این جی او ''سانگی'' کے مٹے ہوئے نعرے نظر آتے تھے۔ عمر اصغر خان نے وفاقی وزارت سے اچانک استعفیٰ دے دیا۔ ان کو بعض لوگ وزیر اعظم کا امیدوار سمجھتے تھے۔ پھر کراچی میں اپنے ایک عزیز کے گھر پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے۔ ان کے والد اصغر خان کا ایک اور مشغلہ سیاسی اتحاد بنانا اور ان کو توڑنا تھا۔ پی این اے ایم آر ڈی سب سے الگ ہوئے آخری بار غنوئ بھٹو کے الائنس میں شامل تھے۔

سیاست میں غیر مستقل مزاجی کے باوجود اصغر خان نے پی پی کو اعتزاز احسن جیسا سیاستدان دیا جن کو اصغر خان نے محض اس بات پر نکال دیا تھا کہ کسی جلسہ میں اعتزاز احسن کے حق میں نعرے لگ گئے تھے۔ جب اصغر خان آمرانہ انداز میں تحریک استقلال کو چلا رہے تھے کراچی کے ایک دانشور نفیس صدیقی ان کے ساتھ تھے۔ نفیس صدیقی کی سیاست کے معاملہ میں شہرت اصغر خان سے کم نہیں ہے۔ تحریک استقلال سے پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل پیپلز پارٹی، مسلم لیگ پھر پیپلز پارٹی تک سفر کر چکے ہیں۔ سیاست میں شہری آزادیوں کی کونسل کے ذریعہ زندہ رہتے ہیں۔ اب ایک این جی او قائم کر چکے ہیں اب تک اصغر خان، بینظیر بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی، نواز شریف کو اپنا لیڈر قرار دے چکے ہیں۔ نفیس صدیقی کراچی کے محاذ پر سرگرم رہتے ہیں۔ نوابشاہ کے ایک سیاستدان مراد علی شاہ سیاسی پارٹیوں کے معاملہ میں خاطر خواہ طور پر مشہور ہیں۔ مراد علی شاہ جو بہت اچھے میزبان ہیں سیاسی وفاداریاں بدلنے میں دیر نہیں لگاتے، بڑی پھرتی سے کام لیتے ہیں۔ سندھ میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان کئی بار سفر کر چکے ہیں۔ سیاستدان کی حیثیت سے عقابی نگاہوں کے مالک ہیں جس پارٹی کو اقتدار میں آتا دیکھیں اس میں شمولیت اور جس پارٹی کے ہاتھوں سے اقتدار جاتا دیکھیں اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی ایک پارٹی میں مستقل بنیاد پر رہنا ان کی سیاست میں نہیں ہے۔ یہی کیفیت عرصہ تک سندھی قوم پرست سیاستداں مخدوم خلیق الزماں کی رہی ہے۔ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر ان کے بھائی مرتضیٰ کا ساتھ دیا پھر مرتضیٰ کو بھی چھوڑ دیا۔ اب ویسٹرن سوٹ پر سندھی ٹوپی لگا کر سفارتی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ سندھ میں پانی کی کمی ان کا پسندیدہ موضوع ہے اس پر ہر موسم میں اظہار خیال کرتے پائے جاتے ہیں۔

سندھ کے وڈیرے سیاسی فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس وقت زیادہ تر وڈیرے پیپلز پارٹی میں ہیں، کچھ مسلم لیگ (قائداعظم) میں، کچھ مسلم لیگ (فنکشنل) میں ہیں بعض ایک نئے اتحاد سندھ ڈیموکریٹک الائنس میں چلے گئے جس کے روح رواں مرتضیٰ

جتوئی ہیں۔ سندھ کے طاقتور وڈیرے مرتضیٰ جتوئی کے والد غلام مصطفیٰ جتوئی کی کال پر اپنی اوطاقوں سے نکل کر جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف ۱۹۸۳ء میں سڑکوں پر نکلے تھے۔ وڈیروں نے عملی طور پر جیلیں بھر دی تھیں۔ بعض تو آج تک دعویٰ کرتے ہیں کہ اس تحریک کی بدولت ۱۹۸۵ء میں الیکشن ہوئے ورنہ فوجی حکومت تیار نہ تھی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھٹو خواتین کا اس وقت ساتھ دیا جب ان کا کوئی مرد ملک میں نہ تھا۔ جتوئی نے اقتدار ٹھکرایا تو بینظیر بھٹو نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ انکل سے نجات حاصل کرلی۔ جتوئی نے اپنی الگ پارٹی بنائی مگر بینظیر کی نکتہ چینی کا یہی جواب دیا۔ آپ شیشے کے محل میں رہ کر ہم غریبوں کے پتھر کے گھر پر پتھر نہ ماریں نقصان آپ کا ہوگا۔ جتوئی نے ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی اور وفاداریاں ہمیشہ نبھائیں آج تک اسی رشتہ کی بدولت بینظیر کو اپنے دوست کی بیٹی کہتے ہیں۔

بینظیر بھٹو نے جن انکلوں کو فارغ کیا ان میں ملک غلام مصطفیٰ کھر نمایاں تھے۔ کھر نے جتوئی کی یہ خدمت کی کہ ۱۹۸۸ء کے الیکشن میں نوابشاہ سے ہارنے والے سیاستدان کو کوٹ ادو سے منتخب کرایا۔ اس انتخاب کی بدولت جتوئی پہلے لیڈر آف اپوزیشن پھر کیئرٹیکر پرائم منسٹر بن گئے۔ صرف پرائم منسٹر بننا شاید ان کی قسمت میں نہیں جسے جنرل حمید گل نے عین وقت پر سبوتاژ کر دیا۔

غلام مصطفیٰ کھر کو اس لحاظ سے پاکستان کا منفرد سیاستدان قرار دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پہلے ایک باپ سے غداری کی پھر اس کی بیٹی کے ساتھ وفاداری نہیں نبھائی اب پھر اس کے ساتھ ہیں۔ کھر نے جن کی بدولت ذوالفقار علی بھٹو پنجاب میں غیر مقبول ہوئے، ان کی حکومت کے دور میں ہی ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا پھر صلح کرلی۔ بیگم نصرت بھٹو کے ذریعہ معافی مانگ لی۔ جب فوجی حکومت آئی تو اس کو دھوکہ دے کر لندن چلے گئے۔ واپس آئے تو کہا میں ملک کو بچانے آیا ہوں۔ بینظیر بھٹو کی حکومت میں وزارت لی۔ کبھی ساتھ ہوئے کبھی الگ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آج کل کس کے ساتھ ہیں۔ ماضی

میں ''شیر پنجاب'' تھے اب شاید کچھ نہیں ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھیوں میں سے ممتاز بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ نے کم وبیش ایک ہی جیسے کام کیے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں سندھی بلوچ پشتون فرنٹ لندن میں بیٹھ کر بار بار پاکستان کو ناکام قرار دینے کی پوری زبانی کوشش کی پھر کبھی آ کر نئے فرنٹ بنائے کبھی قومیتوں کا اتحاد بنایا۔ پیپلز پارٹی سے نکلنے والے یہ ذہین سیاستدان آج تک کسی پولیٹیکل آؤٹ فٹ میں سیٹ نہیں ہو سکے۔ ممتاز بھٹو نگران وزیر اعلیٰ رہے تو سندھ پر غیر منصفانہ این ایف سی ایوارڈ مسلط کر گئے جس پر سندھی عوام ان کو آج تک برا بھلا کہتے ہیں۔ عبدالحفیظ پیرزادہ نے سیاست سے وکالت میں پناہ ڈھونڈ لی۔ کامیاب وکالت کرتے ہیں۔ ایک کیس میں استغاثہ اور صفائی دونوں نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ سندھ کے ایک سیاستدان پرویز علی شاہ ہیں جنہوں نے ۱۹۸۸ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پیر پگارہ کو ہرایا تو فاتح پگارہ کہلائے۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ کے مستقل امیدوار ہیں۔ بینظیر بھٹو کے ساتھ تھے پھر بیگم نصرت بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو کے خلاف ہوئے پھر دونوں کے ساتھ اور بینظیر بھٹو کے خلاف ہو گئے۔ آخر میں سب کے خلاف ہو کر آفتاب شیر پاؤ سے جا ملے۔ شیر پاؤ کے فرار کے بعد تحریک انصاف میں چلے گئے۔ عمران خان کو اپنا لیڈر مان لیا۔ اب فتحیاب علی خان کے ساتھ مل کر اربن رورل الائنس بنایا ہے کہ سندھ کے دو سیاستدانوں خادم علی شاہ اور پیر آفتاب شاہ جیلانی نے یہی کیا۔ کبھی بینظیر کا ساتھ دیا کبھی چھوڑا۔

خادم علی شاہ، غنویٰ بھٹو کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے چلے گئے۔ پیر آفتاب بینظیر بھٹو کے پاس واپس آ گئے ہیں۔ اتفاق سے دونوں سیاستدانوں کا معاملہ سیٹ کے مسئلہ پر آصف زرداری کی میز پر جا کر رکتا ہے آصف زرداری ان کی جگہ جس کو پسند کر کے لائے اس نے پی پی پی سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ تحریک انصاف کے سکریٹری جنرل معراج محمد خان کا معاملہ اس لحاظ سے مختلف نہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی رکن ہونے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ سندھ میں پی پی پی کے خلاف علم بغاوت بلند

کرنے والے پہلے سیاستدان تھے۔ قومی محاذ آزادی بنائی، بھٹو کے خلاف تحریک میں حصہ لیا، بھٹو کی پھانسی کا مطالبہ کیا۔ پھانسی کے بعد بھٹو کی بیوہ اور بیٹی کے ساتھ ہو گئے۔ بینظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے بعد معراج محمد خان نے بڑے پینترے بدلے کبھی نواز شریف کے ساتھ ہوئے کبھی الطاف حسین کے پاس جا کر بیٹھ گئے آخر میں عمران خان کے سکریٹری جنرل ہو گئے جو بینظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں کے خلاف ہیں۔ معراج محمد خان نجی محفلوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ عمران خان عوامی سیاستدان نہیں ہیں وہ ان کے امریکیوں سے رابطہ کے خلاف ہیں مگر مصلحت کے تحت خاموش رہتے ہیں۔

پنجاب کے سیاستدان خاموش رہنے کے قائل نہیں ہیں جب تک ساتھ رہتے ہیں کھل کر ساتھ دیتے ہیں جب خلاف ہوں تو کھل کر خلاف ہو جاتے ہیں۔ نواز شریف نے محمد خان جونیجو کے ساتھ جو کچھ کیا ان کے ساتھ وہی ہوا۔ مسلم لیگ ان کو چھوڑ گئی۔ پہلی بغاوت میاں اظہر نے لاہور سے کی جو صحیح معنوں میں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ میاں اظہر نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا کہ نواز شریف کو ان کی حکومت میں چیلنج کیا۔ چودھری شجاعت، اعجاز الحق، مجید ملک، فخر امام، عابدہ حسین اقتدار جاتے ہی نواز شریف کے مخالف ہو گئے۔ پوری مسلم لیگ خالی ہو گئی جس میں لے دے کر جاوید ہاشمی اور ظفر الحق رہ گئے ہیں، سندھ میں ممنون حسین سلیم ضیا اور نہال ہاشمی بدستور نواز شریف کے ساتھ ہیں الٰہی بخش سومرو، لیاقت جتوئی، حلیم صدیقی، علیم عادل شیخ اور مقبول شیخ سب ساتھ چھوڑ کر مسلم لیگ (قائداعظم) میں آچکے ہیں۔ مسلم لیگ (نواز شریف) کے سلیم ضیا کا معاملہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پہلے پیپلز پارٹی میں تھے پھر پنجابی پختون اتحاد میں گئے وہاں سے مسلم لیگ میں آ گئے۔ نواز دور کے شیر کراچی اظہر عباس زیدی نے خاموشی سے نواز شریف کو چھوڑا مگر ہم خیالوں کے ساتھ جانے کے بجائے مسلم لیگ (قیوم گروپ) میں چلے گئے جس کے مرکزی آرگنائزر ہو گئے۔ خان عبدالقیوم خان اس لحاظ سے خوش قسمت مرحوم سیاستدان ہیں جن کے نام پر قائم پارٹی آج تک برقرار ہے۔ سید ضیا عباس بھٹو دور میں مسلم لیگ

(قیوم گروپ) کے مرکزی سکریٹری جنرل تھے اب بھٹو کے ساتھی غلام مصطفیٰ جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی میں ہیں۔ خان امان اللہ خان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے صدر ہیں، چھوٹی سی پارٹی بڑے اتحاد اے آر ڈی میں شامل ہے جس میں روایتی مخالف بینظیر بھٹو اور نواز شریف ساتھ بیٹھے ہیں۔ بینظیر نواز شریف کو آمریت کی پیداوار اور گوالمنڈی کا سیاستدان کہتی تھیں۔ نواز شریف بینظیر کو سیکیورٹی رسک اور سب سے کرپٹ کہتے تھے آج دونوں ساتھ ہیں۔ سیاست کی اس سے بڑی قلابازی اور کیا ہوگی۔

اردو میڈیم قوم کے انگلش میڈیم حکمران

پاکستانی قوم بڑی مسکین ہے اس پر جو مسلط ہو جائے اسے قبول کر لیتی ہیں۔ اس پر بنیادی طور پر انگلش میڈیم طبقہ مسلط رہا سیاسی خاندانوں تاجروں صنعتکاروں اور فوجیوں کی حکومتیں رہی ہیں ان سب کی زبان انگریزی ہے یہ ملک کا پاورفل طبقہ ہے۔ یہ لوگ انگریزی میں سوچتے بولتے اور لکھتے ہیں۔ نواز شریف ان سے ذرا مختلف تھے کہ بیرون ملک تعلیم نہیں پائی انگریزی کمزور تھی۔ مگر ابتدائی تعلیم انگریزی اسکولوں میں حاصل کی اپنی کلاس کے شرمیلے طلباء میں شمار ہوتے تھے اقتدار کے ابتدائی دنوں میں شرمیلے رہے پھر جب پاور بروکرز کے بہت قریب آ گئے تو فخر سے کہتے تھے میں محاذ آرائی کی پیداوار ہوں۔ نواز شریف کی ایک تقریر کا پہلے دور میں مذاق اڑایا گیا جس میں انہوں نے یو ایس (US) کو اُس (ہم) پڑھ دیا تھا۔ مگر انگریزی کی کمزوری کے باوجود ملک کے سب سے طاقتور حکمران کچھ عرصہ کے لیے ثابت ہوئے۔ فاروق لغاری کو اچانک ہیلی کاپٹر میں چوٹی پہنچ کر یہ بتا کر حیران کر دیا کہ میں آٹھویں ترمیم ختم کر رہا ہوں صدر کے حکومت کو برطرف کرنے کے اختیارات ختم کر کے بہت پاورفل بن گئے۔ اتنے پاورفل کہ ایک آرمی چیف کو گھر بھیجنے کے بعد دوسرے کو گھر بھیجنے کا حکم دے دیا اپنے خالق ادارہ سے ٹکرائے تو پاش پاش ہو گئے۔ اپنے بکھرے ہوئے ٹکڑے سمیٹ کر سعودی عرب کی جلاوطنی قبول کر لی اب پورا شریف خاندان واپس آنا چاہتا ہے اس سارے عمل میں حکومت شریف فیملی عدلیہ سب کو نقصان ہوا

ہے۔ کسی ایک صوبہ میں نواز شریف کی مقبولیت بڑھ گئی ہو تو مگر ملک گیر امیج زیر و رہ گیا ہے۔

اس خلاء کو پر کرنے کے لیے آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ بے نظیر بھٹو نے واپسی کی ٹھانی ہے۔ بے نظیر بھٹو کی اردو اتنی کمزور ہے جتنی نواز شریف کی انگریزی۔ ۱۹۸۶ء میں جب جلاوطنی سے واپس آئیں تو رومن میں لکھ کر تقریریں کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اردو لکھتی رہیں۔ ورکرز سے اردو میں بات کرنا ضروری ہے انگریزی سمجھتے نہیں ہیں۔ سندھی بھی معمولی آتی ہے۔ اب اتنا ہو گیا ہے کہ اردو اخبارات پڑھ لیتی ہیں پھر بھی کبھی کبھار غلطیاں ضرور کر دیتی ہیں۔ ایک بار رمضان میں اذان ہونے پر بولیں، اذان بج رہا ہے، اس پر کئی کارٹون بنے۔ بے نظیر بھٹو کی مادری زبان فارسی ہے ان کی خالائیں ایران میں رہتی ہیں مگر ان کو فارسی سے ذرا شغف نہیں ہے۔ بیگم نصرت بھٹو کی البتہ اردو اچھی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں غنویٰ بھٹو نے جب پہلی بار پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا مرتضیٰ اس وقت دمشق ہی میں تھے، تو بیگم بھٹو نے اخبار نویسوں سے غنویٰ کا تعارف کرایا ان کے نام پر اخبار نویس حیرت کا اظہار کرنے لگے تو انہوں نے کہا یہ مغنی سے نغمہ سے بنا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو بات چیت میں محاوروں کا استعمال خوب کرتی ہیں۔ جب بے نظیر بھٹو نے ان کو پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہی سے ہٹایا تو انہوں نے صرف اتنا کہا ''انہوں نے اپنا منہ کالا کیا ہے، میں کیا کہہ سکتی ہوں''۔ بیگم بھٹو پاکستان کی سیاست کی سب سے مظلوم خاتون ہیں جن کے شوہر کو پھانسی ہوئی دونوں بیٹے جوانی میں ہلاک ہوئے۔ ایک بیٹی کے شوہر پر قتل کا مقدمہ ہے دوسری بیٹی کی شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ بھٹو فیملی نے جنرل ضیاء الحق کو ہمیشہ ظالم سمجھا جن کی اردو بہت شستہ تھی۔ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے تعلیم یافتہ تھے انڈیا کے ایک اخبار نے ان کی مارک شیٹ چھاپی تھی انگریزی اور حساب میں کمزور تھے۔ اس تعلیمی کمزوری کے باوجود وہ پاورفل فوجی حکمراں تھے۔ ہر فوجی حکمران کی طرح سیاست کو ناپسند کرتے تھے مگر جب اقتدار پر قابض ہوئے تو خود سب سے بڑے سیاستدان ثابت ہوئے جنہوں نے

سیاستدانوں کو مہارت سے انگلیوں پر نچایا۔ اگرچہ اقتدار کے ابتدائی دنوں میں ان کی یہ کمزوریاں تھیں جن میں اپنے خیالات کا فی الفور برملاء اظہار شامل تھا۔ رفتہ رفتہ سیاست میں آ گئے۔ مسکرانے اور بات کو گول کرنے کے فن میں ماہر ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق کو مڈل کلاس کا حکمراں قرار دیا جاسکتا ہے جب تک اقتدار میں رہے فوجی وردی میں رہے ہلاک اسی وردی میں ہوئے سیاستدانوں کی طرف سے اس مطالبہ کو کبھی پورا نہیں کیا کہ وردی اتار کر سیاست میں آئیں۔ بھٹو خاندان کتنی مخالفت کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ جنرل ضیاء الحق خود ذوالفقار علی بھٹو کے چوائس تھے جس طرح جنرل پرویز مشرف خود میاں نواز شریف کی چوائس تھے۔ جنرل ضیاء اور جنرل مشرف دونوں کو پروموٹ کر کے آگے لایا گیا۔ دونوں نے اپنے وزرائے اعظم کو برطرف کردیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق اردو اخبارات کے کالم پڑھ کر کالم نویسوں کو فون کرتے تھے۔ جنرل پرویز مشرف کو اخبارات پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں ہے سمری پر ان کا گزارہ ہے۔ فوجی بنیادی طور پر انگلش میڈیم ہوتے ہیں جو اردو میڈیم بیک گراؤنڈ سے آتے ہیں ان کو بھی تربیت دے کر انگریزی میں رواں کر دیا جاتا ہے جنرل پرویز مشرف سینٹ پیٹرک کے طالب علم رہے ہیں۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں ڈیبیٹر تھے۔ انگریزی میں خاطر خواہ مہارت ہے اس کا مظاہرہ سی این این پر براہ راست پروگرام میں سوالوں کا جواب دے کر کر چکے ہیں۔ جنرل مشرف کی ٹیم انگلش میڈیم ہے جاوید جبار جو بیوروکریسی کے تنازعہ کی وجہ سے مستعفی ہوئے۔ شوکت عزیز عبدالستار، شاہدہ جمیل، رزاق داؤد، سب انگلش میڈیم کلاس کے ہیں۔ یہ رولنگ کلاس ہے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کو اس کلاس پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ نواز شریف کو کم بے نظیر کو زیادہ نواز شریف کی ٹیم میں البتہ کچھ بندے رہے تھے جو مڈل کلاس سے آئے تھے جن میں اسحاق ڈار نمایاں تھے یہ طبقہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے آگے بالکل سرنڈر کے حق میں نہیں ہے شاید یہی وجہ ہے کہ عالمی اداروں کی اب سرے سے کوئی مزاحمت نہیں ہو رہی ہے۔ فوجی حکومت میں شامل فوجی افسر سارے انگلش میڈیم طبقہ کے ہیں اگرچہ جنرل ضیاء

الحق کے بعد سے اردو میڈیم طبقہ اوپر آیا ہے مگر سارا کھیل تو انگلش میڈیم والوں کے ہاتھوں میں ہے ان کو یہ اندازہ مشکل سے ہوتا ہے کہ ملک کے شہروں اور دیہات میں کیا مسائل ہیں کیا لاوا پک رہا ہے۔ یہ طبقہ غریبوں سے زیادہ شوبز، کی خبروں میں دلچسپی رکھتا ہے اس کی خواتین (Gossip) گوسپ (سرگوشیوں) پر جان دیتی ہیں۔ کسی کو اتفاق سے اس انگلش میڈیم طبقہ کی تقریب میں جسے عام طور پر پارٹی کہا جاتا ہے شرکت کا موقع مل جائے تو شرکاء کی گفتگو زیادہ تر لندن پیرس نیویارک دبئی کے دوروں، بیگمات کے جھگڑوں ان کی اولادوں کے افیئر ز، شاپنگ ڈیزائن اور فیشن تک محدود ہوتی ہے۔ یہ طبقہ کلاس کے فرق کا بڑا خیال رکھتا ہے ایک بار سندھ کے ایک سابق گورنر کی پارٹی میں جو پرائیوٹ تھی ایک اخبار نویس مدعو تھے۔ بے نظیر بھٹو نے ان کو دیکھا تو میزبان سے برہمی کا اظہار کیا۔ ان کو یقین دلایا گیا کہ پارٹی آف دی ریکارڈ ہے تو مطمئن ہوئیں۔ نواز شریف اس لحاظ سے عوامی تھے کہ مہمانوں کی مالی حیثیت کا ذرا کم ہی خیال کرتے تھے۔ جن کو جانتے تھے ان سے بات چیت کرتے تھے مگر دوسرے دور حکومت میں ورکرز کو گلے لگانے سے گریز کرنے لگے تھے۔ مگر نواز شریف انگلش میڈیم شوق کے باوجود نہیں بن سکے۔ وہ اردو میڈیم تھے۔ اتنی جلد بازی کے فیصلے انگلش میڈیم والے کم ہی کرتے ہیں۔

منتخب اور غیر منتخب حکمرانوں کے فیصلوں کی سزا قوم اب تک بھگت رہی ہے۔ موجودہ حکمرانوں کا کیا مقام ہوگا یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ ان کو اچھا سمجھا جائے گا پھر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے عوام یہی چاہتے ہیں کہ حکمران کرپٹ نہ ہوں کیونکہ انگلش میڈیم اور اردو میڈیم دونوں نے مل کر ملک کو لوٹا ہے اور نقصان پہنچایا ہے۔ عوام کیا کریں ان کے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔

آم کی سیاست

سابق وزیر اعظم بینظیر بھٹو کو جب ۲۹ جولائی کی گرم صبح لندن جانے سے روکا گیا تو عین اسی وقت ڈیپارچر لاؤنج سے زرداری فارم کے آموں کی پیٹیاں باہر آنا شروع ہوگئیں۔ بینظیر بھٹو دو گھنٹے وفاقی حکام سے بحث وتکرار کے بعد امارات ایئر لائنز کے بجائے پی آئی اے کی پرواز سے لندن روانہ ہوگئیں مگر زرداری فارم کے آم ان کے ساتھ نہیں جاسکے۔ جس سے سابق مرد اول کے لندن میں مقیم دوست محروم رہے ہوں گے۔ لیکن اس واقعہ سے ایک بات واضح ہے کہ آصف علی زرداری مصیبت کی اس گھڑی میں بھی جب کورٹ اور جیل دونوں جگہ ان کو اپنی جان کو خطرہ ہے اپنے دوستوں کی ''آم'' کی ضروریات کو نہیں بھولے۔ کراچی کے اخبار نویسوں کو آصف علی زرداری کی طرف سے آم بھجوائے گئے۔

سیاست دانوں، بیوروکریٹس، سفارت کاروں اور اخبار نویسوں کو آموں کی پیٹیاں بھیجنا سندھ کے کلچر کا حصہ ہے۔ جو باقاعدہ روایت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پیر پگاڑا، پیر صبغت اللہ شاہ راشدی، غلام مصطفیٰ جتوئی، بینظیر بھٹو، سید خادم علی شاہ رفیع کچیلو، عنایت علی شاہ اور خان محمد آموں کے پارسل بھیجنے والے سرکردہ سیاست دانوں میں ہیں۔ رفیع کچیلو کو عرصہ تک آموں کا بادشاہ (مینگو کنگ) کہا جاتا تھا۔ ان کے دوستوں کو ان کے آم کھانے کی بڑی خواہش ہوتی تھی۔ پیر پگاڑو اور غلام مصطفیٰ جتوئی آموں کے بارے

میں بڑے سلیکشن کے قائل ہیں۔ وہ جس کو پسند کرتے ہیں صرف اسی کو آم بھجواتے ہیں۔ پیر پگاڑو کے آموں کی پیٹی پر باقاعدہ تاریخ درج ہوتی ہے کہ کس تاریخ کو پیٹی کھولی جائے۔ سندھ کے سیاست دانوں میں سندھڑی آم سب سے مقبول ہے۔ جو بیرون ملک بھیجا جاتا ہے۔ سندھڑی سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کا تعلقہ تھا جو ۱۹۹۰ء میں تعلقہ ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ اس وقت نواز شریف کا دور تھا اس کو نواز شریف کے دور حکومت میں ۱۹۹۷ء میں ختم کر دیا گیا۔ اب سندھڑی صرف سندھڑی ہے۔ محمد خاں جونیجو کے دور میں سندھڑی کی شہرت آم کے ساتھ وزیراعظم کی وجہ سے بھی تھی۔ محمد خان جونیجو جب وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے امریکہ گئے تو ان کا واشنگٹن میں کاشتکار کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ ان کے صاحب زادے اسد جونیجو بھی آم بھیجنے کی روایت پر عمل کر رہے ہیں۔

بینظیر بھٹو محمد خان جونیجو کو ''ضیا کا وزیراعظم'' کہتی تھیں۔ لیکن جنرل ضیا کا دور ان کے لیے اس لحاظ سے بہتر تھا کہ ان کے دور میں بے نظیر کی آموں کی فصل بہت اچھی ہوئی۔ بینظیر فارم کے آم سعودی عرب اور گلف برآمد کیے جاتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے لیے بے نظیر فارم کے آم ان کی وفاداری کا سرٹیفکیٹ ہوتے تھے۔

بینظیر بھٹو نے اپوزیشن اور اقتدار کے دنوں میں کراچی کے اخبار نویسوں کو ان کے گھروں پر آم بھیجنے سے گریز کیا۔ ڈان کے ایک ریٹائرڈ سیاسی وقائع نگار کی اپیل پر ان کے گھر پر آم کی پیٹی بھیجی گئی۔

جتوئی فارم کے آم اخبار نویسوں کو کچھ عرصہ تک ہی ملے۔ اس کے بعد جوں جوں بڑے جتوئی، غلام مصطفیٰ جتوئی، سیاست میں گوشہ نشینی اختیار کرتے گئے آموں کی رسد متاثر ہوتی گئی۔ اب چند ٹاپ بیوروکریٹس اور سفارت کار ہی جتوئی فارم کے آموں کی لذت کی تعریف کرتے پائے جاتے ہیں۔ سردار شیر باز مزاری کے اپنے آموں کے باغ نہیں ہیں مگر وہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا میں یہ خیال رکھتے تھے کہ اپنے لیے آنے والے آم اپنے سیاسی اور غیر سیاسی دوستوں کو ضرور بھجواتے تھے۔ پھر جوں جوں پاکستان

میں جمہوریت جڑیں پکڑتی گئی سیاست دان ان کے آموں سے محروم ہوتے گئے۔

سندھ میں میر پور خاص آموں کے لیے بڑا مشہور ہے جہاں کے سید خادم علی شاہ ہر سال آموں کے تحائف بھجواتے تھے، جب وہ ۷۰ کلفٹن کا وفادار تھے، خادم علی شاہ کے آم ۹۰ کلفٹن ضرور پہنچتے تھے۔ بینظیر بھٹو شادی کے بعد بلاول ہاؤس منتقل ہوئیں تو آصف علی زرداری، خادم علی شاہ اور بھٹو فیملی کے دیرینہ تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ فاصلے بڑھتے گئے اب سید خادم علی شاہ ۷۰ کلفٹن کے ساتھی ہیں یعنی پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کے مرکزی رہنما ہیں۔

سید خادم علی شاہ کے بھائی عنایت علی شاہ جنرل ضیا کے مارشل لا میں بی بی (بینظیر بھٹو) کے وفادار تھے۔ وہ بینظیر کے بڑے مخالف پیر پگاڑو کی فنکشنل مسلم لیگ کے عرصہ تک رکن رہے۔ بینظیر کی پہلی حکومت میں عنایت علی شاہ پیپلز پروگرام کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ دوسری حکومت میں اپوزیشن کے ساتھ تھے۔ اب کہیں نہیں ہیں۔

مسلم لیگ سے پی پی پی اور پی پی پی سے مسلم لیگ تک کا سفر طے کرنے والے سندھ کے وزیر زراعت مراد علی شاہ خوش خوراک مشہور ہیں۔ وہ اپنا اور اپنے مہمانوں کی خوراک کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ مراد علی شاہ سفارت کاروں، سیاست دانوں اور اخبار نویسوں کو آم ضرور بھجواتے ہیں۔ سندھ کے اقلیتی ارکان مہرول جگوانی اور گیانی چند برسوں سے اپنے مداحوں کو آم بھجوا رہے ہیں۔ مہرول جگوانی کے آموں کی پیٹیاں حیدرآباد سے نکلنے والے ایک اخبار کے بیورو چیف اخبار نویسوں کے نام پر وصول کرکے سبزی منڈی میں فروخت کرتے رہے۔ اس پر مہرول اب اخبار نویسوں کو خود آم بھجواتے ہیں۔

کراچی میں مقیم غیر ملکی سفارت کاروں میں سندھ کے آم مقبول ہیں۔ امریکہ برطانیہ فرانس اور اٹلی کے سفارت کار آم شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کے میزبان ڈنر اور لنچ میں آموں کی مختلف اقسام رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں جن میں سندھڑی، چونسہ، لنگڑا، سرولی اور انور رٹول شامل ہیں۔

پنجاب کے بزرگ سیاست دان نواب زادہ نصر اللہ خان کسی دور میں مظفر گڑھ اور خان گڑھ کے آم سندھی سیاست دانوں کو بھجواتے تھے۔ پی ڈی پی سندھ کے صدر مشتاق مرزا انور رٹول کی پیٹیاں وصول کر کے نواب زادہ نصر اللہ کی خواہش پر تقسیم کرتے تھے۔ نواب زادہ نصر اللہ کے آم ان کی پارٹی سے کہیں زیادہ مقبول تھے۔ وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ بینظیر بھٹو اور پیر پگاڑو دونوں کو ان کے آم وقت پر مل جائیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں نواب زادہ نصر اللہ کی آم پالیسی مارشل لا کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کے لیے یکساں تھی۔

جماعت اسلامی ان جماعتوں میں سے ہے جو مارشل لا کی حمایت کا داغ اب تک اپنی سیاست سلیٹ سے صاف نہیں کر سکی ہے۔ مگر جماعت اسلامی مارشل لا اور جمہوریت ہر دور میں کراچی کے اخبار نویسوں کی آموں کی بڑی دعوت کرتی ہے جس میں قیمہ بھرے پراٹھوں اور چھوٹے بڑے آموں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کچھ آم کاٹ کر اور کچھ چوس کر کھائے جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے سرکردہ رہنما قاضی حسین احمد، پروفیسر غفور احمد، منور حسن، نعمت اللہ خان اور محمد حسین محنتی آم کھانے کے بعد ملک کی سیاست پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ سال رواں کی آم پارٹی کے دعوت نامہ میں جماعت اسلامی کراچی کے سکریٹری اطلاعات شاہد شمسی نے واضح طور پر کہا کہ کراچی کے حالات بگڑنے سے قبل آم پارٹی کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

آم کو پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی سیاست سے آمریت کو ختم کرنے میں آموں کا بڑا کلیدی کردار ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے سی ۱۳۰ طیارہ میں آموں کی پیٹیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ طیارہ فضا میں دھماکہ سے اڑ گیا۔ اس طرح پاکستان کے مرد آہن کو جس نے مطلق العنان وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے تختہ پر بھیجا تھا پھلوں کے بادشاہ کو پسند کرنے کا فیصلہ مہنگا پڑا۔ مگر اس سے جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دور ہوگئی۔ جمہوریت کے لیے آم بڑے کام کے ثابت ہوئے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ بینظیر بھٹو کو

جب جنرل ضیاء الحق کے خاتمہ کی اطلاع ملی اس وقت وہ ۷۰ کلفٹن میں آم کھا رہی تھیں۔ لیکن اپنی دونوں حکومتوں کے خاتمہ کے بعد بھی بینظیر بھٹو آموں سے پیچھا نہیں چھڑا سکی ہیں۔

مجید نظامی......کاسہ لیسی کی سیاست کے خلاف جہاد

مجید نظامی، ایک صحافی نہیں اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں، ایک ایسا ادارہ جس نے پاکستان میں ہر فوجی اور سویلین ڈکٹیٹرشپ کا مقابلہ کیا، جمہوریت اور آزادی صحافت کو لاحق خطرات کا سامنا کیا۔ یہ مجید نظامی کی شخصیت ہے جس کو دشمن بھارت کشمیر پر سودے بازی اور پاک بھارت تجارت کی راہ میں واحد رکاوٹ سمجھتا ہے تو خود پاکستانی حکمران اور طالع آزما آمریت کے راستے میں حائل بھاری پتھر سمجھتے ہیں۔ اس جرات مند حق گو صحافی کی ۵۰ سالہ صحافت کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ کہنہ مشق صحافی خالد کاشمیری نے مدیر اعلیٰ نوائے وقت کی یادداشتوں پر مشتمل ''روداد جنوں'' میں پاکستان کی صحافت کی ایک عہد ساز ہستی کی صحافت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کام آسان نہیں ہے۔ مجید نظامی کی جرات اور بے باکی پاکستان کی صحافت، جمہوریت اسلام، دوقومی نظریہ اور کشمیر کے کاز کے لیے ان کی خدمات سے ۱۹۰ صفحات میں انصاف کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر ایک ایسے ملک میں جہاں سچی بات وقت پر کہنے کی روایت مستحکم نہیں ہوئی ہو، نہ یادداشتیں لکھنے کا رواج ہو، خالد کاشمیری نے صحافت پر اس روداد کے ذریعہ احسان کیا ہے۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں کمسن اور کم عمر رہنے اور نظر آنے کا رجحان اتنا بڑھ گیا ہے کہ قدیم سیاستداں تک اپنی یادداشتیں لکھتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا ان کو ریٹائرڈ یا بزرگ نہ سمجھ لیا جائے۔ اس لحاظ سے مجید نظامی نے نصف صدی کا قصہ بیان کر کے نہ صرف قوم کی رہنمائی

کی ہے بلکہ صحافیوں، سیاستدانوں، اساتذہ، طالبعلموں، وکلاء، سول اور ملٹری بیورو کریٹس تاجروں، صنعتکاروں سمیت معاشرہ کے ہر طبقہ کے لیے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جھانکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ''روداد جنوں'' محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ ایک تاریخ ہے، جرات مندانہ صحافت کی۔ جس سے ماضی کو جاننے، حال کو سمجھنے اور مستقبل کا احساس کرنے میں مدد ملے گی۔ مجید نظامی کاسہ لیسی کی سیاست اور ''چھاپہ مار'' صحافت کے پرآشوب دور میں امید کی کرن ہیں، جن میں بطور صحافی نوجوانوں جیسا حوصلہ ہے۔ پاکستان کی متلاطم سیاسی تاریخ میں ان کا بنیادی طور پر رول ایک بے باک، نہ بکنے والے، نہ جھکنے والے صحافی کا ہے۔ جس نے نوائے وقت کی ''جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق'' کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ مستحکم کیا، اسے جلا بخشی ہے۔ خالد کاشمیری نے صحیح بات لکھی ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں ''حالات کی چیرہ دستیوں، خوفناک فضا کی سنگینیوں، غیر جمہوری ماحول کی تاریکیوں میں احساس محرومی اور درماندگی سے دوچار عناصر کے لیے جو شخصیت روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوئی وہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی تھے''۔

مجید نظامی اول و آخر صحافی ہیں جنہوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران ملک و قوم کو گھیرنے والے ہر بحران میں مایوس اور بے بس قوم کی رہنمائی کا حق ادا کیا جو ملک میں شخصی نظام کے خلاف نہ صرف سرگرم عمل رہے بلکہ اس کا عملی مظاہرہ نوائے وقت کے اداریوں اور جمہوریت کی بحالی سے متعلق خبروں کی نمایاں کوریج سے کیا۔ ملک کے جمہوری عناصر کی صحافتی محاذ سے رہنمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ صحافت کو با مقصد اور قیام پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ایوب خان کا دور ہو یا جنرل یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو کا، جنرل ضیاء الحق کی آمریت ہو یا بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے جمہوری دور، مجید نظامی نے جمہوریت اور حق گوئی پر کبھی کمپرومائز نہیں کیا جس کا نہ صرف ان کے دیرینہ حامی بلکہ مخالفین تک اعتراف کرتے ہیں۔ ایک صاف گو اور بے باک نظریاتی انسان جو علامہ اقبال اور قائداعظم کی نظریاتی وراثت کی ہر قیمت ادا کرنے سے

کبھی خوف نہیں کھاتے جن کی رائے میں بھارت نے ۱۹۴۷ء کی تقسیم کو قبول نہیں کیا، بھارت کے اس عناد کے باعث پاکستان ہمیشہ مشکلات میں مبتلا رہے گا۔

''روداد جنوں'' میں مجید نظامی کی آغاز صحافت سے لے کر پاکستان کے ایٹمی دھماکہ میں کردار تک سات ابواب میں ان کی خدمات پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے جس میں ایک طویل تاریخ کو انتہائی مختصر کیا گیا ہے۔ اپنی ساری زندگی اس دشت میں گزارنے والے مجید نظامی ان دانشوروں کے لیے جن کو نظریہ پاکستان کی سمجھ نہیں آتی دعا گو ہیں کہ ''اللہ انہیں سمجھ دے وہ اچھی طرح جانتے ہیں نظریہ پاکستان دو قومی نظریہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو الگ قوم ہیں مسلمان الگ قوم''۔ پھر جب تحریک پاکستان کے عظیم کارکن حمید نظامی کے انتقال کے بعد مجید نظامی نے جواں سال ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے عظیم المرتبت بھائی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا تو وقت کے ڈکٹیٹر فیلڈ مارشل ایوب خان سے مکالمہ ہوگیا۔ اس مکالمہ نے نہ صرف مجید نظامی کی بے باکی کو ظاہر کیا بلکہ اس سے مستقبل کے حکمرانوں کو بھی صحافت کے اس بطیل جلیل کے تیکھے پن کا احساس ہوا۔ ''ایوب خان کے ساتھ ہماری پہلی میٹنگ کراچی میں ہوئی ہم لوگ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کلاس بیٹھی ہے اور وہ سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ لوگوں کو شرم کرنا چاہئے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں'' میں اس وقت سب سے نوجوان ایڈیٹر تھا، میں نے کہا ''مجھے کس بات پر شرم آنا چاہیے میں تو جب اپنے گریبان میں جھانکتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے''۔ ایوب خان کو نوجوان ایڈیٹر سے یہ کہہ کر جان چھڑانی پڑی کہ میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا۔ ایوب خان کی آمریت کے خلاف مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر جدوجہد کی جس پر نوائے وقت نے سرخی لگائی ''الیکشن کمیشن نے ایوب خان کو کامیاب قرار دے دیا''۔ ''جب مادرِ ملت سے میری آخری ملاقات صدارتی انتخاب کے بعد ہوئی انہوں نے ازراہِ شفقت مجھے اپنی رہائش گاہ پر مہتہ پیلس کراچی میں ناشتہ پر طلب فرمایا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ دوران گفتگو انہوں

نے کہا میں خود کو شکست خوردہ نہیں سمجھتی مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ میں جیت رہی تھی۔ پھر جب ایوب خان نے جو بطور حکمراں مجید نظامی اور نوائے وقت دونوں سے عاجز تھے اور تنگ آ کر ان کو ''انسانیت سیکھو'' کا درس دینے کی کوشش کرتے تھے۔ صدارت سے مستعفی ہو کر مجید نظامی سے ملاقات کی تو پوچھا ''آپ خوش ہیں آپ کو اپنی پسند کی جمہوریت مل گئی''۔ میرا جواب تھا ''آپ نے ہمیں پسند کی جمہوریت نہیں دی آپ نے تو ہمیں یحییٰ خان دے دیا''۔ خود برسر اقتدار جنرل یحییٰ خان سے ملاقات میں مجید نظامی نے اپنے اور بعض ساتھی ایڈیٹروں کے خلاف مقدمہ کے معاملہ میں معافی سے صاف انکار کر دیا۔ ''جنرل نے کہا اگر تم معافی نہیں مانگتے تو جاؤ مقدمہ لڑو میں نے کہا کہاں۔ انہوں نے کہا مارشل لاء کورٹ میں۔ میں نے کہا کہ مارشل لاء لاء ہے نہ کورٹ کورٹ ہے''۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور کو مجید نظامی دلچسپ قرار دیتے ہیں ''وہ ہمارے دوست بھی تھے مخالف بھی۔ انہوں نے ہمارے اشتہار بند کیے ہوئے تھے۔ بھٹو نے ایک ملاقات میں کہا کہ نظامی صاحب ایک بار کہہ دیں تو اشتہاروں کی بارش ہو جائے گی۔ میں نے کہا یہ الفاظ میرے منہ سے کبھی نہیں سنیں گے۔ اشتہار آپ بند رکھیں ہمارے آپ سے تعلقات اسی طرح رہیں گے۔

تعلقات کا مرحلہ مجید نظامی کی شخصیت کا یہ پہلو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اپنے ذاتی تعلقات کو کبھی اپنی آزادی صحافت پر غالب نہیں آنے دیا۔ اس معاملہ میں کسی سے رعایت نہیں کی۔ مسلم لیگ سے نظریاتی وابستگی کی بدولت بعض حلقے ان کو شریف فیملی سے قریب سمجھنے لگتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ نوائے وقت نے شریفوں کے دور اقتدار میں ان کے عدلیہ سے محاذ آرائی، واجپائی کی بس یاترا جیسے اقدامات کی جتنی کھل کر مخالفت کی کسی اخبار نے نہیں کی۔

جہاں قومی مفاد کا معاملہ ہو۔ مجید نظامی کی کوئی اور ترجیح نہیں ہے۔ پاکستان اسلام، جمہوریت اور کشمیر پر نہ کبھی کمپرومائز کیا ہے نہ کبھی کریں گے۔ حکمراں خواہ کوئی ہو لاہور کا ہو یا لاڑکانہ کا یا جی ایچ کیو کا۔ ''نواز شریف برسرِاقتدار آئے تو ان کی جمہوریت

بھی کوئی مارشل لاء سے کم نہ تھی، وہ اپنے مزاج کے آدمی تھے۔ ان سے بہت کہا کہ آپ کو مینڈیٹ ملا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مینڈیٹ دیا ہے اسے جمہوریت طریقہ سے چلائیں''۔
میری یہ رائے ہے کہ سیاسی وزرائے اعظم میں سے شاید جونیجو صاحب، محمد خان جونیجو سے زیادہ کوئی اچھا وزیر اعظم پاکستان کو نہیں ملا، جونیجو کی جانشین بے نظیر بھٹو تھیں۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات بے نظیر بھٹو کی پارٹی نے جیتے اس کے نتیجہ میں ان کو وزارت عظمیٰ ملی، کراچی میں بے نظیر بھٹو کی مدیران جرائد کے ساتھ میٹنگ میں ''دی نیشن'' کی خبر موضوع بن گئی جس کے مطابق بے نظیر بھٹو نے سکون بخش دوا لی تھی۔ بے نظیر نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں''۔ میں نے کہا اگر آپ نے وہ گولی نہیں لی جس کی خبر ہے آپ کی طبیعت ناساز نہیں ہوئی تو آپ سمجھیں رپورٹر فارغ ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو اس کا چھپنا مفاد عامہ میں ہے۔ پاکستان اور جمہوریت کا یہ مفاد ہی مجید نظامی کے پیش نظر تھا جب انہوں نے نواز شریف کو اپوزیشن لیڈر کو ان کا صحیح مرتبہ دینے پر آمادہ کیا اور دونوں کی ملاقات تجویز کی تاکہ جمہوریت کی گاڑی کو درست طریقہ سے چلایا جاسکے۔ میری ہی تجویز کی روشنی میں نواز شریف نے تو بے نظیر سے جا کر ملنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر شہباز شریف اس کے خلاف تھا اس نے ''ابا جی'' کا ویٹو استعمال کرادیا۔ ''ابا جی'' نے نواز شریف سے پوچھا کیوں تم جا رہے ہو تو اس نے کہا میں جا رہا ہوں تو ابا جی نے کہا ''خبردار تو وزیر اعظم ہے یا وہ وزیر اعظم ہے اسے تمہارے پاس آنا چاہئے، اگر بات چیت کرنی ہے''۔ گویا نواز شریف کا فیصلہ ویٹو ہوگیا۔ اس کے بعد بادشاہت چھن گئی۔

یہی اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ فوجی حکمرانی کے خلاف جمہوریت کا راگ الاپنے والے سویلین سیاستداں جب خود ووٹ کے ذریعہ اقتدار میں آجاتے ہیں تو مقبول جمہوری حکمراں سے زیادہ ان کو ''بادشاہ'' اور مطلق العنان حکمراں بننے کی فکر لاحق ہوجاتی ہے۔ ''اگر اپوزیشن لیڈر اور حکمراں رولز آف گیم کے مطابق چلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جمہوریت کا تجربہ ناکام رہے''۔ ہمارے حکمراں بے صبرے ہیں کانوں کے کچے ہیں، انہیں بھڑکانا کوئی

مشکل کام نہیں ہے، اس لیے یہاں جمہوریت کا پڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اب تک زیادہ عرصہ فوج حکمراں رہی ہے۔ ''روداد جنوں'' میں مجید نظامی کی شخصیت کا ایک اور پہلو اجاگر ہوتا ہے جو عام لوگوں سے شاید اوجھل ہے، وہ ہے ان کی حس مزاح۔ ''سر راہے'' کے عرصہ تک کالم نویس رہے ہیں۔ جرات اور بے باکی کے ساتھ مزاح کا عنصر بھی ہے۔ ''میرا میاں نواز شریف سے ان کے باغ جناح میں کرکٹ کھیلنے پر اختلاف ہوا، میں نے انہیں کہا اگر آپ نے وزیراعظم ہوتے ہوئے گرمیوں کی اتوار کی دوپہر کرکٹ کھیلنا ہے تو میرے خیال میں اس سے زیادہ غلط تفریح اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہ کہتے ہیں آپ نہیں جانتے میں ہفتہ میں ایک بار تفریح کرتا ہوں۔ میں کہتا تھا آپ تفریح نہیں کرتے درحقیقت یہ مصنوعی نمائش ہے آپ کا کوئی سرکاری افسر باؤلنگ کرا رہا ہے آپ اس کی گیند پر باؤنڈری لگا رہے ہیں''۔ کارگل مسئلہ پر نواز شریف کا جنرل پرویز مشرف سے اختلاف ہوا تو میں نے انہیں کہا اسے پبلک میں ایشو نہ بنائیں، آپ بیٹھ کے پرویز مشرف سے بات کرلیں۔ کارگل جس کسی کا بھی پروجیکٹ ہے یہ اس وقت ہماری فوج کا پروجیکٹ ہے۔ پھر جب میں نے جنرل مشرف سے اس ملاقات کا احوال پوچھا تو انہوں نے کہا ''مجھے اس میٹنگ میں میاں شریف نے چوتھا بیٹا بنا لیا۔ جس کی خبر میں نے اپنے سب ''ساتھیوں'' کو دی تو انہوں نے کہا آپ کو اور محتاط ہونا چاہیے، مجھے پتہ تھا کیا ہونے والا ہے، ان کو شاید پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے''۔

جب نواز شریف کا جو خود کو فخر سے محاذ آرائی کی پیداوار کہتے تھے، غلام اسحٰق سے ٹکراؤ ہوا تو ان سے جنرل عبدالوحید کاکڑ کے ذریعہ استعفیٰ مانگ لیا گیا۔ نواز شریف کو جب مجید نظامی نے مشورہ دیا کہ فون اٹھا کر کاکڑ کو انکار کردیں، نواز شریف نے تامل کیا تو میں نے ان سے کہا پھر آپ کی گیم ختم ہوگئی۔ جنرل کاکڑ نے ہمیں جی ایچ کیو بلایا انہوں نے کہا میں اس شخص سے ملنا چاہتا تھا جس نے نواز شریف سے کہا تھا یہ ٹیلی فون پڑا ہے جس نے آپ سے کہا ہے استعفیٰ دے دیں اس سے کہو Nothing Doing میں نے

کہا جناب یہ بندہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کہہ سکے۔ اس طرح مجید نظامی نے جنرل کاکڑ کو ایکسٹینشن نہ لینے کا مشورہ دیا انہوں نے پوچھا ''کیوں'' میں نے کہا میرے سامنے آپ کے آس پاس جتنے لوگ بیٹھے ہیں وہ اس انتظار میں ہیں کہ آپ ریٹائر ہو کر گھر جائیں اور ہمیں ترقی ملے۔

ایکسٹینشن کے اسی رجحان نے ملک اور جمہورت دونوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ جو آجاتا ہے واپس جانے کا نام نہیں لیتا، خواہ فوجی ہو یا سویلین، یہ عجب اتفاق ہے کہ جہاں پاپولر لیڈر بے نظیر بھٹو اور نواز شریف اپنی معیاد کے تین سال تک پوری نہیں کر سکے۔ جنرل پرویز مشرف نے نہ صرف تین سال پورے کر لیے بلکہ اگلے پانچ سالوں کے لیے اپنی صدارت کی خود توسیع کر دی ہے۔ اسی طرح انتخابات سے کیسی جمہوریت آئے گی یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مجید نظامی کے دل میں پاکستان کا درد ہے، اس درد نے ان کو ہر دور میں حکمرانوں سے نبرد آزما کیا ہے۔ قوم کے اس درد کو مجید نظامی دل کا مریض ہونے کے باوجود بھی ترک نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کا دل صرف اور صرف پاکستان کے لیے دھڑکتا ہے۔

یہ طے ہے کہ مجید نظامی کی ہستی پاکستان کی سیاست اور صحافت میں اتنی ہمہ گیر ہے جس سے ایک مختصر کتاب میں انصاف کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی پاکستان اسلام جمہوریت آزادی صحافت کشمیر اور عالم اسلام کے لیے دردمندانہ سوچ اور خود ان کی شخصیت اور خدمات کی عکاسی کے لیے جامع کتاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ صحیح معنوں میں نہ صرف صحافت بلکہ سیاست کی اہم تاریخ ہوگی۔ ایک ایسے دور میں جب سیاسی جماعتوں میں این جی اوز داخل ہوگئی ہوں، صحافت میں تاجر اور صنعتکار آ گئے ہوں مجید نظامی کا وجود غنیمت ہے جو صحافت اور سیاست کو الگ نہیں سمجھتے۔ ''میں اسے صحافی نہیں مانتا جس کا سیاست سے واسطہ نہ ہو''۔ حق گوئی جن کا صحافت میں نصب العین اور حب الوطنی جن کا سیاست میں معیار ہے وہی مجید نظامی ہیں۔

پاکستان کی خالق جماعت پر قبضے کی کہانی

کیا پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ پھر ہائی جیک ہوگئی ہے۔ اسلام آباد میں مسلم لیگ کے جنرل سکریٹریٹ پر مسلح لٹھ برداروں نے قبضہ کرلیا۔ اس کو نواز شریف کی مسلم لیگ کی قیادت سے ''بے دخلی'' سمجھا گیا۔ رائے ونڈ تیزی سے حرکت میں آیا اور باغی گروپ کے چار ارکان کی ممبر شپ معطل کردی گئی۔ مسلم لیگ جو نواز حکومت کی برطرفی کے ایک سال بعد تک متحد رہی۔ آن واحد میں بکھر گئی نواز گروپ اس کے نتیجے میں لازمی طور پر بے نظیر بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف جھک جائے گا۔ یہ جھکاؤ باغیوں کو ''انٹی نواز'' اور ''انٹی بینظیر'' قوتوں کی طرف لے جائے گا۔ یہ اتحاد جو عمران خان، فاروق لغاری، طاہر القادری پر مشتمل ہوگا حکومت کے غیر اعلانیہ ایجنڈا پر کام کرے گا۔ سیاسی مبصرین پوچھ رہے ہیں کہ فوجی حکومت میں مسلم لیگ کیوں منتشر ہوگئی۔ پیپلز پارٹی فوجی حکومت میں متحد رہی تھی ایک جواب تو اس کا یہ ہے کہ بھٹو کو اپنی حکومت ختم ہونے کے ۲۰ ماہ کے اندر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ان کی زندگی کے آخری لمحوں میں کسی کو جرات نہ ہوسکی کہ بغاوت کا علم بلند کرسکے۔ ان کی موت کے بعد جس نے غداری کی کوشش کی وفادار جیالوں نے اسے ناکام بنا دیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، عبدالحفیظ پیرزادہ، مصطفیٰ کھر، مولانا کوثر نیازی کے ساتھ نہ عوام گئے نہ جیالے، بھٹو کی مخالفت کرنے والے سیاسی یتیم بن گئے۔ ان کی سرپرستی کی کوشش میں فوجی حکومت کامیاب نہیں ہوئی جو جنرل ضیاء الحق سے ملا اسے مسترد کردیا گیا۔

مگر جنرل ضیاء الحق کو یہ کریڈٹ ضرور دیا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کو جسے ڈرائنگ روم کی سیاست کرنے والی سازشی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ زندہ کر گئے۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات غیر جماعتی بنیاد پر ہوئے جن کے نتیجہ میں مسلم لیگ وجود میں آئی۔ اس پر قائداعظم کی مسلم لیگ کے حامی طبقے خوش ہوئے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو زندہ کرنے والی جماعت کا احیاء ہو گیا۔ مسلم لیگیوں کو آئے دن طعنوں سے نجات مل گئی مسلم لیگی منتخب ہوئے پارلیمنٹ پر چھا گئے۔ صوبائی اسمبلیوں میں آ گئے۔ پہلی بار قمیض شلوار پر واسکٹ والے فربہ اور منحنی لوگ منتخب ایوانوں میں پہنچے پنجاب اسمبلی میں نواز شریف کی آواز گونجی تھی تو سندھ اسمبلی میں غوث علی شاہ دھاڑ رہے تھے۔ قومی اسمبلی میں مرنجاں مرنج محمد خان جونیجو اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کر رہے تھے۔ سول بیورو کریسی کو انہوں نے موثر طریقہ سے ہینڈل کیا جب ملٹری بیورو کریسی کی طرف بڑھے تو ان کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ جونیجو کو سی ۱۳۰ طیارہ پر بٹھا کر اسلام آباد سے کراچی واپس بھیج دیا گیا۔ جونیجو کے ساتھ عوام تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں عوام کی عدالت میں جاؤں گا۔ محمد خان جونیجو کو یقین تھا کہ مسلم لیگی ان کا ساتھ دیں گے۔ سب سے پہلے ساتھ چھوڑنے والے نواز شریف تھے۔ مسلم لیگ کے دردمند حامی حیران رہ گئے۔ اسلام آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں ہڑبونگ اور ہنگامہ آرائی اور ہلڑبازی دیکھنے میں آئی۔ اس وقت بدقسمتی سے سرکاری گروپ کی قیادت نواز شریف کر رہے تھے ان کو جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اپنے قائد محمد خان جونیجو کی برطرفی کے باوجود نواز شریف نے پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی واردات سے جونیجو کو نہایت صدمہ ہوا وہ بے بس تھے۔ شاید یہ صدمہ ان کے لیے اتنا سنگین ثابت ہوا کہ بیمار پڑ گئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے چہلم سے پہلے ہی ایک اجلاس میں نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔ چودھری شجاعت نے کہا جونیجو صاحب کا کفن تو میلا ہونے دیں۔ کوئی ان کی پکار سننے والا نہیں تھا۔ مسلم لیگ پر نواز شریف کے حامیوں کا قبضہ اسی قسم کا تھا جس قسم کا نواز دور میں سپریم کورٹ

میں ہلڑ بازی کے ذریعہ کیا گیا۔ پاکستان کی ٹاپ جوڈیشری کو فرار ہونا پڑا۔ ہجوم سے ججوں کی جانوں کو خطرہ تھا۔ یہی کچھ اب نواز شریف کے مخالفین نے کیا جن کے لٹھ بردار مسلم لیگ ہاؤس پر قابض ہوگئے۔ نواز شریف نے جو بویا وہی ان کو کاٹنا پڑ رہا ہے۔ جو اسٹریٹجی انہوں نے جونیجو سے مسلم لیگ کو لینے اور سپریم کورٹ کو اپنے خلاف فیصلہ سے روکنے کے لیے اختیار کی وہی ان کے خلاف استعمال کی گئی۔ عام پاکستانی جو مسلم لیگ میں نہیں نواز شریف کے حامیوں اور مخالفین کو ایک سمجھتا ہے۔ بدقسمتی سے نواز شریف ہوں اعجاز الحق یا چودھری شجاعت کسی کا جمہوری ٹریک ریکارڈ اتنا قابل فخر نہیں ہے۔ سارے اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار رہے اور فخر سے خود کو اسی حیثیت میں پیش کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنے حلقوں سے منتخب تو ہوتے رہے مگر ان کو سیاسی حلقوں میں جمہوریت پسند کبھی نہیں سمجھا گیا نواز شریف فخر سے کہتے تھے میں محاذ آرائی کی پیداوار ہوں۔ نواز شریف کا بنیادی ایجنڈہ یہی رہا کہ انٹی پی پی ووٹوں کو حاصل کیا جائے۔ یہ وہ ووٹ تھے جو پہلے جماعت اسلامی کو ملتے تھے۔ جے یو پی اور جے یو آئی کو ملتے تھے۔ نواز شریف کو ملنے لگے۔ دائیں بازو کے لوگ خوش تھے کہ پہلی بار کوئی دائیں بازو کا بندہ مقبول ہو رہا ہے۔ مینڈیٹ لے رہا ہے۔ اقتدار میں آ رہا ہے۔ جو لوگ جماعت اسلامی کی انتخابی ناکامی پر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ نواز شریف کی بدولت سر اٹھا کر چلنے لگے۔ اگرچہ نواز شریف پے در پے سیاسی اور غیر سیاسی غلطیاں کر رہے تھے۔ مگر ان کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ نواز شریف کا ووٹ بنک برقرار ہے۔ یقینی طور پر شریف فیملی کو لاہور سے اسلام آباد دو بار پہنچنے میں فوج اور اسٹیبلشمنٹ کی کھلی اور درپردہ حمایت اور پشت پناہی حاصل رہی جس سے ان کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔ یہ موقع انہوں نے مسلم لیگ کو تنظیمی طور پر مضبوط بنانے پر صرف نہیں کیا۔ اور اپنے مخالفین کے اس الزام کو بڑی حد تک صحیح ثابت کیا کہ نواز شریف کو بنیادی دلچسپی پنجاب تک ہے نواز شریف چھوٹے صوبوں کو ساتھ لے کر پوری طرح چلنے میں ناکام رہے۔ دو مواقع پر اس کے شواہد ملے جب بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک نجات چلی اس فیصلہ میں سندھ سے کسی

کوشریک کرنا ضروری خیال نہیں کیا گیا۔ جب نواز شریف اقتدار میں دوبارہ آ گئے وفاقی کابینہ میں سندھ کی نمائندگی برائے نام رکھی گئی۔ آخری مہینوں پر سندھ کا پورا وزیر تک نہیں تھا۔ دو وزرائے مملکت تھے۔ یہی کیفیت بلوچستان کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹے صوبے لاتعلق ہو گئے۔ جو شاید اب تک ہیں جب نواز شریف کی حکومت ختم کی گئی یہ بات یقینی تھی کہ ان کے خلاف اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے حمایت کے بغیر کوئی ٹولہ ضرور اٹھے گا۔ یہ لوگ اٹھے مگر عام حمایت سے محروم رہے۔ عام مسلم لیگی ان کو ''غدار'' سمجھتا ہے جو نہیں سمجھتا وہ بھی یہ شکایت کرتا ہے کہ نواز شریف کے خلاف بغاوت کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ جب لیڈر جیل میں ہے اس کے خلاف بغاوت بہادری نہیں بزدلی ہے۔ مگر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نواز شریف نے جونیجو سے کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کی حمایت اور اپنا ''کلہ'' مضبوط ہونے پر فخر کرتے تھے ان کو کبھی یقین نہ تھا کہ ایک مووان کو اسلام آباد سے لانڈھی جیل اور پھر اٹک جیل بھیج دے گا۔

کیا شریف فیملی اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے مستقل بنیاد پر محروم ہو گئی ہے۔ ان کے بہت سے حامیوں کا خیال ہے کہ انفرادی جنگ کا جب فیصلہ ہو جائے گا۔ شریف فیملی دوبارہ اسٹیبلشمنٹ کی آنکھ کا تارہ بن جائے گی۔

مسلم لیگ کے باغیوں نے جنہیں خیال ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ نواز شریف کو صدر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جنرل کونسل کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا ہے۔ باغیوں نے جن کو ہم خیال ارکان کہا جاتا ہے۔ سینٹرل ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلہ کو قبول نہیں کیا جس کے تحت چودھری شجاعت حسین، میاں اظہر، اعجاز الحق اور فقیر حسین بخاری کی بنیادی ممبر شپ معطل کی گئی۔ باغیوں کے مطابق کمیٹی کا فیصلہ غیر قانونی ہے۔ جو مسلم لیگ کے آئین کے آرٹیکل ۴۴ کے مطابق تشکیل نہیں دی گئی ہے۔ سینٹرل ورکنگ کمیٹی آئین کی رو سے کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۴۰ ارکان پر مشتمل ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ میں تاریخی طور پر آئین اور قانون کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ قائد اعظم نے

کبھی یہ نہیں کہا کہ کوئی فیصلہ میں کروں گا ہمیشہ مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کی بات کی مگر خود کو قائد اعظم کا جانشین قرار دینے والے نواز شریف کی اہلیہ نے اٹک میں کہا کہ یہ طے ہوگیا کہ معطل ارکان کو پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔ اور ان کی ممبر شپ بحال نہیں کی جائے گی۔ یہ کس نے طے کیا ہے۔ بیگم کلثوم نواز کو جو مسلم لیگ کی ''تازہ آئینی'' ممبر ہیں اس قسم کی رائے زنی کا نہ اختیار ہے نہ حق ہے یہ جمہوری کلچر نہیں ہے۔ اس پر اعجاز الحق نے سخت رد عمل کا اظہار کیا اور کہا کہ خود کلثوم نواز مسلم لیگ کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہیں پھر مسلم لیگ کا جھنڈا نیچے کر کے پیپلز پارٹی کا جھنڈا اوپر لایا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں جو نوٹس دیا گیا ہے اس کا ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔

کیا قوم مسلم لیگ کی اس صورتحال کا نوٹس لے گی؟ قوم کو اتنی فکر نہیں ہے۔ جو مسلم لیگ کے ساتھ ماضی میں ہوا اب پھر ہو رہا ہے۔ ایوب خان کے دور میں مسلم لیگ کو کنونشن لیگ بنا کر اس پر بزور طاقت قبضہ کرلیا گیا۔ ممتاز دولتانہ کی کونسل مسلم لیگ تھی جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں برطانیہ کی سفارت کی نذر ہوگئی۔ کونشن لیگ کے صدر ایوب خان اور سکریٹری جنرل ملک قاسم تھے۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء سے پہلے پیر پگاڑو اور ملک قاسم نے پی این اے کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا مسلم لیگ کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ جب مارشل لاء لگا تو مسلم لیگ پابندی کی زد میں آ گئی عدالت سے بحال ہوئی تو مسلم لیگ فنکشنل بنی۔ جس کے سربراہ پیر صاحب پگاڑو تھے۔ پھر خود پگاڑو لیگ سے خیرالدین گروپ الگ ہوگیا۔ ایک وقت تھا جب ضیا کے مارشل لاء میں مسلم لیگ کی نمائندگی صرف پیر پگاڑو کرتے تھے۔ پنجاب میں محمد حسین چٹھہ تھے۔ دونوں مسلم لیگ کے حقیقی نمائندے کہلاتے تھے۔ مگر عوامی مقبولیت مسلم لیگ کے حصہ میں نواز شریف کی بدولت آ گئی یہ اسٹیبلشمنٹ کی سازش تھی یا سیاسی جماعتوں کی کمزوری۔ مسلم لیگ عوامی جماعت بن گئی۔ جسے اب ہائی جیک کرنے کی مہم تیز ہوگئی ہے۔

حکومت کیخلاف سیاسی گوریلے متحد

اپوزیشن کی لیڈر بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں سے صلاح مشورے شروع کر دیئے ہیں۔تحریک کا حتمی فیصلہ بے نظیر کی مقررہ کردہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کرے گی تاہم چاروں صوبوں سے اس بارے میں رپورٹیں طلب کر لی گئی ہیں۔بے نظیر بھٹو نے اپنے سب سے بڑے مخالف کے خلاف ایجی ٹیشن کا فیصلہ کیا تو کسی حکومت کو ہٹانے کے لیے یہ ان کی پانچویں تحریک ہوگی۔بے نظیر بھٹو نے پہلی تحریک 1986ء میں جنرل ضیاالحق کے خلاف چلائی، جس کو موسم خزاں میں الیکشن کرانے کی تحریک کا نام دیا گیا۔خود ساختہ جلاوطنی سے وطن واپسی پر جب بے نظیر بھٹو لاہور پہنچیں تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا پاکستان ان کو دیکھنے کے لیے امڈ آیا ہے۔بے نظیر عوام کے دلوں کی دھڑکن تھیں جس کے اشارہ پر خود ان کے الفاظ ہیں۔ ''چھاؤنیوں کو ختم کیا جا سکتا تھا'' لاہور کے بعد کراچی ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔شاہراہ قائدین پر مرد عورتیں اور بچے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے ان کو یقین تھا کہ یہ عوامی حمایت پی پی کے لیے سیاسی حمایت میں بدل جائے گی۔مگر ان کا خیال غلط تھا۔بے نظیر بھٹو نے 14، اگست 1986 کو 70 کلفٹن سے جنرل ضیاء الحق کو ہٹانے کی تحریک شروع کی تھی ان کے لبوں پر ''ضیاء جاوے جاوے'' کا نعرہ تھا۔بے نظیر بھٹو پولیس کو چکمہ دے کر غریبوں اور جیالوں کے علاقہ چاکیواڑہ پہنچیں ایک ریلی سے

خطاب کیا اور 70 کلفٹن واپس آ گئیں جہاں پولیس ان کی منتظر تھی جب ان کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر لے جایا جا رہا تھا تو ایک غیر ملکی نامہ نگار نے ان سے پوچھا "یہ آپ کی کامیابی ہے یا ناکامی"۔

بے نظیر لاجواب تھیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے خلاف اس تحریک کو تو دبا دیا لیکن اپنی آمریت کے خلاف اٹھتے ہوئے طوفان کو نہیں روک سکے۔ ان کا لایا ہوا غیر جماعتی نظام ملک کے جغادری اور نو آموز ہر قسم کے سیاستدانوں کے سامنے بے بس تھا لیکن مطلق العنان حکمران یہ غیر جماعتی نظام بھی 1983ء کی ایم آر ڈی کی تحریک کے دباؤ کے نتیجہ میں لائے جب سندھ کے سادہ لوح دیہاتی جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس تحریک کو قومی اسمبلی کے موجودہ اسپیکر الٰہی بخش سومرو نے ضیاء کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے پونے دو اضلاع تک محدود قرار دیا تھا۔ اس تحریک کی بدولت سندھ کے وڈیرے شاید پہلی بار اپنی اوطاقوں سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کی قیادت میں مخدوم، پیرزادے، تالپور، سومرو، سید سب سڑکوں پر آئے تھے۔

ایم آر ڈی کی تحریک کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ پاکستان کا مڈل کلاس 1977ء کی طرح سیاستدانوں کی کال پر لبیک کہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مزدور، کلرک، دکاندار اس تحریک سے لاتعلق تھے، لیاقت آباد میں گرفتاری پیش کرنے والے سیاسی کارکنوں کو مارا پیٹا گیا۔ اندرون سندھ سیاسی کارکنوں کی پٹائی پر کراچی نیوٹرل تھا۔ الیکشن کا مطالبہ کرنے والوں کو تخریب کار اور دہشت گرد قرار دے کر رد کر دیا گیا تھا لیکن تحریک سے یقینی طور پر راولپنڈی، اسلام آباد دونوں ہل گئے تھے۔ وہ سندھی جو سندھ کے سپوت ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر گھروں میں دبک گئے تھے مارشل لا حکومت کے خلاف نکل آئے تھے۔ جنرل ضیاء الحق سندھی عوام کی نفرت کا نشانہ تھے۔ ان کو احساس ہو گیا کہ کسی نمائندہ انتظام کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔ 12 اگست کا پلان دے کر غیر جماعتی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا

جن کا لندن سے بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر ایم آر ڈی نے بائیکاٹ کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اطمینان کا سانس لیا اور غلام مصطفیٰ جتوئی پاکستان کے وزیر اعظم بننے کے سب سے بہترین موقعہ سے محروم ہو گئے۔ بے نظیر بھٹو نے جو غیر جماعتی الیکشن کے ایک سال بعد واپس آئیں اپنے ''انکلوں'' سے انصاف نہیں کیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر، عبدالحفیظ پیرزادہ، ممتاز علی بھٹو کی چھٹی کر دی گئی۔ شیخ رشید اور ملک قاسم لاہور ائرپورٹ پر بے نظیر کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ وقت بدل چکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ٹیلنٹڈ کزن ممتاز علی بھٹو کو ان کی بھتیجی ''ہائے انکل'' کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ ان لوگوں کی جگہ پی پی پی میں ناہید خان کی شکل میں ایک پاورفل آنٹی آ گئی تھیں۔ جن کو سفید بالوں والے شیخ رفیق سے لے کر نوجوان نوید قمر تک سبھی ''ناہید باجی'' کہتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور شاہنواز بھٹو کی موت کے بعد بے نظیر بھٹو کی زندگی میں خوشی کا پہلا لمحہ اس وقت آیا جب وہ بلوچی نژاد سندھی بزنس مین آصف علی زرداری سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔

بے نظیر بھٹو کی شادی شاہراہ ایران واقع اسی کلفٹن گارڈن میں ہوئی جہاں خود ان کی حکومت میں ان کے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو اسی پولیس نے پے در پے گولیاں چلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جس کو بحیثیت وزیر اعظم خود بے نظیر نے ''بہادر پولیس'' قرار دیا تھا۔ مرتضیٰ بھٹو جنرل ضیاء کی زندگی میں اشتہاری مجرم تھے جن کی موت پر ۷۰ کلفٹن میں مٹھائی تقسیم کی گئی تھی۔ بے نظیر بھٹو نے کہا زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بھٹو کی پھانسی کا حکم دینے والے جنرل کی اولادوں کو اپنے باپ کا چہرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جس طرح بھٹو فیملی کی عورتیں بھٹو کا آخری دیدار نہیں کر سکی تھیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔

اب بے نظیر بھٹو کے لیے اسلام آباد کا راستہ صاف ہو گیا تھا وہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم منتخب ہو گئیں مگر قوم سے اپنے پہلے خطاب میں بے نظیر بھٹو نے یہ اعلان

کردیا تھا کہ اپوزیشن کا لیڈر کون ہے۔ یہ پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف تھے جو جنرل ضیاء الحق کی بدولت سیاست کے ایوان میں داخل ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق نے لاہور چیمبر کے صدر کو پنجاب کا وزیرخزانہ اور کراچی چیمبر کے صدر کو سندھ کا وزیرخزانہ بنایا۔ پنجاب کے یہ وزیرخزانہ دوبار پاکستان کے وزیراعظم بن چکے ہیں۔ مگر سندھ کے وزیرخزانہ جاوید سلطان جاپان والا گوشہ گمنامی میں ہیں۔

پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم کو دو سال کے اندر ہی اقتدار سے ہٹا دیا گیا ان کو ہٹانے کے لیے اپوزیشن کو طویل تحریک نہیں چلانا پڑی۔ سابق انکل اور باوردی بیوروکریٹس نے مل کر بے نظیر کو گھر واپس بھیج دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو لیڈر ہاؤس سے لیڈر آف اپوزیشن بن گئی تھیں۔

۱۹۹۰ء میں نواز شریف پاکستان کے وزیراعظم بن گئے جن کو بمشکل دو سال اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع ملا پھر صدر غلام اسحاق اور وزیراعظم نواز شریف میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ بے نظیر بھٹو نے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ میں نے آئرن لیڈی مارگریٹ تھیچر سے پوچھا کہ اس تنازعہ میں کیا کروں کس کا ساتھ دوں کس کا نہ دوں۔ بے نظیر بھٹو کے الفاظ میں مارگریٹ تھیچر کے مشورہ پر میں نے دونوں کو ڈمپ DUMP کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بے نظیر بھٹو کا پہلا لانگ مارچ ناکام رہا پھر ٹرین مارچ بھی کامیاب نہیں ہوا مگر ۱۹۹۳ء میں لانگ مارچ نے غلام اسحاق اور نواز شریف دونوں کا اقتدار مختصر کردیا۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں بے نظیر بھٹو کو الیکشن کے بعد دوبارہ اقتدار مل گیا مگر ان کے اقتدار میں آنے کے نو ماہ کے اندر ہی نواز شریف نے مناسب ہوم ورک کے بغیر تحریک نجات شروع کردی۔ تحریک نجات کی ٹرین کراچی کے کینٹ اسٹیشن سے چلی تو جنگ شاہی پر نواز شریف سوتے ہوئے پائے گئے۔ مگر ان کو جلد ہی اقتدار مل گیا۔ جو انہوں نے گنوا دیا۔ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۸ء تک سیاست نے طویل سفر طے کیا ہے۔

اب بے نظیر اور نواز شریف بہن بھائی ہیں جو اپنے مشترکہ مخالف جنرل پرویز مشرف کے خلاف تحریک کی تیاریاں کر رہے ہیں۔کیا یہ تحریک کامیاب ہو گی؟ نوابزادہ نصراللہ خان کا کہنا ہے کہ ہم گوریلا وار نہیں کر رہے ہیں مگر یہ طے ہے کہ حکومت کے خلاف سارے کے سارے گوریلے متحد ہیں۔

حکمرانوں کے کھیل

سویلین اور فوجی حکمرانی میں وہی فرق ہے جو کرکٹ اور گالف میں ہے۔ نواز شریف ہوں یا بے نظیر بھٹو۔ دونوں کو کرکٹ کا شوق ہے نواز شریف خود کرکٹر ہیں اور بے نظیر کو کرکٹر پسند ہیں۔ ان کے مقابلہ میں فوجی حکمران گالف پسند کرتے اور کھیلتے ہیں۔

پاکستان کے اولین آمر حکمران ایوب خان گالف کھیلتے تھے اس کھیل میں ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ غیر ملکی مشاہرین کے ساتھ گالف کھیلتے ہوئے ان کی مسکراتی ہوئی تصویریں اخباروں کی زینت بنتی تھیں۔ ایوب خان رخصت ہوئے تو جنرل یحییٰ خان کو اقتدار ملا ان کو گالف سے زیادہ فٹ بال کا شوق تھا۔

انہوں نے ملک کو فٹبال سمجھ کر جب اور جدھر چاہا ٹھوکر مار کر لڑھکا دیا۔ ان کے دور میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ مگر ان کے جانشین نے ان کے لیے میدان میں فٹ بال کھیلنے کی سہولت برقرار رکھی۔ سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار ڈکٹیٹر معزولی کے بعد بھی فٹ بال کھیلتا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ٹوٹے ہوئے ملک کا اقتدار سنبھالا تو ان کو "پاور گیم" کا بہت تجربہ ہو گیا تھا۔ وہ خود کرکٹ سے شغف رکھتے تھے کمنٹیٹر عمر قریشی ان کے کلاس فیلو تھے اور ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے تھے۔ بھٹو کو شکار کا بھی بہت شوق تھا انہوں نے اپنے بھائی سکندر علی بھٹو کی یاد میں میموریل کرکٹ ٹرافی شروع کرائی تھی جو ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد ختم کر دی گئی۔

بھٹو کی پھانسی کے بعد سیاست کے کھیل میں کافی وقفہ آ گیا۔ جنرل ضیاء الحق کرکٹرز کو پسند کرتے تھے کرکٹ کے میچوں کی وجہ سے قوم کی توجہ الیکشن کے کھیل سے ہٹ گئی۔ ضیاء الحق کو کرکٹ ڈپلومیسی کی سوجھی ایک دن اپنے طیارے میں بیٹھ کر وہ بھارت پہنچ گئے راجیو گاندھی کے گلے ملے مگر کرکٹ سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات بہتر نہ ہو سکے۔

جنرل ضیاء الحق کی ایک آدھ بار سفید شرٹ پتلون میں گالف کھیلتے ہوئے فوٹو شائع ہوئی تھیں جس میں وہ مسکرا رہے ہوتے تھے۔

وزیراعظم محمد خان جونیجو آئے تو ان کو کرکٹ صرف دیکھنے کی حد تک پسند تھا۔ جونیجو کے دور میں جاوید میاں داد نے شارجہ میں تاریخی چھکا لگا کر بھارت کو شکست دی جس پر ان پر انعامات کی بارش کر دی گئی۔ قوم کو عرصہ بعد حقیقی خوشی نصیب ہوئی تھی۔ محمد خان جونیجو کے روحانی پیشوا پیر صاحب پگاڑو کا پسندیدہ کھیل کرکٹ رہا جنہوں نے اپنے پتے چالاکی سے کھیل کر اپنے مرید سے اننگز شروع کرادی اور وہ پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ ان کے مخالف اور وزارت عظمیٰ کے امیدوار الٰہی بخش سومرو پیڈ باندھے بیٹھے ہی رہے۔ ان کی باری تک نہیں آئی نہ ظفر اللہ جمالی کو بیٹنگ کے جوہر دکھانے کا موقع ملا جبکہ جنرل ضیاء الحق کے اوپننگ بیٹسمین راجہ ظفر الحق الیکشن میں ہار گئے تھے۔

جنرل ضیاء الحق جب رخصت ہو گئے تو بے نظیر بھٹو کو اقتدار ملا۔ ماجد خان کو بے نظیر اپنا پسندیدہ کرکٹر بتاتی ہیں جن کی بیٹنگ وہ بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ مگر بے نظیر بھٹو کو ایک کرکٹر عمران خان کی شکل میں بڑی مخالفت کا سامنا ہے جو ان کی تیسری اننگز کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ عمران خان کے خیال میں اگر ایمپائرنگ صحیح ہو تو ان کی تحریک انصاف اپنی اننگز شروع کر سکتی ہے۔

نواز شریف عمران خان کے پایہ کے کرکٹر تو نہیں ہیں نہ بن سکے مگر کرکٹر نواز شریف نے اپنے اقتدار میں جب بھی کرکٹ کھیلی ہمیشہ بیٹنگ کرنے کو ترجیح دی۔ بولنگ اور

فیلڈنگ سے ان کو نفرت ہے۔ کراچی کے صحافی جب ان کے ساتھ میچ کھیلنے گئے اور میچ کے دوران جب ایک فیلڈر نے نواز شریف کا کیچ لیا تو ایمپائر نے وزیراعظم سے پوچھا ''سر کیا آؤٹ دے دوں'' اس پر نواز شریف نے حکم دیا کہ ''اگر میں آؤٹ ہوں تو آؤٹ دے دو'' ایمپائر میں بھاری مینڈیٹ کے حامل وزیراعظم کے خلاف انگلی اٹھانے کی ہمت نہ تھی اس دوران واشنگٹن سے بلاوا آ گیا۔ اور وہ بیٹنگ چھوڑ کر جب واشنگٹن گئے تو اس کے بعد ان کی قسمت میں فیلڈنگ لکھ دی گئی۔ کارگل سے پسپائی کو ان کے وزیر اطلاعات نے ان کا تاریخی کارنامہ قرار دے دیا حالانکہ قوم رو رہی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جو لوگ نواز شریف کو کرکٹ کھلانے لائے تھے وہی ان کو واپس پویلین میں لے گئے اور ملک ایک کرکٹر وزیراعظم کے اقتدار سے محروم ہوگیا۔ اب نواز شریف جیل میں ہیں ان کے خاندان کے لوگ چارج شیٹ سن کر رو رہے ہیں مگر ان کے فیلڈر مسلم لیگی لیڈر مسکرا رہے ہیں۔ ایک کرکٹر وزیراعظم کرکٹ کی طرح ''سیاست کے بیڈ پیچ'' سے گزر رہا ہے۔ کیا وہ نئی اننگز شروع کر سکے گا۔ فی الحال بیٹنگ کے شوقین کرکٹر کی فیلڈنگ کی باری طویل نظر آ رہی ہے۔ یہی سیاست کا کھیل ہے۔ کبھی بیٹنگ کبھی فیلڈنگ۔ عجیب اتفاق ہے کہ حکمران کو تو بیٹنگ کی باری مل جاتی ہے مگر قوم کی قسمت میں ہمیشہ فیلڈنگ ہی آتی ہے۔

سابق صدر فاروق لغاری چونکہ جاگیردار ہیں اس لیے وڈیروں جیسے کھیل اپناتے ہیں۔ انہیں کرکٹ سے دلچسپی تو ہے مگر کرکٹ کھیلنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ یہ گلیمرائزڈ کھیل ان کی طبیعت کو موافق نہیں ہے تاہم صرف بیٹنگ کے لے ان کو مخصوص کر دیا جائے تو شاید کرکٹ کھیلنے پر آ جائیں البتہ شکار کھیلنے کے لیے وہ ہر وقت تیار ہوں گے خاص طور پر وہ نرم و نازک پرندوں کے شکار کے لیے خاصے مشہور ہیں۔

غلام اسحاق پٹھان ہیں مگر بیوروکریٹس کی حیثیت سے سرک سرک کر آگے بڑھتے رہے اور پاکستان کے صدر بن گئے۔ سنا ہے انہیں شطرنج کھیلنے کا شوق تھا اور جوانی میں

دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے لیے علاوہ غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ بھی اس کھیل کے جوہر دکھاتے تھے۔ ویسے بیورو کریسی کے پیر کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ شطرنج اور بلیرڈ ان کا پسندیدہ کھیل ہے۔

معین قریشی جب نگران وزیر اعظم بنائے گئے تو ان کے کھیلوں کے شوق منظر عام پر نہ آ سکے کیونکہ انہیں اقتدار کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔ شاید وہ بھی شاہوں جیسے شغل پالتے اور کوئی عجیب کھیل سکتے مگر انہیں صرف جاگنگ کا شوق تھا اس لیے وہ سیر کرتے ہوئے پاکستان آئے اور اسی طرح جاگنگ کرتے ہوئے چلے آئے۔

پاکستان کے ایک معصوم ترین اور سادہ ترین نگران وزیر اعظم معراج خالد دیسی کھیلوں کے شوقین تھے۔ جوانی میں کشتی، کبڈی اور فٹ بال کھیلنے والے اس وزیر اعظم نے اقتدار میں رہتے ہوئے کسی خاص کھیل کا مظاہرہ نہ کیا البتہ انہیں بھی صبح سویرے چہل قدمی کرنے کا شوق تھا۔ وزارت عظمٰی کا قلمدان سنبھالنے سے پہلے وہ لاہور کی سڑکوں خاص طور پر مال روڈ پر بھی جاگنگ کرتے اور اپنے معمولات انجام دیتے وقت بھی پیدل چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔

پنجاب کے سردار نکئی کو بھی دیسی کھیلوں کا شوق تھا، خاص طور پر انہیں رسہ کشی کے کھیل میں دسترس حاصل تھی، اسی لیے تو انہیں پنجاب کا اقتدار سونپ دیا گیا تھا۔

سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ کے کھیلوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہیں روایتی کھیل زیادہ پسند تھے اس لیے وہ خود بھی ایسے ہی کھیل کھیلتے تھے مگر اقتدار میں آتے ہی ان کی جسمانی ورزش کے کھیل تو موقوف ہو گئے تاہم انہیں سیاسی کھیلوں کے لیے اپنے روایتی کھیلوں کی خصوصیات کا استعمال کرنا پڑا۔

کھیل بظاہر جسمانی اور ذہنی نشوونما کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی فطرت کے مطابق کھیلے جانے والے کھیل انسان کی طبیعت میں کچھ اس طرح سے رچ بس جاتے ہیں کہ وہ روزمرہ معمولات میں ان کا اظہار کرتا رہتا ہے ہمارے سیاستدانوں

کے مقدر میں بھی انہی کھیلوں کی جزا اور سزا لکھ دی گئی ہے۔ اس کو اس کے کھیلوں کی مناسبت سے فیلڈنگ دی جاتی ہے یا پھر بارہویں کھلاڑی کی طرح پانی بھرنا پڑتا ہے یا پھر سزا کے طور پر ٹیم سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ پاکستانی سیاست میں امپائرنگ بھی مشکوک ہوتی ہے اس لیے بیٹنگ کرنے والے کھلاڑی کے تعلقات امپائر سے مضبوط ہوں تو اسے آؤٹ کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔

کیا بھٹو فیکٹر سیاست میں زندہ ہے؟

کیا صنم بھٹو کو سیاست میں لایا جا رہا ہے؟ سیاسی حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے۔ اس کی ابتدا ایک انٹرویو سے ہوئی جو صنم بھٹو نے لندن میں دیا۔ اس سے یہ تاثر ابھرا کہ شاید بھٹو فیملی کی واحد غیر سیاسی فرد کو بے نظیر کی نااہلی کی صورت میں آگے لایا جائے گا۔ بھٹو فیملی بنیادی طور پر سیاسی فیملی ہے جس نے سیاست کی بدولت جہاں شہرت، عزت اور دولت حاصل کی۔ وہاں سیاست نے بھٹو فیملی کو دکھ بھی دیے۔ اور لاشوں کے تحفے بھی دیے۔ بھٹو فیملی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوگئی ان کے دونوں بیٹے ہلاک ہوگئے۔ فیملی کے سارے مرد غیر طبعی موت کا شکار ہو کر رخصت ہوگئے۔ اب خواتین ان کا سوگ منانے کے لیے رہ گئی ہیں۔ اس وقت بیگم نصرت بھٹو کی حالت ایسی نہیں کہ سیاست کر سکیں۔ مرتضیٰ بھٹو کے سانحہ کے بعد سے اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہیں۔ ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ کبھی چند لمحوں کے لیے بحال ہوتی ہے پھر کھو جاتی ہے۔ جب ایک بار بے نظیر بھٹو سے پوچھا گیا کہ بیگم صاحبہ کی کیا حالت ہے تو انہوں نے کہا کہ ایک ماں ہی ماں کا درد جان سکتی ہے۔ انہوں نے بڑے دکھ جھیلے ہیں ان کی یادداشت کا یہ حال ہوگیا ہے کہ کبھی برسوں کی یاد آجاتی ہے کبھی چند لمحوں کی بات بھول جاتی ہیں۔ خود بیگم نصرت بھٹو سے جب وہ صحیح تھیں ایک اخبار نویس نے دریافت کیا کہ کیا آپ کا اپنی یادداشتیں لکھنے کا ارادہ ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں میں بڑی بدنصیب ہوں۔ کیا یاد

رکھوں کیا بھول جاؤں میں تو سب کچھ بھلانا چاہتی ہوں لیکن بھول نہیں سکتی ہوں۔ بیگم بھٹو آخری بار منظر عام پر آئیں تو وہ مرتضیٰ بھٹو کا سوئم تھا۔ بلاول ہاؤس میں بیگم بھٹو اپنی بیٹیوں بے نظیر اور صنم کے ساتھ رو رہی تھیں۔ بختاور اپنی ماں کے اور آزادی اپنے ماں کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بیگم بھٹو کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ انہی آنسوؤں کے درمیان وہ منظر عام سے ہٹ گئیں۔ بے نظیر بھٹو ان کو ۷۰ کلفٹن سے لے گئیں جہاں کے در و دیوار بھٹو خاندان کے رخصت ہونے والے مردوں کی تصویروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بیگم بھٹو ۷۰ کلفٹن میں مرتضیٰ، غنویٰ اور فاطمہ اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ان کو یقین تھا کہ مرتضیٰ ایک روز ضرور پاکستان کا وزیر اعظم بنے گا۔ ان کا خواب ادھورا رہ گیا بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ مرتضیٰ کی بیٹی فاطمہ یہ خواب پورا کر سکتی ہے۔ جو بہت باشعور ہے۔ سمجھ دار ہے۔ فاطمہ نے جس کے ہاتھوں میں مرتضیٰ نے دم توڑا شاعری کرتی ہے جس کے دو مجموعے منظر عام پر آ گئے ہیں۔ اس کی بعض نظمیں بالواسطہ طور پر بے نظیر بھٹو کے بارے میں ہیں۔ بھٹو فیملی کراچی میں ۷۰ کلفٹن اور ۷۱ کلفٹن میں رہی جہاں اب مرتضیٰ کی بیوی غنویٰ بھٹو، فاطمہ اور ذوالفقار جونیئر کے ساتھ رہتی ہیں۔ غنویٰ پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کی سربراہ ہیں جس میں چاروں صوبوں کے بعض بڑے بڑے لیڈر شامل رہے ہیں۔ لاڑکانہ میں المرتضیٰ بھٹو فیملی کی سرگرمیوں کا محور رہا جس کی دیواروں پر بے نظیر اور ان کے شوہر کے خلاف نعرے لکھے نظر آتے ہیں۔ مرتضیٰ کی برسی پر آصف زرداری کے خلاف جلوس نکلتے ہیں۔ لاڑکانہ کے لوگ آصف زرداری کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لاڑکانہ کے مین بازار میں ایک خوانچہ فروش سے جب پوچھا گیا کہ مرتضیٰ کا بدلہ کیسے لیا جائے گا؟ اس نے کہا جب ذوالفقار وزیر اعظم بنے گا تب ہمارا بدلہ ہوگا۔ کیونکہ مرتضیٰ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد غنویٰ بھٹو کی طرف سے بے نظیر بھٹو پر سخت نکتہ چینی کی گئی جب ان کی حکومت ختم ہوگئی تو غنویٰ کا لب ولہجہ بدل گیا۔ اب وہ بے نظیر بھٹو کے بارے میں سوال کا جواب دینے سے معذرت کر لیتی ہیں۔ بے نظر بھٹو جس دوران اسلام آباد میں تھیں۔ ۷۰

کلفٹن اے کلفٹن اور المرتضیٰ لاڑکانہ عملی طور پر غنویٰ بھٹو کے کنٹرول میں آ گئے۔ لبنانی نژاد شامی غنویٰ جو پاکستان کی شہری ہیں اس سوال پر برہم ہوجاتی ہیں کہ وہ غیر ملکی ہیں۔ وہ کہتی ہیں میں پاکستانی ہوں۔ پاکستانی لیڈر کی بیوہ ہوں۔ پاکستانی بچوں کی ماں ہوں میں کتنے اور سرٹیفکیٹ پیش کروں۔ اپنے پاکستانی ہونے کے ناطے بے نظیر بھٹو نے اس صورتحال میں اپنا بیس نوڈیرو کو بنایا مگر اس عید الفطر پر اس لحاظ سے تبدیلی آئی کہ خود غنویٰ بھٹو نوڈیرو پہنچ گئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو فیملی کے آبائی گھروں سے مکمل طور پر بے دخل ہو رہی ہیں۔ بے نظیر کو احساس ہے کہ عام پاکستانیوں سے زیادہ سندھیوں کی جذباتی وابستگی بھٹو فیملی کے ساتھ ہے۔ مرتضیٰ اپنی زندگی میں اس پر اعتراض کرتے تھے کہ بے نظیر بدستور بھٹو کا نام استعمال کر رہی ہیں۔ وہ کہتے تھے بے نظیر زرداری ہیں ان کو آصف اور ان کے والد حاکم علی ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے نہ کبھی انہوں نے اپنی ناپسندیدگی چھپائی۔ غنویٰ بھٹو کے لیے جن پر بے نظیر کی طرح اس قسم کا دباؤ نہ تھا مشکل اس وقت پیدا ہوئی جب مرتضیٰ کی پہلی بیوی فوزیہ اچانک نمودار ہوگئی۔ فوزیہ فاطمہ کی حقیقی ماں ہے جس کو ۷۰ کلفٹن فاطمہ کی ''بایولوجیکل ماں'' قرار دیتا ہے۔ فوزیہ فاطمہ کو اپنے ساتھ لے جانے آئی تھی۔ فوزیہ کی آمد میں بے نظیر بھٹو کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس سے غنویٰ کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔ فوزیہ اپنی بیٹی کو ملنے اس کے اسکول گئی۔ عدالت میں کیس کیا۔ مگر حقیقی ماں ہار گئی۔ فاطمہ نے غنویٰ کو چھوڑ کر فوزیہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کیس سے بھٹو فیملی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ بھٹو خاندان کی بہوؤں فوزیہ اور غنویٰ کے اس تنازعہ سے الگ بھٹو خاندان کی بیٹی صنم اپنے عائلی مسئلہ سے دوچار تھی۔ صنم بھٹو کی شادی ناصر حسین سے جنرل ضیا کے مارشل لاء کے دوران ہوئی۔ حالات اتنے کٹھن تھے کہ شادی کارڈ چھاپنے والے پریس کے مالک کو پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔ کراچی میں کوئی پریس شادی کارڈ چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ صنم کی مہندی کے روز بے نظیر بھٹو سے ایک حکم کی پولیس نے تعمیل کرائی جس میں ان کے صوبہ سرحد میں داخلہ پر پابندی میں توسیع کی گئی۔ پولیس افسروں نے شاہ سے زیادہ وفادار

بننے کی کوشش میں یہ کارروائی کی جس سے جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے بارے میں انتہائی منفی تاثر پھیلا۔ بھٹو فیملی کی طرف سے اس وقت کے فوجی گورنر سندھ سے سخت احتجاج کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان پولیس افسروں کو معطل کر دیا گیا جو آرڈر لے کر مہندی کی رسم میں مصروف بے نظیر بھٹو کے پاس گئے تھے۔ بے نظیر بھٹو کو پولیس کی اس حرکت سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کی پولیس کے آرڈر کی تعمیل کرتے ہوئے رنگین تصویر کراچی کے ایک روزنامے نے شائع کر دی۔ یہ روزنامہ اس روز کئی بار شائع کیا گیا۔ مہندی کی تقریب سیاسی سرگرمیوں میں نہیں آتی۔ اس لیے مارشل لاء حکومت کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔ صنم بھٹو اپنے گھر کی ہو گئیں۔ ان کی شادی میں دونوں بھائی مرتضیٰ اور شاہنواز شریک نہیں تھے۔ دونوں نے بہن کے لیے تحائف بھیجے۔ بھٹو فیملی میں بھٹو کی پھانسی کے ۱۹۷۹ء کے سانحہ کے بعد یہ پہلی خوشی آئی تھی۔ صنم کو رخصت کر کے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو بہت خوش تھیں۔ صنم کی بیٹی کا نام ''آزادی'' رکھا گیا۔ بھٹو فیملی میں ناموں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ صنم کی شادی کے کچھ عرصہ بعد علیحدگی کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ صنم کی ناصر سے ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو سکی۔ مگر مرتضیٰ بھٹو کے قریبی ساتھی تھے۔ جب مرتضیٰ جلا وطنی سے واپس آئے تو ناصر حسین نے ان کا ساتھ دیا۔ اس دوران ناصر حسین نے ایک بیان میں بے نظیر بھٹو پر نکتہ چینی کی اس پر بے نظیر نے سخت برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی کو بھٹو فیملی پر تنقید کا حق نہیں ہے۔ ناصر حسین کی صنم سے علیحدگی ہو گئی مگر اس کا اعلان کرنے سے گریز کیا گیا۔ جب ناصر حسین کو قتل کے ایک مقدمہ میں گرفتار کیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ بھٹو فیملی کو قتل کے مقدمات سے کب نجات ملے گی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے پر آصف زرداری خود مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے کیس میں پکڑے گئے۔ بھٹو خاندان کے دونوں داماد قتل کیس میں جیل میں تھے۔ ناصر حسین ضمانت پر رہا کر دیئے گئے مگر آصف کا کیس ابھی چل رہا ہے۔ جس میں پولیس افسروں کی ضمانت ہو چکی ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک عدالت فیصلہ دے چکی ہے۔ ان کو کرپشن کے ایک کیس میں مجرم قرار دے دیا گیا۔ بے نظر بھٹو اس وقت

عملی طور پر خود ساختہ جلاوطنی کی کیفیت میں ہیں۔ انکی مستقبل قریب میں وطن واپسی مشکل ہے۔ ان کے شوہر آصف علی زرداری کسی مقدمہ میں سزا پائے بغیر جیل میں ہیں۔ سیاست بلاول ہاؤس سے رخصت ہوسکتی ہے۔ بلاول بختاور اور آصفہ بہت چھوٹے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ سوچا جا رہا ہے کہ صنم کو بھٹو کے نام پر آگے لایا جائے۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں بھٹو فیکٹر بدستور سیاست میں زندہ ہے۔ بے نظیر کو پی پی کو بھٹو کے نام پر ووٹ پڑتے ہیں کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بھٹو کا قرض ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں اتار دیا گیا۔ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۷ء میں جو ووٹ پڑے وہ بے نظیر کو پڑے۔ بے نظیر کو اس کا احساس ہے کہ جب تک وہ بھٹو ہیں ان کو ووٹ پڑیں گے۔ اس نام سے وہ خود کو الگ کرنا کبھی نہیں چاہیں گی۔ نجی محفلوں میں بے نظیر یہی کہتی ہیں ''میں بھٹو ہوں۔ آسانی سے ہار ماننے والی نہیں ہوں'' بے نظیر کو یہ فائدہ آصف زرداری کی قید سے ہوا ہے کہ ان کے شوہر کے بارے میں منفی تاثرات کچھ کم ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود بے نظیر اپنی نااہلی کی صورت میں آصف زرداری کو آگے نہیں لائیں گی۔ قرعہ فال پھر بھٹو فیملی ہی کے فرد کے نام نکل سکتا ہے۔ غنویٰ کو بے نظیر بھٹو ابھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ فاطمہ بھٹو ابھی کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ بے نظیر بھٹو کی ایما پر کرے گی بلکہ شاید بھتیجی اپنی پھوپھی کو چیلنج کرے گی۔ جیسے ایک بھتیجی بے نظیر نے اپنے انکل ممتاز علی بھٹو کو چیلنج کیا تھا۔ کیا اس دوران صنم بھٹو کو خلا پر کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ بھٹو فیملی کے ایک قریبی دوست سے جب دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں صنم کو جانتا ہوں۔ وہ کبھی سیاست میں نہیں آئے گی۔ جب ایک بار بے نظیر کے ایما پر صنم سے یہ بات کہی گئی کہ وہ سندھ سے الیکشن لڑے تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا سیاست نے ہمیں کیا دیا ہے۔ کیا اب تک سیاست سے بھٹو فیملی کو کم دکھ ملے کہ سیاست میں آجاؤ صنم کو خدشہ ہے کہ بھٹو فیملی میں کوئی اور سانحہ نہ ہوجائے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ذوالفقار مرتضیٰ اور شاہنواز کی لاشوں کے باوجود بھٹو فیکٹر سیاست زندہ ہے مگر بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی میں قیادت کا بحران ہے۔

سیاستدانوں کے القابات

مرنجاں مرنج محمد خان جونیجو کی حکومت کی برطرفی کے اعلان کو چند گھنٹے ہوئے تھے۔ ۷۰ کلفٹن میں بے نظیر بھٹو اپنے شوہر آصف علی زرداری کے ساتھ بیٹھی تھیں، آصف زرداری آم چوس رہے تھے اور بے نظیر بھٹو جامن کھا رہی تھیں۔

''اب کیا ہوگا'' کسی نے پوچھا۔

جواب ملا ''مجھے ڈر ہے فضلو اور نصرو کیریکٹر حکومت میں چلے جائیں گے''۔

یہ تھے بالترتیب مولانا فضل الرحمٰن اور نواب زادہ نصر اللہ خان اتفاق سے دونوں جنرل ضیاء الحق کے خلاف اتحاد میں بے نظیر بھٹو کے ساتھی تھے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیاستدان ایک دوسرے کے نام رکھنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں کسی رعایت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ سیاست دان اقتدار میں آجائے تو مخالفین اس کے نام کے ساتھ پالتو جانور کا نام تک لگا دیتے ہیں۔

اس میں لوگوں کا قصور نہیں ہے، پاکستان کے لوگ بڑے ہی سیدھے سادے ہیں اپنے لیڈروں کو بے پناہ چاہتے ہیں ان کی پوجا پاٹ شروع کر دیتے ہیں جب ان سے مایوس ہوتے ہیں تو ان کو جوتوں کے ہار پہنانے کی کوشش کرتے ہیں لیڈر دستیاب نہ ہوں تو ان کی تصویروں کو جوتوں سے سجا دیتے ہیں۔ پاکستانی قوم کی یہ نفسیات ہے کہ پاپولر اس کو بناتی ہے جس نے حکومت کو، پاور کو، اقتدار کو، اسٹیبلشمنٹ کو، چیلنج کیا ہو۔

ذوالفقار علی بھٹو جو پاکستان کے پہلے عوامی لیڈر تھے ایوب خاں کے خلاف عوامی جذبات کو ابھار کر مقبول ہوئے ایوب خان غالباً پہلے حکمراں تھے جن کے خلاف نعروں میں ایک جانور کا نام استعمال کیا گیا بھٹو کے دور کے سیاستدانوں کے مطابق پی پی پی کے بانی ایوب خان کو "ڈیڈی" کہا کرتے تھے اور ان سے بڑے متاثر تھے۔

ایوب خان کے بعد اقتدار سنبھالنے والے یحییٰ خان کو اتنا ہوش ہی نہیں رہتا تھا کہ اپنے خلاف کسی نعرہ کو سن سکتے۔ اسی مدہوشی میں آدھا پاکستان گنوا بیٹھے۔ پاکستان کے سرکاری محکموں میں ایک میز غائب ہو جائے تو مہینوں انکوائری کی جاتی ہے مگر آدھا پاکستان گنوانے پر کسی انکوائری کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

ایوب ہائے ہائے کے نعروں کے بعد جب یحییٰ خان کی رخصتی پر ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو کچھ عرصہ خاموشی رہی بحران کے باعث قوم ان کے ساتھ تھی۔ بھٹو میں بھی قوم کو اپوزیشن کو ساتھ رکھنے کی صلاحیت تھی۔ جب انہوں نے آمرانہ ڈھنگ دکھانا شروع کیے جیلوں کو مخالفین سے بھرنے لگے تو اپوزیشن کی لیڈر شپ کو خیال آیا کہ یہ اچھا موقعہ ہے چنانچہ اپوزیشن کا اتحاد بن گیا۔ گنجے کے سر پر ہل چلے گا کے نعرہ کی کیاڑی سے خیبر تک گونج شروع ہوگئی۔ فخر ایشیا کو فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سے ہٹا دیا مضبوط کرسی بڑی کمزور ثابت ہوئی بھٹو کو سلیوٹ مارنے والا ان کو تختہ دار تک لے گیا۔ جنرل ضیاء الحق کی کوئی صفت ایسی نہ رہ گئی تھی کہ ان کے مخالفین اس کا نعرہ بناتے۔ ان کی مونچھوں کا ذکر ہوتا تھا لاہور میں ان کی حکومت کو سرمہ والی سرکار کہا جاتا تھا۔ مارشل لاء کا سخت دور تھا۔ دیوار پر نعرہ لکھنے پر کوڑوں اور قید کی سزا دی جاتی تھی۔ اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد بیشتر سیاستدان بادشاہ بن گئے۔ یہ وہ دور ہے جب بے نظیر بھٹو "پنکی" تھیں، "بے بی" تھیں۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ۷۰ کلفٹن میں اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ "میرے والد آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں"۔ بے نظیر بھٹو کان کے علاج کے لیے لندن چلی گئیں تو بے شمار جیالے مایوس

ہو گئے کہ شاید اب کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ بے نظیر بھٹو ۱۹۸۶ء میں واپس آئیں تو پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے سورما لاہور پہنچ گئے بے نظیر نے ضیا جاوے جاوے کا نعرہ لگایا اور اپنے انکلوں کھر ممتاز بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی اور عبدالحفیظ پیرزادہ کو نکال باہر کیا۔ پاکستان میں نئی سیاست شروع ہو گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط میں پیدا ہونے والی لیڈر شپ آگے آ رہی تھی۔ بے نظیر بھٹو کو چاروں صوبوں کی زنجیر قرار دیا گیا۔ ان کے مخالفین سندھ کارڈ استعمال کرنے کا الزام لگاتے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کے بعد پاکستان کی وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو ایوان صدر میں پہلی بار جئے بھٹو کا نعرہ گونجا۔ اس نعرہ کے ساتھ ہی بے نظیر بھٹو ''محترمہ'' بن چکی تھیں۔

محترمہ کے محترم آصف علی زرداری کو پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالے ''آصف بھائی'' کے نام سے پکارتے تھے تو مخالفین مسٹر ٹین پرسینٹ کہتے تھے۔ اپوزیشن نے خاتون وزیراعظم کے کھلنڈرے شوہر کی سرگرمیوں کو پوری طرح ایکسپولائٹ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ماہ کے اندر آصف زرداری کو ٹین سے ہنڈرڈ پرسنٹ کا خطاب مل گیا۔ اپوزیشن کی مہم اتنی کامیاب رہی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کر دی گئی۔ بے نظیر بھٹو کی جگہ نواز شریف نے اقتدار سنبھالا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، ولی خاں اکبر بگٹی الطاف حسین سب ان کے ساتھ تھے۔

نواز شریف کو فخر پاکستان کا اعزاز ان کے حامیوں نے دیا مخالفین نے ان کے کم بالوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ شریف فیملی کے نام سے مخالفانہ نعرے بنائے گئے اپنی دوسری حکومت میں بھاری مینڈیٹ کے حامل وزیراعظم کو ایک سبزی کا نام دے دیا گیا۔ اپوزیشن کے ارکان سبزی کا نام لے کر ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کبھی نواز شریف کے حامی رہے کبھی مخالف خود نائن زیرو پر الطاف نواز بھائی بھائی کے نعرے لگائے تھے۔

الطاف حسین کو ان کی مہاجر تحریک کی ابتدا کے دنوں میں الطاف بھائی کہا گیا۔

ان کے لیے مہاجروں کے دل کا چین الطاف حسین الطاف حسین کے نعرے بلند ہوئے پھر الطاف حسین اچانک پیر صاحب بن گئے سندھ اربن میں ان کی روحانیت کے چرچے ہونے لگے۔ پتھروں اور پتوں پر ان کی تصویریں نظر آنے لگیں۔ جب حالات بدلے تو ان کو قاتل کے نام سے پکارا گیا۔ آپریشن سے الطاف حسین پھر مقبول ہو گئے اس بار ان کو حق پرستوں نے ''بھائی'' کا ٹائٹل دیا۔ بڑے چھوٹے سب کے بھائی تھے غلام اسحاق سے لے کر فاروق لغاری تک ان کو بھائی کہتے تھے۔ بھائی کا یہ ٹائٹل اب تک چل رہا ہے نائن زیرو پر خدمات انجام دینے والی تمام خواتین کو باجی کہا جاتا ہے۔

سیاست میں بڑے بھائی تو بہت ہیں۔ سندھ بلوچستان اور سرحد کے سیاستدان پنجاب کو بڑا بھائی کہتے ہیں۔ سیاست میں چھوٹے بھائی مولانا شاہ احمد نورانی ہیں جن کو پیر صاحب پگاڑو اپنا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ نورالٰہی میاں کو ان کے مرید حضرت اور پیر پگاڑو کو ان کے مرید قبلہ سائیں کہتے ہیں عقیدت مند دونوں کے ہاتھ چومتے ہیں۔ پیر پگاڑو کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جن کو حر کہا جاتا ہے۔ سابق نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کے دونوں پیر پگاڑوں اور مولانا شاہ احمد نورانی سے اچھے تعلقات ہیں جتوئی کو خاندان میں بڑے جتوئی کہا جاتا ہے ان کے بھائی اور بیٹے ان کے احترام میں ان کے سامنے خاموش بیٹھے رہتے ہیں جتوئی ذوالفقار علی بھٹو کے دوست تھے انہوں نے اپنے دوست کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کو ذوالفقار علی بھٹو سے قربت کے باوجود کوئی ٹائٹل نہیں مل سکا۔ البتہ یہ ٹائٹل ممتاز بھٹو ملک غلام مصطفیٰ کھر اور حفیظ پیرزادہ کے حصہ میں آئے۔ ممتاز بھٹو کو ڈھیسر سندھ (سندھ پر دس سر قربان کرنے والا) کھر کو شیر پنجاب اور حفیظ پیرزادہ کو ''سوہنا منڈا'' کا خطاب ملا۔ حفیظ پیرزادہ پی پی اور پی این اے کے مذاکرات میں شریک رہتے تھے۔ بابائے مذاکرات کا اعزاز غوث بخش بزنجو اور نواب زادہ نصر اللہ کو ملا۔ دونوں بات چیت کے ماہر کہے گئے۔ غوث بخش بزنجو رخصت ہو گئے نواب زادہ نصر اللہ

مذاکرات کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

عمران خان کرکٹ کے سپر اسٹار رہے ہیں سیاست میں ان کو بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ ان کے مخالفین انتخابات کے نازک مرحلہ پر کوئی نہ کوئی اسکینڈل نکال لیتے ہیں جس سے ان کا پلے بوائے کا امیج پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سیتا وائٹ کا اسکینڈل ان کی انتخابی مہم کو ختم کر چکا ہے۔ عمران خان ریفارمرز کے طور پر سیاست میں سرگرم ہو رہے ہیں۔ یہی مشن سابق صدر سردار فاروق لغاری کا ہے فاروق لغاری کو بے نظیر بھٹو فاروق بھائی کہتی تھیں۔ وہ ان کو اپنی لیڈر اور بہن قرار دیتے تھے۔ جب اختلافات ہوئے تو وہ بہن نہ رہی وہ بھائی نہ رہے اور لغاری فاروق الحق بنا دیئے گئے۔

اکبر بگٹی کو نواب اور عطاء اللہ مینگل کو ''سردار'' کہا جاتا ہے۔ اصغر خان کو بھٹو دور میں ان کے مخالفین ایک سبزی سے موسوم کرتے تھے۔ وہی سبزی کا نام لینے پر پاکستانی کھلاڑی انضمام الحق نے کینیڈا میں ایک بھارتی تماشائی کی پٹائی کر دی تھی۔

مرنجاں مرنج محمد خان جونیجو کے بارے میں ان کے مخالفین کہتے تھے کہ سندھڑی کی دو چیزیں مشہور ہیں جونیجو اور آم۔ ضیاء کے وزیراعظم کے لیے سب سے دلچسپ بات پروفیسر غفور احمد نے کہی تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ محمد خان جونیجو کی جنرل ضیاء الحق سے کیا ڈیلنگ ہوگی اس پر انہوں نے کہا کہ جونیجو شریف آدمی ہیں ریلوے کے وزیر رہے ہیں جہاں انجن لے جائے گا چلے جائیں گے۔

مقروض قوم پر قرضوں کا پہاڑ

پاکستان کے حکمرانوں نے مقروض قوم پر قرضوں کا پہاڑ لادنے کی ٹھان لی ہے۔ قومی بینکوں کو نواز حکومت کے فلاحی پیکج کے لیے ۱۵۰ بلین روپے کے قرضے فراہم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے یہ قرضے میرا گھر اسکیم ٹرانسپورٹ اسکیم بیمار صنعتوں کی بحالی اور نوجوانوں کے لیے کاروبار کی اسکیموں کے لیے دیئے جائیں گے اس قرضہ پیکج سے حکومت کی عوام میں مقبولیت میں لازمی طور پر اضافہ ہوگا مگر اس سے ملک کی معیشت کو بے پناہ نقصان پہنچے گا ملک میں نادہندگی کی جو روایت مستحکم ہو چکی ہے اس کے پیش نظر یہ توقع کرنا کہ ان سکیموں کے قرضے ادا کر دیئے جائیں گے فضول ہوگا آثار یہی ہیں کہ ان کا حشر یلو کیب کی طرح ہوگا سینکڑوں یلو کیب بینکوں کو نیلام کرنا پڑ رہی ہیں اور ہزراروں ضبط ہو چکی ہیں بے شمار سرحد پار فرار ہو گئی ہیں ان گنت یلو کیب سے بلیک اور وائٹ کار میں تبدیل ہو گئی ہیں رشوت دے کر رجسٹریشن پلیٹ تبدیل کرانا مشکل نہیں ہے۔

عام آدمی جو مہنگائی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو رہا ہے یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ نادہندہ لیڈر شپ ملک میں مقروضوں اور نادہندگان کی فوج تیار کرنے پر کیوں مصر ہے۔

بینکرز حکمرانوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ واجب الادا قرضے جو ۲۲۵ بلین روپے تک پہنچ چکے ہیں دو سال کے اندر ۳۷۵ بلین روپے کی حد عبور کر جائیں گے۔ اس میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ بلین روپے نئی اسکیموں کے لیے شامل کیے جائیں تو یہ قرضہ پانچ سو بلین روپے

سے تجاوز کر جائے گا یہ صورتحال تشویشناک ہوگی جس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جب جمہوریت آئی ہے قرضوں کا سیلاب آ گیا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جب جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں جزوی جمہوریت بحال ہوئی تو قرضوں کی مالیت پچاس بلین روپے سے کم تھی سیاسی حکومت آئی تو شوگر ملز ٹیکسٹائل ملز سمیت ملز کے لیے قرضوں کے دروازے کھول دیئے گئے یہ قرضے بڑھتے رہے اور بااثر مقروض ڈیفالٹر ہوتے رہے پارلیمنٹ میں الیکشن جیت کر پہنچتے رہے ملک اور اس کی معیشت کا ستیاناس ہوتا رہا یہ صورتحال اتنی سنگین ہے کہ سندھ کے وڈیرے پنجاب کے چودھری بلوچستان کے نواب اور سردار اور سرحد کے خان سب اس کھیل میں ملوث ہیں۔

حکومت کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ڈیفالٹر کو انتخابات میں حصہ لینے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ معراج خالد کی کیئر ٹیکر حکومت نے وہ قانون تبدیل کر دیا جس کے تحت ڈیفالٹر کو انتخابی عمل سے روکنے کی تجویز تھی اس پر وزیر قانون احتجاجاً مستعفی ہو گئے تھے اور قوم کی طرف سے کوئی ردعمل بھی نہیں ہوا تھا۔

مسئلہ تو یہ ہے کہ کرپشن کی مجرم بے نظیر بھٹو ہوں یا نواز شریف دونوں اپنے حامیوں کو کارکنوں کو جیالوں کو قرضے دے کر نوازنے کی پالیسی پر بے دریغ اور میرٹ کے بغیر عمل کرتے ہیں بدقسمتی سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ۲۲۵ بلین روپے کے قرضوں میں سے ۱۲۵ بلین روپے تین سو بڑی مچھلیوں پر واجب الادا ہیں۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت میں عام تاثر یہ تھا کہ جیالوں کو بے دریغ نوازا گیا ہے قرضے لٹائے گئے ہیں جو سوالی قرضہ کا سوال لے کر بلاول ہاؤس پہنچ جاتا تھا کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا نواز شریف کی حکومت ۱۹۹۷ء میں آئی تو عام پاکستان یہ سمجھ رہا تھا کہ وزیر اعظم نواز شریف قوم کی لوٹی ہوئی ایک ایک پائی واپس لائیں گے خزانہ بھر جائے گا یہ امید غلط تھی ۱۹۹۷ء کے انتخابات کے وقت بینکوں کے قرضے ۱۴۰ بلین روپے کے تھے جن میں حکومت کی نصف معیاد کے اندر ۸۵ بلین روپے کا اضافہ ہوا ہے حکومت نے بڑے زور

وشور سے قرضوں کی واپسی کی منصوبہ بندی کی نادہندگان کو مختلف ترغیبات دی گئیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے حکومت نے دھمکیاں دیں کہ نادہندگان کے نام فہرست میں آجائیں گے نادہندگان نے ان دھمکیوں کو بالکل اہمیت نہیں دی اور قرضوں کی واپسی سے انکار کرتے رہے مسئلہ خود حکومت کے ساتھ یہ ہے کہ وہ قومی معیشت کو نقصان پہنچانے والے زہریلے سانپوں کو تحفظ دینے پر مجبور ہے ملک کی آئینی قانونی اور عوامی طور پر سب سے طاقتور حکومت اسٹیٹ بینک کے رولز کے آگے بے بس ہے جن کے تحت معزز کھاتیداروں کے اکاؤنٹس کو تحفظ حاصل ہے یہ وہی معززین ہیں جنہوں نے فارن کرنسی اکاؤنٹس پر پابندی کے وقت بلین ڈالر نکلوائے اور معیشت کا ستیاناس کر دیا یہ قومی مجرم کس تحفظ کے مستحق ہیں؟ حکومت اپنی نمائشی کوششوں کے باوجود ڈیفالٹرز سے بارہ بلین روپے سے زائد وصول کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اسی طرح کرپٹ بینک افسر کو نہ گرفتار کیا گیا نہ جیل میں ڈالا گیا جو قوائد وضوابط اور قوانین کو نظر انداز کر کے قرضے جاری کرنے اور معاف کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس سے بینک افسروں کو مستقبل میں کرپشن کی کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔

قانونی طور پر ڈیفالٹرز کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ خواہ اس نے کتنی بڑی رقم قرض لی ہو کتنے عرصے سے اس قرضہ کی واپسی سے انکار کر دیا ہو حکام کو چکمہ دے دیا ہو قانون اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ جب اقتصادی ماہرین کا دباؤ بڑھتا ہے اخباروں میں بینکنگ کورٹس کے اشتہارات کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا ہے۔ بینکرز شکایت کرتے ہیں کہ ڈیفالٹرز کی لسٹ میں وفاقی اور صوبائی وزراء شامل ہیں ایسے لوگ ملک کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں جو اپنے قرضے ادا کرنے کو تیار نہیں ہیں ان میں سے کچھ نے وزیر خزانہ اسحاق ڈار کی ٹیکنیکل ڈیفالٹ کی اصطلاح میں پناہ لے لی ہے ان متاثرین کا موقف یہ ہے کہ سابقہ حکومت کے دور میں ان کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا بے نظیر بھٹو کی حکومت کے مالیاتی مظالم کی بدولت ان کا ڈیفالٹ آٹومیٹک انجینئرڈ تھا اس لیے رعایت کے مستحق ہیں اسی گروہ کے دوسرے ڈیفالٹرز اپنے دفاع میں کہتے ہیں کہ وہ

ملک کے لیے سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں قربانیاں دے رہے ہیں ان کو عام ڈیفالٹرز قرار دے کر عدالت میں گھسیٹنا ظلم ہے۔

بدقسمتی سے حکمرانوں میں بے نظیر بھٹو ہوں یا نواز شریف یا معراج خالد جیسے عبوری حکمران یا فاروق لغاری جیسے سیاستدان کسی نہ کسی طور نادہندگان کو اگر وہ بااثر ہوں پورا تحفظ دیتے ہیں ان کی سیکورٹی کے لیے آوٹ آف دی وے جانے کو تیار ہوتے ہیں پھر عادی نادہندہ اگر کابینہ کا بااثر ممبر ہو تو اپنے خلاف نادہندگی کا نوٹس جاری کرنے کا سوچنے والے بینکرز کے خلاف پولیس اور ایف آئی اے تک استعمال کرتا ہے۔ احتساب بیورو کے سربراہ اور یو بی ایل کے سربراہ کا قرضہ کی وصولی پر تنازعہ پرائم منسٹر ہاؤس تک پہنچ گیا تھا ایک وزیراعظم کا چہیتا وزیر دوسرا اسپیکر قومی اسمبلی کا چہیتا بیٹا ایک بلین روپے کے قرضہ کے اس کیس میں مفاہمت جس نکتہ پر ہوئی وہ یہ ہے NO ACTION AGAINST THE DEFAULTERS پاکستان کا عام آدمی بجلی کا بل ادا نہ کرے تو بجلی سے محروم ہو جائے گا ٹیلی فون کا بل نہ دے تو ٹیلی فون سے پانی کا بل نہ دے تو پانی سے گیس کا بل نہ دے تو گیس سے محروم ہوگا فیس نہ وقت پر ادا کرے تو بچے سکول سے گھر بھیج دیئے جاتے ہیں لائسنس فیس ادا کرے تو چالان ہو جائے گا اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوگا قانون پوری قوت سے حرکت میں آئے گا کیونکہ وہ کمزور ڈیفالٹر ہے اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے سیاست کے مجرموں اور شہریوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے طاقتور ڈیفالٹر اربوں روپے کے قرضے ہضم کرسکتا ہے اس کا کوئی بال بیکا تک نہیں کرسکتا۔

نواز شریف عروج سے زوال تک

بی بی سی نے لاہور کے ایک آدمی کو دکھایا جس نے اپنی کار سے ہاتھ نکال کر کہا ''ملک بچ گیا...... نواز شریف بھاڑ میں جائے'' پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے مینڈیٹ کا یہ انجام ہوگا کسی نے سوچا تک نہ ہوگا۔ پاکستان کے عوام کے سب سے زیادہ ووٹ لینے والا بزنس مین ٹرنڈ پالیٹیشن آخر میں ذوالفقار علی بھٹو ثابت ہوا جسے وہ خود سخت ناپسند کرتا تھا۔ نواز شریف کا عروج زوال سیاست کا المیہ ہے۔ ایک ایسی گریٹ ٹریجڈی جس کے مصنف وہ خود ہیں ایوان صنعت وتجارت لاہور کی صدارت سے پاکستان کا سب سے پاورفل وزیراعظم بننے والا نواز شریف جہاں اپنے مداحوں کے لئے سنہرا خواب تھا وہاں اپنے مخالفین کے لئے جن کی تعداد کم نہ تھی بھیانک خواب تھا۔ اب یہ سارے خواب بکھرتے نظر آرہے ہیں۔ کیاڑی سے خیبر تک ان کے حامی گم سم ہیں۔ سکتہ کی کیفیت میں ہیں۔ نڈھال ہیں۔ مخالفین تالیاں بجا کر بھنگڑا ڈال کر، مٹھائی کھا کر تھک گئے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اب کیا ہوگا؟

یہی ایک بہت بڑا سوال ہے جو پاکستان کی فکر کرنے والوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ جمہوریت جب بھی ختم ہوئی پاکستان کو نقصان پہنچا ہے۔

جمہوریت کے خاتمہ پر خوشی درست نہیں ہے۔ جمہوریت کی گاڑی جب رکے گی ملک پیچھے جائے گا۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ۲۰۱۰ء کا پروگرام پیش کرنے والے ۲۰۰۰ء کی

ابتداء سے پہلے جیل پہنچ چکے ہیں۔

محاذ آرائی اور اداروں سے ٹکرانے کی روش نے نواز شریف کو اپنے محسن ادارہ سے ٹکرادیا وہ ادارہ جو ان کو سیاست میں لایا۔ مسند اقتدار پر بٹھایا اور اس کا اقتدار بچایا۔ نواز شریف نے جو کچھ کیا اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پاس بہت کچھ تھا، دولت تھی، ووٹ تھے اسٹیبلشمنٹ کی حمایت تھی۔ ان کے قرضوں کی ری شیڈولنگ عدالتوں نے کی تھی۔ ان کی پولیٹیکل اور بزنس ایمپائر کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ سیاستدان سے حکمران اور حکمران سے بادشاہ بننے کی خواہش ان کو لے ڈوبی۔ ان کی کشتی کو غرق کرنے میں ان کے مشیروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جنہوں نے عیاری اور مکاری سے کام لیا ان کو صحیح بات نہیں بتائی۔ گمراہ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں وہ ایسی غلطی کر گئے جس کی گنجائش نہیں تھی ٹائر میں گنجائش سے زیادہ ہوا بھر دی جائے تو ٹائر پھٹ جاتا ہے ان کے ساتھ یہی ہوا۔ آن واحد میں ہوا۔ انکے پاس تو اتنا وقت بھی نہ تھا کہ ہاٹ لائن پر کسی سے رابطہ کر لیتے۔ سبھی ہکا بکا رہ گئے۔ ان فوجیوں کو دیکھ کر جو سیلوٹ مارنے کی بجائے ان کو ساتھ لے جانے آئے تھے۔ نواز شریف نے اپنے ساتھ، شریف خاندان کیساتھ اور پاکستان کے عوام کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ ان کے مخالفین کہتے ہیں ان کا کھیل اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ حامیوں کو امید ہے کہ میاں صاحب مرد بحران ہیں اس بحران سے نکل گئے تو تاریخ بنا دیں گے۔

تاریخ بڑی بے رحم ہے۔ بھٹو کو پھانسی پر لاڑکانہ میں ایک چڑیا تک نہیں مری نواز شریف کی برطرفی پر لاہور میں ایک ٹائر تک نہیں جلا۔ محاسبہ کے پہیہ کا رخ اب لاڑکانہ نہیں لاہور ہے۔ یہاں اب نعروں کی گونج نہیں ہے سناٹا ہے۔ ویرانی ہے۔ خاموشی ہے۔ حسین نواز کے وہی مطالبات بی بی سی نشر کر رہا ہے۔ جو کبھی مرتضی بھٹو کے جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں نشر کئے جاتے تھے۔ بھٹو کی پارٹی اس آزمائش سے نکل گئی تھی۔ نواز شریف کی پارٹی کا نکلنا مشکل ہے حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو برائے نام بھٹو کے ساتھ تھے۔ اعجاز الحق تو یہ زحمت تک گوارا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ نواز شریف نے مسلم لیگ حکومت کو اپنے ملازموں

کے حوالے کر دیا۔ ان کی حکومت دراصل نوکروں کی حکومت تھی۔ نوکر وفاداری کا پابند نہیں ہوتا دوست پابند ہوتا ہے۔ آثار یہی ہیں کہ ۱۲ اکتوبر کو انقلاب لانے والی حکومت کو اتنے وعدہ معاف گواہ مل جائیں گے کہ اس کے لئے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ بھٹو کا حشر خراب کرنے میں مسعود محمود کی گواہی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اب رانا مقبول یہ کام کرنے کو بخوشی تیار ہیں خود حکام ان کے تعاون پر حیران ہیں۔ پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے والا وزیر اعظم اتنا بے بس ہوگا ان کے مخالفین تک نے سوچا نہ ہوگا۔

بدقسمتی سے برطرف وزیر اعظم کی سیاست محسن کشی پر مبنی رہی۔ پہلے غلام اسحاق خان ان کو لے آئے تو ان کے ساتھ تنازعہ کھڑا کر دیا۔ بے نظیر کے گو بابا گو کے نعرہ پر بھروسہ کر بیٹھے۔ آخر میں دونوں گئے۔ جنرل آصف نواز سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کر لی۔ جس کے نتیجہ میں جنرل عبدالوحید کاکڑ آئے جنہوں نے گھر بھیج دیا۔ جنرل اسلم بیگ نے آئی جے آئی بنانے میں مدد کی جس کے باعث پہلی بار حکومت میں آئے تھے۔ صدر فاروق لغاری اپنی بہن بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ہٹا کر نواز شریف کو لائے تاریخ کا سب سے بڑا اور بھاری مینڈیٹ ملا تو اقتدار سنبھالنے کے بعد اچانک فاروق لغاری کے پر کاٹ دیئے۔ عدلیہ سے محاذ آرائی میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ سے ٹکرا گئے۔ سپریم کورٹ میں گروپنگ کرادی۔ عدلیہ رام کر لی گئی۔ سجاد علی شاہ گھر بھیج دیئے گئے۔ یہی حکمت عملی فوج کے معاملہ میں مہنگی پڑی۔ فوج نے گروپنگ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اپنے چیف کے ساتھ متحد رہی۔ اس وقت زیر حراست نواز شریف کے لئے عدلیہ اور فوج میں جو جذبات ہیں ان کا اندازہ عام آدمی تک کر سکتا ہے انہی دونوں اداروں کا ان کو سامنا رہے گا۔ کارگل پر چڑھائی اور پسپائی سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ نواز شریف جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آرمی اسٹاف کے ساتھ ساتھ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے عہدہ پر کنفرم کر چکے ہیں۔ خود جنرل نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں اپنی ٹرم مکمل کروں گا ظاہر ہے یہ اعلان خود تو نہیں کرایا تھا آرمی چیف کو ایک ایسے لمحہ برطرف کرنا جب وہ سری لنکا کے سرکاری

دورہ پر تھے۔ ایک متنازعہ افسر کو چیف مقرر کرنا ان کی خبر پی ٹی وی سے زبردستی ٹیلی کاسٹ کرانا پھر آرمی چیف کے طیارہ کو کراچی لینڈنگ سے روکنے کا حکم جاری کرنا یہ سارے کام صرف خودکشی کے ارادہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ پاکستان کے سیاستدان یہ کام نہ کریں تو ان کی حکومتیں کس طرح برطرف ہوں۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں اپنی حکومتیں دو بار برطرف کرا چکے ہیں۔ کیا ان کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ نواز شریف ۱۹۹۷ء میں جب دوسری بار آئے تو پاکستان میں بہت سے لوگوں کو توقع تھی کہ اب مستحکم حکومت آئے گی ان کی تقدیر بدلے گی۔ بزنس مین پرائم منسٹر ہے۔ اندرون اور بیرون ملک کاروبار کو ترقی دے گا خوشحال بنائے گا روزگار کے مواقع نکلیں گے۔ بے روزگاری ختم ہوگی مہنگائی دم توڑ دے گی۔ قدم بڑھا نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس نعرہ کی گونج ہر گلی کوچہ میں تھی، نواز شریف کی پارٹی کو جتنی نشستیں ملی تھیں کوئی تصور تک نہیں کر سکے گا۔ لوگوں کو امید تھی کہ ان کی ویلفیئر کے اقدامات ہوں گے کڑا محاسبہ ہوگا۔ قرضے واپس لئے جائیں گے۔ قوم کی لوٹی ہوئی دولت واپس آئے گی۔ معیشت ٹھیک ہوگی۔ اس سے ملک مستحکم ہوگا۔ یہی نواز شریف کا مینڈیٹ تھا۔ لوگوں نے ان کو اپنی بہتری کے لئے ووٹ دیئے تھے۔ کشکول توڑنے کے لئے ووٹ دیئے تھے یکطرفہ احتساب عدلیہ سے محاذ آرائی پارلیمنٹ کو ربڑ اسٹیمپ بنانے اور کابینہ کو نوکر سمجھنے کے لئے ووٹ نہیں دیئے تھے۔ یہ کیسی جمہوریت تھی کہ جس میں کسی کو اختلاف کی جرات نہ تھی۔ جو اسٹینڈ لیتا نواز شریف اس کے بارے میں اپنے قانونی مشیروں سے یہ معلوم کرتے کہ کیا اسے نکالا جا سکتا ہے۔ سجاد علی شاہ، فاروق لغاری، جہانگیر کرامت اسی طرح گئے۔ شخصی آمریت ملک پر قائم ہو چکی تھی۔ قوم سسک رہی تھی نواز شریف اور ان کے ساتھی کرکٹ میچ کھیل رہے تھے۔ سری پائے کھا رہے تھے برگر اور چکن فرائی اڑا رہے تھے۔ برطرف وزیراعظم کے میڈیا کے آدمیوں نے ایسا تاثر دیا کہ جس طرح بل کلنٹن برگر کھانے کے مکڈونلڈ جاتا ہے۔ آپ جائیں اچھی اسٹوری بنے گی۔

لوگ یہ سمجھ نہیں پائے کہ جس وزیر اعظم نے امریکی دباؤ کو نظر انداز کر کے ایٹمی دھماکہ کیا بھارت کو منہ توڑ جواب دیا۔ اس طرح واشنگٹن جا کر سرینڈر کر دے گا۔ اس پر نواز شریف کے روائتی حامی تک تڑپ گئے جنہوں نے ان کی غیر مشروط حمایت کی جب وہ بس سے آنے والے واجپائی سے لاہور میں جھپیاں ڈال رہے تھے قوم برصغیر میں بہتر مستقبل کی امید میں ان کے ساتھ تھی۔ پھر جب کارگل کا راز کھلا قوم نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر جب وہ اچانک امریکہ گئے اور کارگل سے واپسی کا ذلت آمیز اعلان کیا قوم ان کے ساتھ نہیں تھی۔

اپنی حکومت برطرفی سے قبل نواز شریف متحدہ عرب امارات کے دورہ پر گئے۔ ایک روز کا یہ دورہ خیر سگالی کا دورہ قرار دیا گیا۔ مگر درحقیقت برطرف وزیر اعظم آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین بٹ مشاہد حسین اور نذیر ناجی کو لے کر اس دورہ میں صلاح مشورے کے لئے گئے۔ مقصد چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف کی برطرفی اور ضیاء الدین کی تقرری کی رہ ہموار کرنا تھا۔ کولمبو سے پی کے ۸۰۵ جونہی اڑی جنرل پرویز مشرف کی برطرفی کا اعلان کر دیا گیا۔ کولمبو سے کراچی تک ۲۰۰ منٹ کی فلائٹ تھی مگر روالپنڈی کور کی ۱۱۱ بریگیڈ نے سارا کام خراب کر دیا۔ نواز شریف کے مقرر کردہ چیف کو کمانڈ سونپی گئی۔ فوج کا طریق کار سیاست دانوں کی طرح نہیں ہے کمان باقاعدہ سبکدوش چیف نئے چیف کو ہینڈ اوور کرتا ہے۔ اس کے لئے جی ایچ کیو میں تقریب ہوتی ہے۔ سوچے سمجھے بغیر عجلت میں فیصلے کرنے والے نواز شریف نے اپنے سیاسی کیریئر کی سب سے بڑی غلطی کر دی تھی بازار سے خریدے گئے آرمی بیج لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین بٹ کے کاندھوں پر لگاتے ہوئے انہوں نے دیکھا سامنے فوجی آرہے ہیں۔ فوج کے مضبوط کاندھوں پر سیاست میں آنے والا پاکستان کا سب سے طاقتور حکمران کسی مزاحمت کے بغیر فوجیوں کے ساتھ جا رہا تھا جنرلوں کی رات شروع ہو چکی تھی۔

تخت سے تختے تک
بھٹو اور نواز شریف کے انجام کی کہانی

پاکستان کا ایک اور منتخب وزیر اعظم ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ قتل کی صدائے بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ میاں نواز شریف تاریخ اور عوام کے سامنے ایک مقدمے کا کردار بن کر کھڑے نظر آتے ہیں۔ بھٹو ایک عوامی لیڈر تھے انہوں نے عوامی طاقت اور ذہانت کے بل بوتے پر حکومت کی مگر ان کا انجام دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان کی ذہانت ان کے کام نہ آسکی۔ نواز شریف کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

ایک ایف آئی آر نواب احمد خان کے بیٹے احمد رضا قصوری نے بھٹو دور میں کٹوائی تھی۔ ان کے والد کو بے دردی سے فائرنگ کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ احمد رضا قصوری پولیس اسٹیشن پہنچے پولیس نے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں اس وقت کے طاقتور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بڑے ملزم کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ پولیس نے احمد رضا قصوری کا بیان ایف آئی آر کی حیثیت میں رکھ لیا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کا تختہ الٹا تو یہ بیان ایف آئی آر کی شکل میں اوپن ہو گیا۔ اس ایف آئی آر نے بھٹو کی سیاست اور زندگی کا باب بند کر دیا۔ پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم کو سیاسی مخالف کے قتل کا حکم دینے کی پاداش میں سزائے موت دے دی گئی۔ دنیا نے آسمان سر پر اٹھا لیا مگر بھٹو کی جاں بخشی نہ ہو سکی۔ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کو ان کے آخری

دیدار کا موقعہ نہ مل سکا۔ دونوں اس جہاز کو دیکھتی رہیں جو بھٹو کی میت لے کر لاڑکانہ روانہ ہوگیا تھا۔ بھٹو خاندان کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں بھٹو خاندان کے چند بزرگوں کی موجودگی میں فخر ایشیا مٹی میں مل گیا۔

جنرل ضیاء الحق کو بھٹو نے کئی افسروں کو نظر انداز کر کے ترقی دے کر چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے ''سر'' کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم جاری کردیا۔ کیماڑی سے خیبر تک سناٹا طاری تھا۔ پیپلز پارٹی کے گڑھ لیاری میں غریب عورتوں کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو پھانسی کے بعد ''پیر بادشاہ'' بن گئے۔ سینکڑوں جیالوں کو خوابوں میں نظر آنے لگے۔ سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان سے بائیں بازو کے لوگ ۴ اپریل کو گڑھی خدا بخش جا کر یہ سمجھتے تھے کہ سوشلزم کی خدمت کرلی۔ مارشل لاء کی رکاوٹوں کو عبور کر کے سیاسی کارکن فخر سے لاڑکانہ جاتے تھے جو ان کے لیے سیاسی فریضہ بن گیا تھا۔ بھٹو منوں مٹی تلے دفن ہوگیا مگر بھٹو ملک کی سیاست میں زندہ رہا۔ بے نظیر بھٹو نے جب پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم کے طور پر ایوان صدر میں حلف لیا تو ایوان صدر میں پہلی بار نعرہ لگا۔ ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے''۔ نعرہ بلند کرنے والے پیپلز پارٹی کے جیالے تھے جنہوں نے بے نظیر بھٹو سے اس نعرے کی پیشگی اجازت لے رکھی تھی۔

بے نظیر اس نعرہ ''جئے بھٹو'' سے سیاست میں اپنا پیچھے چھڑانے میں ناکام رہیں۔ یہی نعرہ ان کو اقتدار میں دو بار لایا، جیالے عرصہ تک ان کو بھٹو کی تصویر...... بے نظیر کہتے رہے۔ جواب یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بھٹو کا قرض اتار دیا گیا ہے مگر بھٹو پاکستان کی سیاست میں بہر طور زندہ ہے۔ جب معاشی بدحالی کا رونا رویا جاتا ہے۔ بھٹو کی نیشنلائزیشن کو سارے بحران کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ قتل کی بازگشت اب ایک بار پھر سنائی دے رہی ہے۔ کم و بیش وہی باتیں ہو رہی ہیں جو بھٹو کیس کے دوران ہوئی تھیں۔ حکمران کہہ رہے ہیں کہ

ہمارا مقصد ذاتی انتقام لینا نہیں ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے سربراہ کے دفاع کے لیے آخر دم تک قانونی جنگ کا اعلان کیا ہے۔ پاکستان کی متلاطم سیاسی تاریخ میں ایک اور پر آشوب دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ کراچی میں ایئرپورٹ تھانہ اور ملیر میں انسداد دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ بھٹو کے بعد ایک اور وزیر اعظم عدالت کے کٹہرہ میں کھڑے ہیں۔ اس بار کیس میں فرق ہے۔ بھٹو کا مقدمہ عام سیشن کورٹ سے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ تک گیا اس زمانے میں مارشل لاء تھا مگر قانون کے تقاضے پورے کیے گئے۔ نواز شریف کا کیس انسداد دہشت گردی کی عدالت میں آچکا ہے۔ یہ عدالتیں برطرف وزیر اعظم نے اپنے مخالفین کے اعتراض کے باوجود قائم کی تھیں۔ جب اقتدار میں آدمی ایسے فیصلے کرتا ہے اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ جو پھندا اپنے مخالفین کے لیے بنا رہا ہے خود اس کی گردن اس میں پھنس سکتی ہے۔ حکمران اور سیاستدان تاریخ سے سبق لینا سیکھ لیں تو ان کی حکومتیں کیوں ختم ہوں؟ ایوان اقتدار سے قید تنہائی میں کیوں جائیں؟ ان کا خاندان آن واحد میں وی وی آئی پی سے عام بن جاتا ہے بلکہ عام لوگوں کی آزادی دیکھ کر وہ ان پر رشک کرتے ہیں۔

نواز شریف کے خلاف ایف آئی آر ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے ۲۸ روز بعد کاٹی گئی ہے ۱۲ر اکتوبر کے واقعہ کی ایف آئی آر ۱۰ر نومبر کو درج کی گئی جس میں نواز شریف، غوث علی شاہ (مشیر سندھ) شاہد خاقان عباسی (چیئرمین پی آئی اے) امین اللہ چودھری (ڈائریکٹر جنرل سول ایوی ایشن اتھارٹی) رانا مقبول (آئی جی سندھ) کو پی آئی اے کے طیارہ کے اغواء کی مجرمانہ سازش کا ملزم قرار دیا گیا۔

ہیڈکوارٹرز فائیو کور کے لیفٹیننٹ کرنل عتیق الزماں کیانی کی تحریری شکایت ایف آئی آر نمبر ۹۹/ ۲۰۱ پر تبدیل کر دی گئی ہے۔ ملزمان کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعات ۴۰۲ بی ۳۶۵، اور ۳۴، دفعہ ۳۲۴ قصاص اور دیت لا انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفعہ ۷ کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ مدعی کے مطابق کولمبو سے کراچی آنے والی پرواز پی کے

۸۰۵ کو جس میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف سمیت ۲۰۰ مسافر سوار تھے کراچی میں لینڈنگ کی اجازت نہیں دی گئی۔ طیارہ میں صرف سات منٹ کا ایندھن رہ گیا تھا۔ رن وے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے لائٹس آف کر دی گئیں۔ حکام نے طیارہ کو نواب شاہ لے جانے کا حکم دیا۔ طیارہ اگر اتر نہ پاتا تو کریش ہو جاتا جس کے نتیجہ میں آرمی چیف سمیت سارے مسافر ہلاک ہو سکتے تھے۔

مقدمہ کی دفعات ۴۰۲ بی ہائی جیکنگ کی سزا ہے۔ کوئی شخص جو ہائی جیکنگ کرتا ہے یا ہائی جیکنگ کی سازش کرتا ہے یا کوشش کرتا یا ہائی جیکنگ کی کارروائی میں مدد کرتا ہے اسے سزائے موت یا عمر قید دی جائے گی۔ اس کی جائیداد ضبط کی جا سکتی ہے اور جرمانہ کیا جاسکتا ہے۔

دفعہ ۳۶۵ا اغواء یا کسی شخص کا خفیہ طور پر اغواء کی نیت اور حبس بے جا میں رکھنا وہ شخص جو کسی کو اغواء کرتا ہے تا کہ اسے حبس بے جا میں رکھے اسے سات سال کی سزا دی جاسکتی ہے اور جرمانہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ دفعہ ۱۲۰ بی سازش مجرمانہ کوئی شخص کسی ایسے جرم کے ارتکاب کی سازش مجرمانہ کا فریق ہو جس کی سزائے موت یا عمر قید یا دو سال یا زائد ہو اسے وہی سزا دی جائے گی جو سازش کے ارتکاب کی صورت میں اس کا مستوجب ہوتا۔

دفعہ ۳۴...... کسی اقدام میں متعدد افراد کی یکساں ارادہ کے ساتھ شمولیت اگر کسی بھی مجرمانہ فعل کو بہت سے افراد مل کر اپنے مشترکہ عزائم کی تکمیل کے لیے انجام دیں تو اس عمل میں شریک ہر شخص اس طرح اس میں شرکت کا مستوجب ہوگا جیسے وہ تنہا یہ جرم کرے۔

دفعہ ۳۲۴...... اقدام قتل عمد ہے کوئی شخص ایسا اقدام کرے اور اس ارادے اور حالات میں کہ اس کا اقدام قتل پر منتج ہو۔ اس شخص کو دس سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس پر جرمانہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسکے قتل کے نتیجہ میں اگر کوئی شخص زخمی ہو جائے تو زخم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا دی جائے گی۔ بشرطیکہ اس زخم کا قصاص ہو تو مجرم کو اس کا

قصاص دینا ہوگا۔ اور اسے سات سال کی سزا دی جا سکتی ہے۔

احمد رضا قصوری کی ایف آئی آر کی طرح لیفٹیننٹ کرنل عتیق الزماں کیانی کی ایف آئی آر نے قانونی حلقوں میں نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ بعض قانون دان سوال کر رہے ہیں کہ ایف آئی آر واردات کے ۲۸ روز بعد کیوں درج کرائی گئی اس کے استغاثہ کا کیس کمزور ہوا ہے۔ دوسرے وکلاء یہ دلائل پیش کر رہے ہیں کہ اس کیس میں شہادتیں بہت مضبوط ہیں۔ اہم حکام وعدہ معاف گواہ بن گئے ہیں۔ لیکن نواز شریف کے فری اینڈ فیئر ٹرائل کا مطالبہ ہو رہا ہے۔

مسلم لیگ کے لیڈر راجہ ظفر الحق نے کہا ہے کہ نواز شریف کے منصفانہ ٹرائل کی توقع نہیں ہے وزیر داخلہ معین الدین حیدر نے اعلان کیا ہے کہ نواز شریف کو اپیل کا پورا موقعہ دیا جائے گا۔

شریف فیملی کو معزول وزیر اعظم کی سلامتی کی فکر ہے۔ شریف فیملی کی دنیا بدل گئی ہے۔ بھٹو خاندان کے بعد شریف خاندان پاکستان کی سیاسی تاریخ میں نمایاں ہوا تھا۔ اقتدار ملا شہرت ملی عزت ملی مگر تاریخ کا پہیہ ایک بار پھر بے رحمی سے گھوم چکا ہے۔ دونوں خاندانوں کے ایک بات فراموش کر دی دونوں کی طاقت اور حکومت کے باوجود پاکستان میں سب سے زیادہ عرصہ ایک ادارہ برسر اقتدار رہا جو فوج ہے۔ یہ پاکستان کی سیاست کا ایک انداز ہے کبھی ظالم، مظلوم اور کبھی مظلوم ظالم بن جاتا ہے۔ پاور گیم کسی کو اقتدار کی کرسی پر کسی کو کٹہرہ میں پہنچا دیتی ہے یہی پاور پالیٹکس کا کھیل ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو اور نواز شریف آخر میں دونوں اناڑی اور بے بس ثابت ہوئے ہیں۔

جیل کی آزمائش

پاکستان میں جیل جائے بغیر سیاستدان کو پختہ ہونے کی سند نہیں ملتی۔ بمشکل ہی سے کوئی سیاستدان ایسا ہوگا جو جیل نہ گیا ہو۔ صنعت وتجارت کے راستہ سے سیاست میں آنے والا شریف خاندان جیل میں ہے۔

معزول وزیراعظم نواز شریف کے لیے یہ پہلا تجربہ ہے ان کے بھائی شہباز شریف بےنظیر بھٹو کی حکومت میں جیل جاچکے ہیں والد میاں شریف کو ایف آئی اے نے کچھ وقت کے لیے نظر بند کیا پھر باوردی مداخلت پر رہا کردیا گیا۔ یہ نظر بندی بےنظیر بھٹو کو بہت مہنگی پڑی تھی۔ اس وقت پاکستان میں بےنظیر بھٹو کی حکومت نہیں ہے مگر شریف فیملی کے بڑے مرد جیل میں بند ہیں۔ نواز شریف کو لانڈھی جیل میں رکھا گیا ہے۔ اسی جیل میں بےنظیر بھٹو آصف علی زرداری، بیگم نصرت بھٹو رہ چکے ہیں۔ نواز شریف نے جیل میں اے کلاس طلب کی ان کی درخواست میں کہا گیا کہ درخواست گزار کا طرز زندگی اعلیٰ رہا ہے وہ اے کلاس کا مستحق ہے۔

سیاسی کارکن اپنے لیڈر کے جیل جانے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ جیل میں ٹارچر کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اصل ٹارچر تھانہ میں حراست اور تفتیش کے دوران ہوتا ہے۔ کراچی میں بےشمار ملزمان حراست کے دوران تشدد سے ہلاک ہوچکے ہیں۔ عام طور پر پولیس یہی کہتی ہے کہ ملزم پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ رانا مقبول جتنے عرصہ پولیس

کے آئی جی رہے کئی ملزمان اس طرح مارے گئے جن کو ''دل کے مریض'' قرار دیا گیا ہے۔

جیل میں ٹارچر الگ طرح کا ہوتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے ایک بار لانڈھی جیل میں اپنی اسیری کے بارے میں بتایا کہ ان کے لیے سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ عملہ مردوں پر مشتمل تھا جس باتھ روم کو استعمال کرتی تھی اس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کمبل کھٹملوں اور جوؤں سے بھرا ہوتا تھا۔ اس سے قیدی کی پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب تک قیدی کو گھر کے کھانے کی سہولت نہ ہو جیل کا کھانا کھانا پڑتا ہے۔ جیل کے سالن کو ''ڈیزل'' کہا جاتا ہے جو حلق سے اتارنا مشکل ہوتا ہے۔ دال پتھر نکال کر پکانے کا رواج نہیں ہے۔ آٹا عام طور پر غیر معیاری ہوتا ہے۔ جیل حکام اپنے دفاع میں کہتے ہیں اگر گھر جیسی سہولتیں قیدی کو دے دیں تو جیل بنانے کی کیوں ضرورت پڑے۔ جیل جیل ہے گھر نہیں ہے۔ مگر آثار یہی ہیں کہ نواز شریف کا گھر جیل رہے گا۔ جب ان کو انسداد دہشت گردی کی عدالت کے حکم پر جیل بھیجا گیا تو ان سے ساری اشیاء گھڑی نقدی لے لی گئی۔ یہ اشیاء قیدی کو جیل سے نکلنے پر دی جاتی ہیں۔ نواز شریف کو جس کمرہ میں رکھا گیا ہے اس کے پنکھے کا ریگولیٹر باہر لگایا گیا ہے۔ بلب کا بٹن باہر سے آپریٹ ہوتا ہے۔ ان کو کمرہ میں اندھیرے کی سہولت نہیں ہے۔ نواز شریف انتہائی اہم ملزم ہیں ان کے معاملات میں حکام کوئی ''رسک'' نہیں لیں گے۔ ان کے کمرہ میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑی جائے گی جس سے وہ خود کو نقصان پہنچا سکتے ہوں آصف زرداری کا واقعہ حکام کے ذہنوں میں تازہ ہے جن کی خودکشی کی کوشش بین الاقوامی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

پولیس کے مطابق زرداری نے اپنی زبان کاٹ لی تھی۔ پیپلز پارٹی کے مطابق ان پر ٹارچر کر کے ان کی زبان کاٹی گئی۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب آصف زراری کو قتل کے کیس کی تفتیش کے لیے جیل سے تھانہ لایا گیا تھا۔ قیدی جیل سے تھانہ لے جایا جائے تو اس کی شامت ہوتی ہے۔ ہر عروج کے بعد زوال آتا ہے۔ نواز شریف کو کبھی نہ کبھی ہیوی مینڈیٹ کی بلندی سے نیچے آنا تھا۔ کسی کو اس پر اختلاف نہیں تھا کہ یہ کیسے ہوگا۔ پیر پگاڑو

نے خبردار کیا تھا کہ نواز شریف کا حشر بھٹو کے برابر ہوگا۔

سیاستدانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے گڑھا تیار کیا جا رہا ہے۔ مگر اس میں کود پڑتے ہیں۔ کوئی قدم ایسا ضرور اٹھاتے ہیں جو ساری بساط پلٹ دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کبھی کوئی ختم نہ ہو۔

جنرل ضیاء الحق کی مضبوط حکومت ان کا طیارہ فضا میں پھٹنے سے کریش ہوگئی تھی۔ ان کے سیاسی بیٹے نواز شریف ہر ادارہ سے لڑ گئے آخر میں اپنے محسن ادارہ سے ٹکراؤ ان کو مہنگی پڑی جس نے ان کو ایوان اقتدار سے گھر نہیں بھیجا بلکہ جیل بھیج دیا۔ نواز شریف کو کتنے عرصہ جیل میں رہنا پڑا ہوگا؟ یہ سوال بھی قبل از وقت ہے اس وقت تو ان کی زندگی کو خطرہ میں قرار دیا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف الزامات کی نوعیت بڑی سنگین ہے۔ طیارہ سازش کیس حکام نے سوچ سمجھ کر دائر کیا ہے۔

نواز شریف کے خلاف مقدمہ درج کرنے سے پہلے ملک کے بڑے آئینی دماغوں کے مشورے حاصل کیے گئے بعض اہم ملزمان کے وعدہ معاف گواہ بننے سے نواز شریف کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کیس میں سات ملزمان نواز شریف، غوث علی شاہ، شاہد خاقان عباسی، رانا مقبول، شہباز شریف، سیف الرحمٰن، سعید مہدی ہیں۔ آٹھواں ملزم امین اللہ چودھری وعدہ معاف گواہ بن گیا ہے جسے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے معافی دے دی ہے۔ یہ استغاثہ کا اسٹار وٹنس ہے۔ نواز شریف کیس بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے جس کو امریکہ اور یورپی برادری کے نمائندے واچ کر رہے ہیں۔ امریکی سفارتکار بروس نیلسن نواز کیس کی ہر سماعت پر انسداد دہشت گردی کی عدالت جاتا ہے۔ شہباز شریف نے عدالت سے پہلے روز تلخ لہجہ میں سوال کیا کہ ہمیں ۴۵ روز کیوں بند رکھا گیا، یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ ان کے وکیل صفائی نے عدالت کے جج سے معافی مانگ لی۔ نئی حکومت کے حامی کہتے ہیں کہ کیس فیئر انداز میں چل رہا ہے۔ اس سے زیادہ کیا سہولت دیں گے کہ نواز شریف کا انٹرویو سی این این پر چل چکا ہے۔

بھٹو کو ایسی کوئی سہولت نہیں تھی مگر ۱۹۷۹ء اور ۱۹۹۹ء میں بیس سال کا فرق ہے۔ اس وقت موبائل فون نہیں تھا۔ اب سی این این کا نامہ نگار جو فار ایسٹ سے آیا ہے براہِ راست موبائل پر رننگ کنٹری دیتا ہے۔ عدالت کی دیوار سے رائٹر اے پی اے ایف پی کے کیمرہ مین لحہ لحہ کی فلمیں بنا رہے ہیں، کمیونیکیشن کی دنیا بدل چکی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بعد نواز شریف پہلے وزیر اعظم تھے جنہیں حکومت ہٹتے ہی نظر بند کیا گیا۔ بھٹو کو سہالہ میں نظر بند کیا گیا جہاں جنرل ضیاء الحق ان سے ملے تھے خود بھٹو فیملی کے ذرائع کو یقین ہے کہ جنرل ضیاء کا شروع میں ان کو لٹکانے کا ارادہ نہیں تھا مگر جب بھٹو نے اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ شروع کیا ٹرین کے سفر میں پنجاب ان کے لیے امڈ آیا تو فوجی حکمران کو خود اپنی فکر لاحق ہوگئی۔ اس وقت ایک پھندا دو گردنوں کی صورتحال تھی کیا اس وقت وہی صورتحال ہے کیا نواز شریف کی گردن خطرہ میں ہے؟ جب یہ سوال بھٹو کو پھانسی دینے والے جنرل ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق سے کیا گیا تو انہوں نے آئس کریم کا ٹکڑا حلق سے اتارتے ہوئے کہا ''میرے خیال میں نواز شریف کی زندگی کو خطرہ نہیں ہے پھانسی نہیں ہوگی۔ سزا کا دارومدار شہادتوں پر ہے'' مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر کے ریمارکس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ نواز شریف طیارہ کیس میں بری کسی قیمت پر نہیں ہوں گے۔

مسلم لیگ کے قانونی ماہرین کا اصرار ہے کہ طیارہ کیس کمزور ہے ناک آؤٹ ٹیکنیکل بنیادوں پر ہوجائے گا۔ ایف آئی آر تاخیر سے درج کرائی گئی۔ اگر ہائی جیکنگ ہوئی ہے تو کسی براہ راست متاثر فرد طیارہ کے کپتان کسی مسافر کی طرف سے کیوں نہیں درج کرائی گئی۔ اس طرح مسلم لیگ کے وکلاء فوج کے کنٹرول سنبھالنے اور طیارہ کی لینڈنگ کے وقت میں فرق کو جواز بنا کر کہتے ہیں کہ طیارہ جب بحیرہ عرب میں داخل ہوا۔ فوج آ گئی تھی۔ استغاثہ کے ماہرین کہتے ہیں شریف برادران نے یہ کیوں کہا کہ طیارہ کو اترنے کا نواز شریف نے حکم دیا اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا لینڈنگ میں رکاوٹ تھی۔ یہ سارے نکات کیس کی باقاعدہ سماعت کے دوران اٹھائے جائیں گے۔ بہرحال یہ کیس ایک وزیر اعظم کو

کالی کوٹھڑی تک پہنچا سکتا ہے۔

جب آدمی اقتدار سے اترتا ہے تو اس کی خواہشیں کتنی معمولی سی رہ جاتی ہیں۔ صاف پانی مل جائے رات کو پنکھے کی رفتار کم ہو جائے۔ جب آزاد ہو تو ان سہولتوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ لانڈھی جیل اور سنٹرل جیل کے سینکڑوں قیدیوں کو یہ سہولتیں حاصل تک نہیں ہیں۔ قیدی خواہ نواز شریف ہوں آصف زرداری عام قیدی ان کو ''حکمران'' سمجھتے ہیں۔ آصف زرداری کے آس پاس کے قیدیوں کو اچھے پھل کھانے کو مل جاتے ہیں سگریٹ کی کمی نہیں ہوتی۔ کھانے کے لیے لنگر چلتا رہتا ہے۔ غریب قیدی تو ان کے جیل سے رہا نہ ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ آصف زرداری نے سندھ کی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نواز شریف کے لیے گلدستہ اور مٹھائی بھجوائی جو حکام نے واپس کر دی۔ حاکم علی زرداری نے کہا کہ میرے بیٹے نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

لانڈھی جیل میں رہنے والی بے نظیر بھٹو ملک کی دو بار وزیراعظم اس قید کے بعد بنیں تو نواز شریف دو بار وزیراعظم بننے کے بعد لانڈھی جیل پہنچے ہیں اس جیل میں ممتاز بھٹو رہ چکے ہیں جو بے نظیر کے انکل ہیں۔ اب شہباز شریف کو جو مریم اور اسما کے انکل ہیں اسی جیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ سنٹرل جیل کی ایک بیرک میں جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں غلام مصطفیٰ جتوئی رہتے تھے جن کو کھانا پکانے کے لیے مشقتی فراہم کیا گیا تھا۔ جیل جا کر جتوئی وزیراعظم تو نہیں بن سکے مگر ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت جانے پر نگران وزیراعظم بن گئے۔ اس سے پہلے وہ سندھ کے وزیراعلیٰ تھے۔ غوث علی شاہ ان کے جانشین تھے جو ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کے بعد وزیراعلیٰ بنے اب خود غوث علی شاہ جیل میں ہیں۔ جب تک سیاست سے جیل کا کھیل جاری رہے گا یہ سیاستدان کے حوصلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ نواز شریف سخت تکلیف کے باوجود نہیں روئیں گے۔ سیف الرحمٰن معمولی تکلیف پر دھاڑیں مار کر روئیں گے۔ اتنا طاقتور آدمی جس نے نواز دور میں چودھری شجاعت کو وزیر داخلہ سے وزیر بے محکمہ بنا دیا تھا اقتدار سے محرومی پر کتنا کمزور نکلا۔ یہی سیاست کی طاقت ہے جو کبھی کمزور کو

طاقتور اور کبھی طاقتور کو کمزور بنا دیتی ہے۔

گورنر سندھ ایئر وائس مارشل عظیم داؤد پوتہ سیاستدانوں کی جیل یاترا کے بارے میں کہتے ہیں کہ مال دار جیل میں اے کلاس اور غریب باتھ روم کے پاس رہنے کا نظام بدلنا ہوگا نواز شریف پہلی بار جیل گئے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے جیل یاترا ایڈونچر نہیں ہے اور یہ جیل ان کے لیے بہترین ثابت ہوئی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہو گئے ہیں۔ ان کا چہرہ کسی خوش جواں کشمیری کی طرح لگتا ہے۔ وہ گھر کا پکا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ بیگم اور بچوں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں صرف تیچے اور چینی نہیں بھیج سکتے۔ جیل مینوئل کے مطابق انہیں سہولتیں حاصل ہیں۔

نواز شریف کے لیے جیل جیل ثابت نہیں ہو رہی بلکہ وہ اپنے پسندیدہ ماحول میں رہ رہے ہیں۔ وہ جیل کا پانی بھی نہیں پی رہے بلکہ منرل واٹر پی رہے ہیں۔ عبادت کے لیے انہیں صاف ستھرا ماحول میسر ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ آصف زرداری نے نواز شریف کو اپنی طرف سے تحفہ کے طور پر کھانا اور پھل بھجوائے تھے مگر جیل حکام نے انہیں واپس بھجوا دیا آصف زرداری نے کھانے کی سوغات بھیجتے ہوئے پیغام بھیجا کہ ہم سندھی اپنے مہمانوں کی تواضع کرنا اپنا اعزاز اور فرض سمجھتے ہیں۔ شہباز شریف اپنے بڑے بھائی کی نسبت زیادہ ہی جوشیلے واقع ہو رہے ہیں۔ انہیں جیل کے ماحول سے بہت سی شکایات ہیں۔ خاص طور پر مچھر انہیں سونے نہیں دیتے۔ عدالت میں پیشی کے دوران وہ صحافیوں کو اپنے سوجھے ہوئے ہاتھ دکھاتے رہے کہ دیکھو مچھروں نے کاٹ کاٹ کر میرا کیا حال کر دیا ہے۔

جمہوریت کے ذریعہ حکومت کرنے والے سیاستدانوں کا المیہ ہے کہ وہ جب تک جیل کاٹ کر نہیں آتے، انہیں سیاستدان ہی نہیں سمجھا جاتا حالانکہ یہ سیاست کے اصولوں کے منافی ہے۔ سیاست قانون شکنی نہیں سکھاتی بلکہ ایک آزاد ملک میں قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے سیاست انجام دینا ہی حقیقی سیاست ہے۔ مگر پاکستان کی بدقسمتی کہہ لیں کہ یہاں کے سیاستدانوں نے سیاست اور حکومت چلانے کے لیے اپنے اپنے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔

پاکستان کی سیاسی خواتین

تاریخ کا پہیہ بڑی بے رحمی سے گھوما ہے۔ بیگم کلثوم نواز نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ وہ گھریلو خاتون ہیں۔ ان کو پاکستان مسلم لیگ کا سربراہ بنانے کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ ان کی طرف سے سیاست میں آنے کا کوئی موڈ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مگر برطرف وزیراعظم کی اہلیہ نے چیف جسٹس کو خط لکھ کر اپنے شوہر نواز شریف کی سلامتی کے بارے میں اپنی تشویش سے آگاہ کیا ہے۔ شریف فیملی کے لیے یہ صورت نئی ہے۔ بھٹو فیملی کے لیے جولائی ۱۹۷۷ء میں یہ صورت نئی تھی جب جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹ دیا تھا۔ بھٹو فیملی کو اقتدار سے محرومی کا پہلی بار تجربہ ہوا۔ بیگم نصرت بھٹو جو پاکستان پیپلز پارٹی کے شعبہ خواتین کی سربراہ تھیں۔ اپنی حکومت کی برطرفی کے بعد میدان میں نہیں اتریں مگر بھٹو کو مقدمہ قتل میں قید کر دیا گیا تو ان کو چیئرپرسن مقرر کر دیا گیا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ان کو تاحیات چیئرپرسن مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدہ پر بیگم بھٹو اس وقت تک رہیں جب تک ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو نے ان کو اس عہدہ سے نہ ہٹایا۔ جس پر خود بیگم نصرت بھٹو نے سخت احتجاج کیا تھا۔ یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی اس طرح برطرفی سے قبل جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف جمہوری تحریک کی قیادت کی۔ جس سے عوام اور سیاسی کارکنوں کی نظروں میں ان کے احترام میں اضافہ ہوا۔ بیگم نصرت بھٹو اس دوران سخت بیماری سے دوچار رہیں، ان کو پھیپھڑوں کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

جنرل ضیاء الحق انکو علاج کے لیے جانے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔ عالمی دباؤ کی بدولت جنرل ضیاء کو مجبور ہونا پڑا۔ کراچی سے ہزاروں کارکنوں نے بیگم بھٹو کو رخصت کیا۔ جو جمہوریت کے حامیوں کے لیے امید کی کرن بن گئی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو جو پاکستان میں خاموش تھیں لندن پہنچ کر کہا ''دنیا میں جنرل ضیاء الحق سے بڑا کوئی جھوٹا نہیں ہے''۔ ضیاء آمریت کے دن گزرتے گئے۔ جب ان کو غیر جماعتی انتخابات کرانے پڑے تو محمد خان جونیجو ملک کے وزیر اعظم بنے۔ محمد خان جونیجو کا شریف آدمی کا امیج ان کی حکومت ختم ہونے تک برقرار رہا۔ جونیجو اپنی پردہ دار اہلیہ کو کبھی منظر عام پر نہیں لائے۔ انہوں نے سیاست اور خاندان کو الگ رکھا مگر ان کی حکومت میں ان کے صاحب زادے اسد جونیجو اور حکومت جانے کے بعد ان کی بیٹی کنیز فضہ جونیجو سیاست میں آ گئے۔ جنرل ضیاء الحق جونیجو حکومت کی برطرفی کے ۹۰ روز کے اندر جب طیارہ کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے تو اس سے جمہوریت کی راہ میں آخری رکاوٹ دور ہو گئی۔

انتخابات ہوئے جس کے نتیجہ میں بھٹو کی بیٹی بے نظیر ملک کی وزیر اعظم بن گئیں۔ بھٹو کا خواب پورا ہو گیا۔ بیگم نصرت بھٹو کو کابینہ میں سینئر وزیر کا عہدہ دیا گیا۔ یوں ذوالفقار علی بھٹو کا قرض اتار دیا گیا۔ فوج جس کے سربراہ نے بھٹو کی پھانسی کا حکم دیا تھا۔ پاکستان کے عوام کی نظروں میں اپنا وقار بحال کر لیا۔ فوج ملک میں ایک نیوٹرل فریق کی حیثیت سے ابھری تھی۔ یہ غیر جانبداری زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی تھی۔ بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ بھٹو کے دست راست اور بے نظیر کے انکل غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ جتوئی کی وزیر اعظم بننے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ بزنس مین نواز شریف کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ شریف خاندان پہلی بار پورے ملک کے اقتدار میں آ گیا تھا۔ نواز شریف کا خاندان اسی دور میں منظر عام پر آیا۔ میاں شریف کلثوم نواز حسن نواز، حسین نواز، شہباز شریف، نصرت شہباز سے اس دور میں عوام کی واقفیت شروع ہوئی۔ جو ''ہاؤس ہولڈ'' نام بن چکے تھے۔ ان حکمرانوں نے وہی غلطیاں شروع کر دیں جو بے نظیر

حکومت نے کی تھیں۔ محاذ آرائی کی پالیسی نواز کو مہنگی پڑی۔ ان کی حکومت ختم کر دی گئی مگر عدالتی فیصلہ کے باوجود میاں صاحب دباؤ میں آ کر مستعفی ہو کر گھر چلے گئے۔

نواز شریف کے بعد پھر بے نظیر بھٹو کی حکومت آ گئی۔ میوزیکل چیئر باقاعدہ طور پر شروع ہو گئی تھی۔ نواز شریف نے بے نظیر کو موثر طور پر چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ تحریک نجات خاطر خواہ طور پر کامیاب نہیں ہوئی مگر مسلم لیگ کی خواتین جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریل کی پٹڑیوں پر لیٹ گئیں۔ بیگم کلثوم نواز اپنے شوہر کی کامیابی کی دعائیں کرتی رہیں۔ یہ دعائیں رنگ لائیں۔ نواز شریف نے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کو اتنی بڑی شکست دی کہ پاکستانیوں کی عقل حیران رہ گئی، نواز شریف کو تاریخی مینڈیٹ ملا ایسی کامیابی کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ نواز حکومت کے دور اقتدار میں ان کی فیملی نے بہت انجوائے کیا۔ غیر ملکی دوروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ شاپنگ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ فرسٹ فیملی کو نیویارک لندن، پیرس، دبئی، سنگاپور ہر جگہ شاپنگ کا شوق تھا۔ بیگم کلثوم نواز نے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی تو ان کی ہیرے کی انگوٹھی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ نواز شریف آسمانی جوڑے کو مبارک سمجھتے تھے۔ کچھ دنوں سے ان کو شاذ و نادر ہی آسمانی جوڑے میں دیکھا گیا ہے۔

بیگم کلثوم نواز اسی وقت توجہ کا مرکز بنی جب جولائی ۱۹۹۹ء کو واشنگٹن میں امریکی صدر بل کلنٹن سے نواز شریف کی ملاقات کے دوران ان کی تلاش شروع ہوئی تو پاکستان کی خاتون اول شاپنگ پر نکلی ہوئی تھیں۔ اس واقعہ کو بمشکل تین ماہ گزرے کہ اکتوبر کا مہینہ شریف فیملی کے لیے ظالم ثابت ہوا۔ نواز شریف کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ بیگم کلثوم نواز کی زندگی کا ایک کٹھن سفر شروع ہو گیا ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں کی بیگمات میں جس خاتون کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں کی بیوی بیگم رعنا لیاقت علی خان تھیں۔ جو پاکستان کی بیرون ملک سفیر رہیں نہ صرف پاکستان کی سیاست میں اہم کردار کیا بلکہ سندھ جیسے اہم صوبہ میں

پرآشوب دور میں گورنر کے فرائض انجام دیئے۔ اپوا کی بانی صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات کو اب تک احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان کے ایک سابق صدر سکندر مرزا کی اہلیہ بیگم ناہید سکندر مرزا بھی اپنے دور میں بہت مشہور ہوئیں۔ تاہم ان کی شہرت سوشل حلقوں کی مرہون منت تھی۔ اگرچہ اسکندر مرزا کے دور میں حکومت کے حلقوں میں ان کا حکم چلتا تھا۔ سیاست میں ان کا کوئی کردار نہیں تھا۔ سیاست دانوں میں خواتین اپنے شوہر کی قید کے باعث سیاست میں وارد ہوئیں۔ ان میں بیگم نسیم ولی خان کا نام نمایاں ہے۔ بیگم نسیم ولی نے بھٹو دور میں اپنے شوہر خان عبدالولی خان کی اسیری کے بعد سیاست اختیار کی اور ۱۹۷۷ء میں پی این اے کی تحریک کے دوران ایک نمایاں لیڈر کی حیثیت سے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو منوایا۔ اب وہ اپنے صوبہ اور ملک کی سیاست میں فعال ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو کی طرح غنویٰ بھٹو کو حادثاتی طور پر سیاست کی پرخار وادی میں اترنا پڑا۔ اس سے قبل جب ان کے شوہر میر مرتضیٰ بھٹو زندہ تھے تو غنویٰ بھٹو خالصتاً گھریلو خاتون کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اپنے شوہر اور بچوں میں خوش تھیں لیکن ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کے سانحہ کلفٹن نے صرف شوہر ہی نہیں چھینا بلکہ انہیں اپنے بچوں کی معصوم خوشیوں سے نکال کر پاکستان کی سیاست کے بکھیڑوں میں الجھا دیا۔ آج وہ اپنے شوہر مرتضیٰ بھٹو کی پیپلز پارٹی کے پرچم تلے پاکستان کی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

پاکستان کی خواتین میں سے کچھ پر حالات نے سیاست کو مسلط کر دیا کچھ خود اپنی خواہش پر اقتدار کے ایوانوں تک رسائی کے لیے تگ و دو میں لگی رہیں۔

آج حالات جس نہج پر ہیں اس میں فی الحال بیگم کلثوم نواز شریف کے کردار کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔

مادر ملت فاطمہ جناح کو بھی حالات نے سیاست کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بابائے قوم کی وفات کے بعد قیادت کا خلا پیدا ہو گیا تھا جبکہ ایوب دور میں جمہوری جدوجہد کی روایات کا آغاز ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح کی قیادت میں ملک میں جمہوری اصلاحات اور

نظام کی بحالی کے لیے تحریک شروع ہوئی۔ مادر ملت سیاست سے گریزاں تھیں مگر ملک کی سرکردہ شخصیات نے ان کے پاؤں چھو کر انہیں مارشل لاء حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے پر مجبور کیا تو وہ اپنے بھائی کے ایک ادھورے مشن کو مکمل کرنے کے لیے میدان سیاست میں آنے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر دھاندلی کی سیاست نے مادر ملت کو شکست سے دوچار کر دیا جس کے بعد انہوں نے خود کو سیاست سے الگ تھلگ کر لیا البتہ سماجی سرگرمیوں میں تادم آخر شرکت کرتی رہیں۔

آداب سیاست بڑی چیز ہوتے ہیں۔ یہ کسی سیاستدان کی پذیرائی اور مقبولیت کو ٹھوس بناتے ہیں۔ سیاست میں نئی وارد ہونے والی خواتین کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ شروع میں آداب سیاست سے ناواقف ہونے کے باعث بہت نقصان اٹھاتی ہیں اور ایسے ایسے بیانات جاری کر دیتی ہیں جو بعد ازاں ان کی شخصیت کو متنازعہ بنا دیتے ہیں۔ یہی کچھ بیگم کلثوم کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ ایک دن وہ بیان دیتی ہیں کہ وہ سیاست نہیں آئیں گی۔ مگر اسی روز کے اخبارات میں ان کا یہ بیان بھی چھپا ہوتا ہے کہ شریف خاندان کی خواتین سیاست میں سرگرم ہو جائیں گی اور اپنے مردوں کو جب تک جیل سے باہر نہیں لے آتیں، گھروں میں سکون کا سانس نہیں لیں گی۔

پچھلے دنوں ہائیکورٹ لاہور میں بیگم کلثوم نواز شریف نے اخبار نویسوں کو سوالات کرنے پر کرپٹ کہہ دیا جس سے اخباری حلقوں میں ان کی شخصیت پر کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ غنویٰ بھٹو کے ساتھ بھی شروع شروع میں یہی ہوا تھا۔ انہیں تو پاکستانی سیاست کے آداب اور سیاستدانوں کے نام بھی نہیں آتے تھے۔ مگر سیاست نے انہیں سب کچھ سکھا دیا ہے لیکن اس وقت تک وہ اپنی سیاسی ساکھ کو متاثر کر چکی تھیں اور دوران سیاست دوست نما دشمنوں کے کہنے پر اپنے ہی خاندان کی سیاستدان عورتوں کے خلاف بیان دیتی رہیں جس کے بعد انہیں بہت سے مسائل درپیش رہے۔ بے نظیر بھٹو کی یہ خوبی ہے کہ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی جانشین بیٹی کی سیاسی

تربیت خود کی تھی لہٰذا جب وہ سیاست میں آئیں تو انہیں سیاسی اونچ نیچ معلوم تھی اور وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتی رہیں۔ اس کے باوجود بے نظیر سے عورت ہونے کے ناطے کئی غلطیاں ہوئیں اور عوامی حلقوں میں انہیں زیر بحث لایا گیا۔ مرد سیاستدان نے بے نظیر کے عورت ہونے سے فائدہ اٹھا کر انہیں سیاست سے دستبردار ہونے کے لیے بے حد مجبور کیا، مگر وہ ڈٹی رہیں۔ بیگم نسیم ولی خاں پاکستانی سیاست میں واحد خاتون ہیں جنہوں نے ایک ایسے کلچر میں رہ کر سیاست کی ہے جہاں عورت کا بے پردہ ہونا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں ان کی سیاسی جدوجہد اپنے خاندان کے مردوں کے لیے بھرپور سیاست کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

سندھ کی سیاست میں اگرچہ بہت سی خواتین نے سرگرم کردار ادا کیا ہے مگر نصرت بھٹو کو اس لیے امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک ایسے وقت میں اپنے شوہر کو پھانسی سے بچانے کے لیے جدوجہد کی تھی جب زبان پر پہرے تھے۔ نصرت بھٹو نے بڑی خاموش اور دبنگ سیاست کی ہے مگر اپنے شوہر کے بعد بیٹوں کے قتل اور بیٹی کے ہاتھوں پریشانی اٹھانے کے باعث ذہنی طور پر تھک چکی ہیں اور کسی قسم کے سیاسی بیان اور سرگرمیوں سے اجتناب کر رہی ہیں۔ کلثوم نواز شریف بھی آجکل اسی ٹریک پر چل رہی ہیں جس پر کبھی نصرت بھٹو کو چلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

یورپی دنیا کو پاکستان میں خواتین کی سیاست کے بارے میں بہت سی شکایات ہیں انسانی حقوق اور حقوق نسواں کی تنظیمیں پاکستانی ماحول کو خواتین کی سیاست کے لیے سازگار نہیں سمجھتے اور اس سلسلے میں ان تنظیموں نے ایسی نمایاں خواتین کو ہر سطح پر سپورٹ بھی کیا ہے جو عالمی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ ان میں ناہید اسکندر، نصرت بھٹو، بے نظیر اور غنویٰ بھٹو ہیں جو حکمران خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ کلثوم نواز شریف اس معاملے میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ انہیں عالمی توجہ تو مل رہی ہے مگر وہ ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی ہیں۔

بیگم کلثوم نواز کی سیاست اس لیے بھی جدا ہے کہ انہیں ایک ایسے وقت میں سیاست میں آنا پڑا جب ان کے شوہر کو جیل میں اے کلاس حاصل ہوگئی۔ نواز شریف جیل میں قید تو ہیں مگر گھی کی چوریاں کھا رہے ہیں۔ ان کی والدہ اور بیٹی انہیں اپنے ہاتھوں سے روٹی کھلاتی ہیں۔ ایسے حالات اس سے قبل کسی اور سیاستدان کو پیش نہیں آئے اور نہ ہی کسی حکمران یا سیاستدان کی عورتوں کو جیل میں جانے کے لیے سہولیات دی گئیں۔ گویا بیگم کلثوم نواز شریف، مریم صفدر اور شہباز شریف کی بیگم کے لیے سیاست میں آگے بڑھنے کے لیے حالات سازگار رہیں۔ البتہ شریف خاندان نے کلثوم نواز کو ہی اپنی نمائندگی کا حق دے دیا ہے کہ وہ اس خاندان کے مردوں کو بچانے کے لیے کچھ کریں۔

عورتیں بڑے حساس دل کی مالک ہوتی ہیں مگر سیاست کے میدان میں ان کی نرمی انہیں اپنے لیے مشکلات پیدا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس لیے ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں، بااصول سیاست کو مدنظر رکھ کر کریں اور دل کے بہلاوے میں آئے بغیر صرف دماغ کے فیصلوں پر اعتبار کریں۔ کلثوم نواز اپنے شوہر کی طرح آہنی عزائم کی مالک ہیں اور ان سے یہی توقع کی جا رہی ہے کہ وہ دوران سیاست اپنے مزاج کو قابو میں رکھیں گی اور ایک زیر تربیت خاتون سیاستدان کی حیثیت میں کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت کرنے کا بھی ہنر سیکھ لیں گی۔

سیاستدان خواتین کو زیادہ تر جدوجہد غیر جمہوری اور مارشل لاء حکومت کے خلاف ہی کرنا پڑی مگر ایک وقت ایسا بھی آتا رہا جب جمہوریت کے خلاف بھی انہیں اپنے حقوق کی دستیابی کے لیے لڑنا پڑا۔ پاکستانی سیاست مرد سیاستدانوں کو سیاست سے توبہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے مگر ان پاکستانی سیاستدان خواتین کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے جو اپنے کاز کی حفاظت کے لیے آخری دم تک میدان میں ڈٹی رہتی ہیں۔

ممتاز انکل کی باتیں

ممتاز علی بھٹو کا قلعہ نما گھر عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے آگے واقع ہے۔ بیل بجانے پر مسلح چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ دیواروں پر پاکستان کے چاروں صوبوں کے نقشے لگے ہوئے تھے سندھ کے نقشے پر نشانات بنے ہوئے تھے۔ ممتاز علی بھٹو کو کسی دور میں ڈھیسر سندھ کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس وقت سندھ میں صحافیوں اور دانشوروں کا بڑا طبقہ ان سے ناراض ہے۔ مگر سندھی قوم پرست رہنما سرینڈر کرنے کے لیے تیار نہیں یہ ان کی نیچر میں نہیں ہے۔

☆ ''سندھ کے لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟''

O سندھ کے لوگ بہت زیادہ مایوس ہیں۔ سیاستدانوں اور لیڈروں نے ان کو مسلسل لیٹ ڈاؤن کیا ہے۔ ان کے ساتھ بہت دھوکا ہوا ہے۔ پی پی پی نے نت نئے وعدے کیے، نئے سماجی معاہدہ کا وعدہ کیا، پھر عوام کو بھلا دیا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہر پارٹی اقتدار میں آنے پر لوٹ مار کرتی ہے۔ عوام کو فراموش کر دیتی ہے، مسلم لیگ نے یہی کیا ہے۔ اب عوام کو بھلا کر اپنے اقتدار کو تحفظ دینے میں مصروف ہے''۔

☆ ''آپ جہاندیدہ سیاستدان ہیں، بے نظیر اور نواز شریف میں آپ کو کیا فرق نظر آتا ہے؟''

O ''دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں اقتدار میں ہوں تو کچھ بات کرتے ہیں

اپوزیشن میں ہوں تو کچھ اور"۔

☆ "سندھی قوم پرست کہاں کھڑے ہیں؟"

O "قوم پرست سندھی عوام کے مطالبے پورے نہیں کر سکتے۔ جو دو ایک سیاستدان مخلص ہیں ان کے ہاں تجربہ ہے نہ تعلیم۔ اور نہ ہی سیاسی سوچ اور عمل ہے، وہ بے چارے اس سے آگے نہیں بڑھ سکے کہ ایجنسیوں کے تنخواہ دار اور سستے داموں بکنے والے سیاستدان ان کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ رسول بخش پلیجو ان سیاستدانوں میں سے ایک ہیں۔ وہ اسلام آباد جا کر صدر اور وزیراعظم سے ملے۔ میرے پاس آئے نگران دور میں مجھ سے نوکری مانگی۔ مجھ سے کہا مجھے منتخب کروادو۔ میں نے معذرت کرلی میں کیسے منتخب کرا سکتا ہوں۔ اب وہ سندھ کے حقوق کے علمبردار بنے ہوئے ہیں نہ ان کی کوئی پارٹی ہے نہ ان کے ساتھ لوگ ہیں، نہ ان کی کوئی سنتا ہے نہ اعتبار کرتا ہے۔ خیر سندھی اخباروں میں سرخیوں کے ذریعہ یہ لوگ زندہ ہیں۔ سندھ کے لوگ کہاں جائیں؟ صرف میری پارٹی ہے جس کے پاس پروگرام ہے نہ میں کبھی بکا ہوں نہ میرے ساتھی بکے ہیں۔ ہم نے کبھی سودے بازی نہیں کی ہے۔ سندھ نیشنل فرنٹ سندھیوں کی نمائندہ پارٹی ہے۔ میں تین چار بلیک میلروں سے گھبرانے والا نہیں ہوں۔ حکومت ایس این ایف کے کارکنوں کو ہراساں کر رہی ہے۔ پولیس گھروں میں داخل ہو کر مار پیٹ کرتی ہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اس صورتحال میں سندھیوں کی صحیح آواز کو دبایا جا رہا ہے۔ سندھ تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جو عوام کی بات کرتے ہیں ان کو کچلا جا رہا ہے جو دھوکہ باز اور غدار ہیں ان کے لیے میدان کھلا رکھا جا رہا ہے۔ لوگ پریشان اور مایوس ہیں ان کو امید کی کرن نظر نہیں آ رہی ہے"۔

☆ "سندھ کے لوگ آپ کے ساتھ ہیں تو فروری ۹۷ء کے الیکشن میں آپ کی پارٹی کو ووٹ کیوں نہیں ملے؟"

O "یہ تاثر غلط ہے کہ ہمیں ووٹ نہیں ملے۔ ہمارے ووٹوں کی تعداد کو نظر انداز نہ

کیا جائے۔ سندھ میں ہم پی پی پی کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں، فرنٹ بڑی قوت ہے۔ یہ الیکشن سے ثابت ہوگیا ہے۔ دراصل سیاست میں سارا کھیل پیسے کا ہے، سیاست بہت کرپٹ ہوگئی ہے۔ سرمائے کے بغیر نہ الیکشن لڑا جا سکتا ہے نہ جیتا جاسکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے خود پولنگ اسٹیشنوں میں جا کر اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں پیسے تقسیم کیے۔ بے نظیر پیسے سے الیکشن جیتی ہے۔ پھر الیکشن کا طریقہ کار صحیح نہیں ہے۔ ۱۹۹۳ء میں پاکستان مسلم لیگ کو سب سے زیادہ ووٹ ملے کامیاب پیپلز پارٹی قرار دی گئی۔ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ میرے خیال میں متناسب نمائندگی کا نظام ہونا چاہیے اس کے بغیر بات نہیں بنے گی''۔

☆ ''پاکستان کی سیاست سے بھٹو فیکٹر کب ختم ہوگا؟''

O ''یہ ختم نہیں ہوگا۔ کیسے ختم ہوسکتا ہے بھٹو خاندان نے ملک کی سندھ کی خدمت کی ہے۔ بھٹو خاندان ۱۹۲۷ء سے سیاست میں ہے اس وقت لیجیسلیٹیو اسمبلی میں سندھ ایک حلقہ تھا، پورے سندھ سے دو ارکان منتخب ہوئے تھے ایک سردار واحد بخش بھٹو دوسرے عبداللہ ہارون۔ ۱۹۳۵ء میں الیکشن ہوئے تو میرے والد اور عبداللہ ہارون منتخب ہوئے ہمارے خاندان کی ساکھ ہے بھٹو خاندان کا نام ہے''۔

☆ ''بے نظیر کے لیے آپ نے کہا ہے کہ بھٹو نہیں ہے؟''

O ''میں نے صحیح کہا ہے کہ بے نظیر بھٹو نہیں ہے زرداری ہے۔ بے نظیر نے بھٹو کا نام بدنام کیا ہے اگر اس کو زرداری کا نام اتنا ناپسند ہے تو اس سے شادی کیوں کی تھی۔ میں جانتا ہوں، بے نظیر کہتی ہے بھٹو کا نام بکتا ہے۔ بھٹو کے نام کو بکاؤ مال نہ سمجھا جائے۔ کسی بھٹو نے بھٹو کے نام کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا بے نظیر نے پہنچایا ہے ہر بھٹو نے بھٹو خاندان کو نیک نامی دی بے نظیر نے بدنامی دی ہے۔ میں بے نظیر کو بھٹو کا نام استعمال کرنے سے روکنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ بے نظیر کے خلاف کیس قائم کروں گا۔ برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں اپنے وکلاء سے مشورہ کر رہا ہوں''۔

☆ ''بے نظیر سے آپ کا کیا جھگڑا ہے؟''

O ''میرا کوئی ذاتی اختلاف نہیں ہے وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہے۔ بھٹو نے ہمارے ساتھ پارٹی بنائی تھی، بے نظیر سے میرے سیاسی اختلافات ہیں۔ بے نظیر بھٹو سے میری ملاقات ۱۹۹۵ء میں ہوئی، جب وہ وزیراعظم تھی میں ملا مگر کسی ایشو پر ہم آہنگی نہیں ہوسکی۔ بے نظیر کی راہ الگ ہے ہماری الگ ہے۔ بے نظیر نے سندھ کو مایوس کیا ہے، بے نظیر نے اپنے باپ کی سیاست کو فراموش کردیا۔ اس نے جنرل ضیاء کی پالیسیوں کو اپنایا، جنرل ضیاء کے جو لوگ براہ راست بھٹو کے قتل میں ملوث تھے ان کو نوازا۔ غلام اسحاق، محمود ہارون کس کے آدمی تھے۔ بھٹو کے نہیں ضیاء کے آدمی تھے''۔

☆ غنویٰ بھٹو سے آپ کی نہیں بن سکی حالانکہ آپ کو مرتضیٰ کے قریب سمجھا جاتا تھا؟''

O ''میں غنویٰ کے پاس خود گیا تھا کیونکہ مرتضیٰ میرا بڑا احترام کرتا تھا میں مرتضیٰ کے بہیمانہ قتل پر رویا ہوں۔ میں نے غنویٰ سے کہا ہمیں آپ سے کچھ لینا نہیں ہے۔ ہم اکٹھے کام کرسکتے ہیں مگر غنویٰ کو غلط فہمی تھی۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ہم غنویٰ کو بھٹو خاندان کا حصہ سمجھتے تھے، اسی لیے اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئے مگر اس کے گرد مفاد پرستوں کا ٹولہ ہے جو غنویٰ کو شروع سے اب تک غلط راستہ پر لے جارہے ہیں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ غنویٰ ایسے لوگوں کے مشورے پر عمل کرتی ہے، غنویٰ یہ نہیں سوچتی کہ مرتضیٰ سے ہمارا خون کا رشتہ ہے''۔

☆ ''غنویٰ بھٹو نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ آپ بہت **Demanding** تھے؟''

O ''میں نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی، غنویٰ کے پاس دینے کے لیے کیا تھا، وہ تو سیاست میں خالی ہاتھ تھی۔ خالی ہاتھ ہے میں نے غنویٰ کو بتادیا تھا کہ تمہاری اپنی سیٹ خطرہ میں ہے۔ تمہارے اطراف جو لوگ ہیں غلط ہیں تم کو مس گائیڈ کررہے ہیں''۔

☆ سیاسی طور پر اس وقت آپ تنہا ہیں؟''

O ''کون کہتا ہے میں اکیلا ہوں، ہمارا موثر اتحاد یو این اے ہے۔ سرائیکی پارٹی ہے افضل بنگش والے ہیں، بلوچستان پارٹی سے ہماری مفاہمت طے پا گئی ہے، ولی خان بیگم نسیم ولی خان سے، مینگل سے بات ہوگئی ہے ہم اتحاد کے قائل ہیں مگر مفاد پرستوں اور ابن الوقت لوگوں سے کبھی ہاتھ تک نہیں ملائیں گے''۔

☆ ''اب آپ چاہتے کیا ہیں، کیا ہونا چاہیے؟''

O ''میرا وہی موقف ہے جو پہلے تھا۔ وفاقی نظام ناکام ہوگیا ہے۔ ڈی سنٹرلائزیشن ہونا چاہیے، مرکزیت کا خاتمہ ہو اور لوکل باڈیز کی سطح پر اختیارات تقسیم ہوں۔ اسلام آباد کو ہمارے مستقبل کے فیصلہ کا اختیار نہیں ہے ہمیں یہ خوشی ہے کہ پنجاب براہ راست حکومت کر رہا ہے پنجاب حکومت کر رہا ہے تو ذمہ داری قبول کرے گا''۔

☆ ''ایم کیو ایم کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے۔ کیا مہاجروں کو علیحدہ قوم مانتے ہیں؟''

O ''میں سیدھی بات کرتا ہوں مہاجر بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کو احساس ہونا چاہیے کہ جب سے ایم کیو ایم بنی ہے مہاجروں کو گولی گھیراؤ جلاؤ، آپریشن کے سوا کیا ملا ہے۔ مہاجروں کا صرف نقصان ہوا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے، میں مہاجروں سے کہتا ہوں کہ ان کو سندھ میں رہنا ہے تو سندھی بن کر رہنا ہوگا۔ اسی طرح دیہی اور شہری کا فرق ختم ہوگا۔ کسی کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جب تک شہریوں کے احتجاج کو دیہاتیوں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی کسی کو کامیابی نہیں ہوگی۔ مہاجروں کو اتنے نقصانات کے باوجود سوچنا چاہیے کہ مہاجر نعرہ سے ان کو کیا ملا ان کے پاس وقت نہیں ہے''۔

☆ ''آپ بڑے بااصول سیاستدان ہیں، قوم پرست ہیں، آپ بیک ڈور سے نگران حکومت میں کیوں شامل ہوگئے، اس سے آپ کی ساکھ متاثر ہوئی ہے؟''

O ''فاروق لغاری (صدر) سے میرے پرسنل تعلقات ہیں۔ سندھ میں ان کو میری ضرورت تھی یہ اقتدار نہیں تھا۔ ایک مختصر عرصہ تھا جس میں الیکشن کروا کے اقتدار منتخب

نمائندوں کے حوالے کرنا تھا یہ پاور پاس آن کرنے والی بات تھی۔ حکومت کا خرچ کم کرنے کے لیے ۲۷ محکموں کو کم کر کے ۱۹ کر دیا چیف منسٹر ہاؤس کا بجٹ ۳ کروڑ روپے تھا اس کو ۸۵ لاکھ روپے کیا۔ چیف منسٹر ہاؤس کا ماہانہ بجٹ ۵۔۶ لاکھ روپے ماہانہ تھا کم کر کے ۳۵ ہزار روپے تک لے آیا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اگر میں چلتی ٹرین میں جس کا ڈرائیور میرا دوست تھا چڑھ گیا اور اپنے صحیح اسٹیشن پر اتر گیا تو کیا گناہ ہو گیا؟''

☆ ''آپ کا کیا خیال ہے آپ کو کب تک سیاست میں رہنا چاہیے؟''

O ''میں تو سیاست سے ریٹائر ہو گیا تھا سندھ کے لوگوں کے اصرار پر سیاست میں ہوں میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو بستر مرگ پر سیاست کرتے ہیں، ان کو چارپائی پر اٹھا کر لایا جاتا ہے۔ میں حالات خراب دیکھ رہا ہوں۔ سندھ پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پانی نہیں ہے، بجلی نہیں ہے، نوکریاں نہیں ہیں، تعلیمی اداروں میں داخلے نہیں ہیں''۔

☆ مردم شماری کے التواء پر آپ کا کیا ردعمل ہے، اس سے کیا ہوگا؟''

O ''نواز شریف حکومت میں مردم شماری کرانے کی ہمت نہیں ہے لاکھوں غیر قانونی تارکین وطن ہیں۔ سندھی کیسے مطمئن ہوں گے، ان کو ان کے صوبہ میں اقلیت بنایا جا رہا ہے اور پنجاب کو خطرہ ہے کہ سندھ کی آبادی بڑھ رہی ہے سندھ کو سیاسی اقتصادی شیئر دینا پڑے گا۔ سندھ میں سندھی غیر سندھی کا مسئلہ ہے بلوچستان میں پختون بلوچ کا مسئلہ ہے۔ کوئی پاپولر مضبوط حکومت ہوتی تو مردم شماری کرا دیتی اس حکومت میں اتنی ہمت نہیں ہے یہ کمزور حکومت ہے''۔

ممتاز بھٹو انٹرویو کے دوران سوچ میں پڑ گئے پھر سندھ کے نقشہ کی طرف دیکھ کر بولے ''مجھے افسوس ہے سیاست کا معیار بہت گر چکا ہے میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اسمبلی میں تھا۔ میں ۱۹۹۳ء میں سندھ اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا تو ایوان میں مجھے محسوس ہوا کہ میں کہاں پھنس گیا ہوں منتخب ارکان جو باتیں کر رہے تھے جس طرح گالی گلوچ کر رہے تھے۔ میرا سر شرم سے جھک رہا تھا میں خوش ہوں کہ اب کسی ایوان میں نہیں ہوں منتخب

ایو ن بے نظیر، نواز شریف کو مبارک ہوں"۔ میں نے پوچھا "مبارک کی بات چلی ہے تو کیا آپ کو نیا گھر بسانے پر مبارک باد دی جائے؟"

ممتاز بھٹو (مسکرا کر) "میرا گھر نو دس سال سے خالی تھا۔ کافی عرصہ تنہا رہا ہوں۔ اب میں نے اپنا گھر آباد کرلیا ہے۔ زینت (میڈم زینت حق) سمجھ دار خاتون ہیں۔ زندگی کا سفر اچھا گزرے گا۔ بڑھاپے میں مرد کو عورت کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ سہارا مل گیا ہے"۔ ممتاز بھٹو کے گھر سے باہر نکلا تو وہی ویرانی نظر آئی ان کے ہمسایہ کمال اظفر کے گھر کے در و دیوار بھی ویران پڑے تھے دونوں سندھ کے وزیر اعلیٰ اور گورنر تھے کبھی ہجوم میں تنہا تھے اب تنہائی میں تنہا ہیں۔

پاکستانی سیاستدانوں کے القاب

میاں (نواز شریف) اور بی بی (بینظیر بھٹو) پاکستانی کی سیاست کے دو بنیادی کردار ہیں جن کی بدولت پولیٹکس کی میوزیکل چیئر ریس جاری ہے۔ دونوں سیاستدانوں کو ان کے قریبی لوگ میاں صاحب اور بی بی صاحبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ پاکستان کے وزیراعظم اور پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ کو ابتدا ہی سے میاں صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جب وہ اپوزیشن میں تھے تب بھی ان کا یہی ٹائٹل تھا۔ ان کی سب سے بڑی مخالف بینظیر بھٹو کو بچپن میں پنکی پکارا گیا ان کو پیار سے پنکی ہی کہا جاتا ہے۔ لاڑکانہ میں ان کے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو ان کا یہی نام یاد ہے۔ المرتضیٰ لاڑکانہ سے 70 کلفٹن کے سفر تک بینظیر بھٹو کا یہی نام رہا۔ پھر وہ بینظیر بن گئیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں پاکستان پیپلز پارٹی کے وفادار رہنما بینظیر کو ''بے بی'' کہتے تھے۔ اپنی خود ساختہ جلاوطنی میں ''بے بی'' کے چاروں صوبوں میں پی پی پی کے رہنماؤں سے مستقل رابطے رہتے تھے۔ جلا وطنی سے وطن واپسی پر بینظیر بھٹو نے ''موسم خزاں میں الیکشن'' کا نعرہ ''ضیاء جاوے جاوے'' کے نعرے کے ساتھ لگایا۔ 1986ء میں بینظیر بھٹو نے پاکستان اور عالم اسلام کی پہلی وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ''محترمہ'' بن گئیں۔ سیاستدان بیوروکریٹس اور جیالے ان کو ''محترمہ'' کے لقب سے پکارتے تھے۔

''محترمہ'' کا لفظ بینظیر بھٹو نے اس وقت اس وجہ سے اپنے نام میں شامل کیا کہ

اس مرحلہ پر ''بزرگ'' نظر آنا چاہتی تھی۔ اسی دور میں ان کی طرف سے عینک کا باقاعدگی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اب بینظیر بھٹو لفظ ''محترمہ'' کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ صدر وزیر اعظم اور چیف جسٹس کے نام اپنے خطوط میں اپنا نام ''محترمہ بینظیر بھٹو'' لکھتی ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی پہلی حکومت کے خاتمہ کے بعد محترمہ کو برقرار رکھا۔ جب وہ اپوزیشن میں تھیں تب بھی نواز شریف ان کو محترمہ ہی کہتے تھے۔ محترمہ نے اپنے اولین اقتدار سے علیحدگی کے بعد اپنے ترپ کے پتے نہایت مہارت سے استعمال کئے۔ انہوں نے ''گو بابا گو'' کا نعرہ لگا کر پہلے غلام اسحاق خان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا پھر بابا اور میاں دونوں کو اسلام آباد سے رخصت کرادیا۔ اپنے دوسرے دور اقتدار میں بینظیر بھٹو بہت پاورفل سمجھی جاتی تھی۔ وہ اس دور میں بھی محترمہ رہیں۔ بینظیر بھٹو نے ''فاروق بھائی'' کو پاکستان کا صدر منتخب کرایا۔ جو 5 نومبر 1996ء کے بعد سے ''فاروق الحق'' بن چکے ہیں۔ گو صدر مملکت نجی محفلوں میں یہی کہتے ہیں کہ میں محترمہ کا بدستور احترام کرتا ہوں۔

پاکستان کے جس سیاستدان کو مستقل ''بھائی'' کا خطاب ملا وہ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین ہیں۔ الطاف حسین کو غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری تک ان سے بڑے ہونے کے باوجود الطاف بھائی کہتے رہے ہیں۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد کو ان کی سیاست کے ابتدائی سالوں میں ''الطاف بھائی'' کہا گیا وہ بچوں، جوانوں بوڑھوں سب کے الطاف بھائی تھے۔ اسی دوران کسی نے مہاجروں کے سیاسی رہنما کو مہاجروں کا روحانی رہنما بنانے کی راہ دکھادی۔ ''الطاف بھائی'' راتوں رات ''پیر صاحب'' بن چکے تھے۔ ان کی شبیہہ کر ڈیل کے پتوں اور سنگ مرمر پر نظر آنے لگی۔ یہ کیفیت زیادہ عرصہ برقرار نہ رہی۔ آپریشن کلین اپ کے دوران الطاف حسین ''بھائی'' بن گئے۔ ایم کیو ایم کے سینٹرز، ایم این اے، ایم پی اے، وزراء، ورکرز سب ان کو'' بھائی'' کہتے ہیں۔ صدر مملکت فاروق احمد خان لغاری نے آپریشن کلین اپ کے دوران ایم کیو ایم کے ایک سرکردہ رہنما سے جو اس وقت ایم کیو ایم کے ترجمان تھے ملاقات کی تو ان کی طرف سے لندن کو خاص

طور پر یہ پیغام بھجوایا گیا کہ صدر مملکت نے بات چیت کے دوران الطاف حسین کو 13 بار ''الطاف بھائی'' کہا۔ یہ ان کے ''بھائی'' ہونے کا صدارتی اعتراف تھا۔ الطاف حسین کو عارضی طور پر ''اربن پیر'' کہا گیا۔ پھر پیر صاحب پگارا کی ''رورل پیر'' کی حیثیت ہنوز برقرار ہے جن کو ان کے مرید احترام سے ''قبلہ سائیں'' کہتے ہیں۔ پیر پگارا کو ستاروں کا علم ہے جو بینظیر بھٹو، نواز شریف اور پھر بینظیر بھٹو کے اقتدار کے خاتمہ کی کامیاب پیش گوئیاں کر چکے ہیں۔ اب ان کی پیش گوئیوں کا ٹارگٹ نواز شریف ہیں جن کو وہ عرصہ تک ''بزنس مین'' کہتے تھے۔ پیر پگارا جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنا ''چھوٹا بھائی'' کہتے ہیں۔ مولانا نوارنی جن کو ان کے عقیدت مند ''حضرت'' شاہ صاحب اور نورانی میاں کہتے ہیں۔ پیر صاحب کو بڑا بھائی تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم بڑے بھائی نے جنرل ضیاء الحق کے دور میں چھوٹے بھائی کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت سے عین وقت پر انکار کر کے اس کو سبوتاژ کر دیا مگر اس سے دونوں کے سیاسی تعلقات کی گرمجوشی میں فرق نہیں آیا۔

سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان ان کے صاحبزادے خان عبدالولی خان طویل عرصہ تک پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب کو ''بڑا بھائی'' کہتے تھے۔ اور اس صوبہ کو پاکستان کے سارے مسائل کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ جب عبدالولی خان کو پاور شیئرنگ میں شریک کر لیا گیا تو ان کے سارے اختلاف ختم ہو گئے۔ غفار خان کو باچا خان کہا جاتا تھا۔ بیگم نسیم ولی خان جو پی این اے کی تحریک کے ذریعے پاکستان کی سیاست میں آئیں ''بی بی'' کہلاتی ہیں۔ ولی خان اور ان کے خاندان نے بھٹو خاندان کو معاف نہیں کیا ہے۔ جس کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ زیڈ اے بھٹو کو ان کے قریبی دوست ''زلفی'' کہتے تھے۔ جن میں سردار شیر باز مزاری شامل ہیں۔ بھٹو کو چیئرمین ان کی کابینہ کے ساتھی کہتے تھے خود زیڈ اے بھٹو ایوب خان کو ڈیڈی کے نام سے پکارتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کے خلاف بغاوت کی تو ان کا ساتھ دینے والوں میں غلام مصطفیٰ جتوئی،

ممتاز علی بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ اور غلام مصطفیٰ کھر نمایاں تھے۔ جتوئی کو ان کے بھائی غفار اور مجتبیٰ جتوئی ''بڑے بھائی صاحب'' کہتے ہیں۔ جتوئی ہاؤس کے ملازمین مصطفیٰ جتوئی کو ''بڑے جتوئی'' کہتے ہیں۔ ممتاز علی بھٹو کو پی پی پی کے پہلے دور میں ڈھیسر سند (سندھ پر دس سر قربان کرنے والا) کا لقب دیا گیا جس پر ان کو آج تک فخر ہے۔ ممتاز بھٹو کا کالا باغ ڈیم کے خلاف یہ موقف ہے کہ اگر ڈیم بنایا گیا تو اسے ٹکریں مار کر توڑ دیں گے۔ ڈھیسر سندھ کا سر کتنا مضبوط ہے یہ اندازہ اس وقت ہو سکے گا۔

بزرگ سیاستدان جی ایم سید کو بابا سائیں سندھ کا سائیں کہا جاتا تھا۔ ان کو شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔ مرحوم نے مرتے دم تک قائداعظم کو ''جناح'' کہا۔ بعض امور میں ان کی رائے اٹل تھی۔

سندھی سیاستدانوں میں عبدالحفیظ پیرزادہ کو بھٹو دور میں ''سوہنا منڈا'' کہا گیا' انہوں نے اپنے قائد کی پھانسی کے دنوں میں شادی کی۔ عبدالحفیظ پیرزادہ بھٹو کی پھانسی کے بعد سے جلاوطنی اختیار کرنے والا مرتضیٰ بھٹو کے وکیل بن گئے۔ جن کو ''میر سائیں'' کہا جاتا تھا۔ میر سائیں کے بہنوئی آصف علی زرداری پر اپنے برادر نسبتی کے قتل کی سازش کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ خود آصف علی زرداری کو ان کے ملازم ''سردار'' کہتے ہیں۔ جو پی پی کے جیالوں میں ''آصف بھائی'' کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مخالفین ان کو بینظیر کے پہلے دور میں ''مسٹر ٹین پرسینٹ'' اور دوسرے دور میں ''مسٹر تھرٹی پرسینٹ'' کہتے تھے۔

جو سیاستدان ہر دور میں ''نواب صاحب'' کہلائے پی ڈی پی کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان اور جمہوری وطن پارٹی کے نواب اکبر بگتی ہیں۔ نوابزادہ نصراللہ خان ہر حکومت کے خلاف خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ محاذ بنانے کے ماہر ہیں۔ نواب اکبر بگتی کی یہ خوبی ہے کہ اپنے جوان بیٹوں کے جنازوں کو کاندھا دینے کے باوجود اپنے بوڑھے کاندھے جھکنے نہیں دیئے ہیں۔ نواب اکبر بگتی نے ریٹائرڈ جنرل رحیم الدین سے اپنی ضد میں سالوں تک اردو نہیں بولی تھی۔ بلوچ سرداروں میں عطاء اللہ مینگل ''سردار'' غوث بخش

بزنجو "بابا" اور شیر محمد مری "جنرل شیروف" کے القاب سے پکارے جاتے تھے۔

پاکستان کے جو جنرل سیاست میں آئے قوم کی خوش قسمتی سے کامیاب نہیں ہو سکے۔ جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل اپنی پارٹیاں بنانے کے باوجود ناکام رہے۔ جنرل ٹکا خان کا بھی یہی سیاسی حشر ہوا کہ کبھی مقبول نہیں ہو سکے۔ ایئر مارشل اصغر خان کو شکایت ہے کہ قوم تحریک استقلال کا منشور اور آئین پڑھ لے تو ان کی کامیابی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ خواندگی کی موجودہ شرح کے لحاظ سے اس کا دور دور تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جنرل نصیر اللہ بابر کو کراچی میں آپریشن کلین اپ کے دوران "بار بیرک جنرل" کہا گیا۔ نصیر اللہ بابر بلاول ہاؤس میں بدستور مقبول ہیں۔

سیاستدانوں کو کسی نام سے پکارا جائے۔ سیاستدان رہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام اپنے سیاستدانوں سے خوش ہوں تو پھولوں کے ہاروں میں لاد دیتے ہیں۔ ناراض ہوں تو جوتوں کے ہار پہنا دیتے ہیں۔ یہی سیاست ہے مگر عوام کبھی غلط نہیں ہوتے، سیاستدان غلط ہوتے ہیں۔

دہشت گردی

حکومتی ایجنسیاں ناکام کیوں ہیں؟

4امریکی ہلاک' پاکستانی ڈرائیور بھی جاں بحق، پاکستان کے تجارتی دارالحکومت
کراچی میں بدھ 12نومبر 1997ء کی صبح کا آغاز اس ہولناک خبر سے ہوا۔ امریکیوں کو
مارنے کی واردات جس علاقہ میں ہوئی اسے محفوظ ترین وی آئی پی علاقہ کہا جا سکتا ہے۔
آئی ڈی سی کے پل پر انٹرنیشنل آئل کمپنی یونین ٹیکساس کے چار آڈیٹروں اور ان کے
پاکستانی ڈرائیور کو مسلح دہشت گردوں نے خودکار ہتھیاروں سے برسٹ مار کر ہلاک کر
اس پل سے چند سو گز کے فاصلہ پر رینجرز کا ہیڈکوارٹر ہے، پولیس کی چوبیس گھنٹے کام کر
والی چوکی ہے۔ اس کے قریب ہی چیف منسٹر ہاؤس ہے۔ دو فائیو اسٹار ہوٹل ہیں چیف
سیکرٹری ہاؤس ہے۔ کمشنر ہاؤس ہے۔ اس قدر محفوظ علاقہ میں واردات کی کامیابی سے
صاف ظاہر ہے کہ اس کی منصوبہ بندی بڑی ہوشیاری سے کی گئی دہشت گردوں کو بدنصیب
امریکیوں اور پاکستانی کے روٹ کا پورا اندازہ تھا۔ پاکستانی ڈرائیور کو وائرلیس پر کوئی پیغام
تک دینے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس کے ہاتھ وائرلیس پر رکھے رہ گئے۔ اس سانحہ کی خبر بد
قسمت شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کراچی پولیس جائے واردات پر پہنچنے کے
بعد یہ مسئلہ طے کرنے میں مصروف ہوگئی کہ پی آئی ڈی سی پل کے جس حصہ پر امریکیوں کو
گن ڈاؤن کیا گیا کس کی حدود میں آتا ہے۔ یونین ٹیکساس کے ایک افسر کے مطابق پل

کے نیچے کچھ پولیس والے چائے پی رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں سننے کے بعد وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے ایک نے کہا میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں دوسرے نے کوئی جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کراچی پولیس کی ناقص کارکردگی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صبح آٹھ بج کر دس منٹ کے لگ بھگ یہ لرزہ خیز واردات ہوئی۔ پولیس نے جائے واردات پر شہادتوں کو محفوظ کرنے کے لئے تین بجکر 30 منٹ پر سڑک پر اینٹیں لگائیں۔ کراچی کے ڈی آئی جی ملک محمد اقبال کی زیر کمان کام کرنے والے پولیس حکام کو یہ فیصلہ کرنے میں سات گھنٹے لگے کہ جائے حادثہ پر کوئی رکاوٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کراچی کی انتظامیہ اور سندھ کی حکومت حسب معمول اس واردات کے بعد خوف و ہراس کا شکار ہوگئی۔ بیوروکریٹس کو اپنے خاندان اور بچوں کی فکر ہوگئی اعلیٰ پولیس افسران اجلاسوں میں مصروف ہوگئے۔ کئی کو اپنی نوکری کی فکر ہوگئی کیونکہ یہ روایت ہے کہ کراچی میں بڑی واردات کے بعد کمشنر، ڈی آئی جی، متعلقہ ڈسٹرکٹ کے ڈی ایس پی، ایس ایس پی، کو تبدیل کر دیا جاتا ہے اس ردو بدل کی منظوری عموماً وزیر اعظم اعلیٰ سطح کے اجلاسوں کے بعد دیتے ہیں۔

کراچی میں دہشت گردی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ محمد خان جونیجو، بے نظیر، نواز شریف سب کو یہ مسئلہ ورثہ میں ملا۔ یہ صورتحال اس لحاظ سے تشویشناک ہے کہ غیر ملکی باشندوں نے کراچی چھوڑ کر جانا شروع کر دیا تو کون آئے گا۔ صحیح یا غلط بین الاقوامی کمیونٹی امریکیوں کو فالو کرتی ہے۔ جب غیر ملکی اور خاص طور پر امریکی کسی ملک میں مارے جاتے ہیں اس کی انٹرنیشنل لیڈ بن جاتی ہے اس ملک کو بدنامی ملتی ہے۔ پاکستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ حکمرانوں کی مجرمانہ غفلت کی بدولت اس ملک میں دہشت گردی آسان ہے۔ مجرم 99 فیصد کیسوں میں واردات کر کے آسانی سے نکل جاتا ہے۔ یوسف رمزی ہو یا ایمل کانسی پاکستان سب کے لئے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اوپر سے نیچے تک کرپشن ہے۔ ٹاپ مین تک کو خریدا جا سکتا ہے۔ جس ملک کی یہ شہرت ہو اسے بدنامی کے سوا کیا ملے گا۔

پاکستان میں دہشت گردی کی جڑیں نہ صرف گہری ہیں بلکہ مضبوط ہیں منکسر المزاج فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کے ''افغان ایڈونچر'' کی پوری قوم اب تک سزا بھگت رہی ہے۔ خیبر سے کیاڑی تک خودکار اسلحہ کی فراوانی ہوگئی۔ سوویت یونین کو افغانستان سے بھگانے کے لئے افغانوں کو فراہم کردہ راکٹ کراچی میں سرکاری اور نجی عمارتوں پر اب تک چلائے جاتے ہیں۔

جنرل ضیاء کی افغان پالیسی کی بدولت قوم کو کلاشنکوف اور ہیروئن کا کلچر ملا۔ جس کے ہولناک اثرات سے پاکستانی معاشرہ خوفناک رفتار سے بکھر رہا ہے اس افسوسناک صورتحال میں جب بڑا مینڈیٹ لینےوالے وزیراعظم نواز شریف ڈکٹیٹر ضیاء کا مشن پورا کرنے کا عہد کرتے ہیں تو اعجاز الحق کے سوا کسی کو اپنے ساتھ نہیں پاتے ہیں۔ دہشت گردی کے مسئلہ سے جس کو پاکستان کا نمبر ون مسئلہ قرار دینا چاہیے۔ نمٹنا آسان نہیں ہے جس ملک میں نہ امریکی آڈیٹر محفوظ ہوں نہ ایرانی کیڈٹس، نہ پاکستانی علماء نہ اس ملک کے وزیراعظم کا بھائی (مرتضی بھٹو) ایک وزیراعلیٰ (عبداللہ شاہ) کا بھائی نہ ایک لیڈر (الطاف حسین) کا بھائی وہاں کون محفوظ ہے۔ وہ دور گزر گیا جب قبائلی علاقہ خیبر ایجنسی تک محدود تھا اب اسلحہ کی موجودگی اور فراوانی کے لحاظ سے کراچی، لاہور، راولپنڈی، کوئٹہ، پشاور سب کو قبائلی علاقے قرار دینا پڑے گا۔ جو جس کو جب چاہیے جیسے چاہے ہلاک کراسکتا ہے۔ یہاں لاء ہے نہ آرڈر۔

عام شہری سوال کرتے ہیں کہ اتنی لاانفورسنگ ایجنسیوں، فوج، رینجرز، پولیس، آئی ایس آئی، ایم آئی، انٹیلی جنس بیورو، اسپیشل برانچ، سی آئی اے، ایف آئی اے کی موجودگی میں دہشت گرد کس طرح دندناتے پھرتے ہیں۔ کراچی سے راولپنڈی تک کبھی ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ملک کا کوئی محافظ کسی دہشت گرد کو واردات کرتے ہوئے پکڑے۔ یا واردات کے لئے جاتے ہوئے یا واپس آتے ہوئے روک لے۔ کبھی صحیح مقابلہ ہوجائے، ہمیشہ جعلی مقابلہ کیوں ہوتا ہے دہشت گردوں کے ہاتھ کیوں لمبے ہیں، قانون کے ہاتھ

کیوں تنگ ہیں اس کا ایک جواب یہ ہے کہ پاکستان غالباً واحد اسلامی ملک ہے جس کا اسکوارڈن لیڈر کی سطح کا افسر امریکہ میں منشیات اسمگلنگ کی سزا کا منتظر ہے ایک وفاقی وزیر کے لئے اسلام آباد میں پریس کانفرنس کر کے کہا گیا کہ وہ کسی بیرونی ملک کا دورہ کر کے دکھائیں تو سیاست چھوڑ دی جائے گی یہ "محب وطن" وزیر انٹر پول کو مطلوب ہے یہ واحد ملک ہے جس کے دوسرے سب سے بڑے صوبہ کا سابق وزیر اعلیٰ مفرور ہے۔ کئی سابق وزراء انڈر گراؤنڈ ہیں اعلیٰ پولیس افسران پر قتل کے مقدمات ہیں کراچی کے سابق ڈی آئی جی قتل کیس میں نظر بند ہیں۔ ایک سیاسی جماعت کی لیڈر شپ کی ساری زندگی کابل میں گزری ہے۔ ایک بڑا لیڈر پاکستان سے جنگ کے لئے بھارت سے مدد طلب کر چکا ہے۔ ایک قوم پرست سیاستدان پاکستان توڑنے کے لئے بھارت کی حکومت سے اپیل کر چکا ہے۔ ایک وزیر اعظم نے کشمیریوں کی فہرستیں بھارت کو فراہم کی ہیں۔ ایک جلا وطن لیڈر اپنے ورکروں کو انڈر گراؤنڈ رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حکمران جھوٹ سننے اور جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ سب اچھا کی رپورٹ پسند کی جاتی ہے موجودہ وزیر اعظم بھارت اور بعض ہمسایہ اور اسلامی ملکوں کو پاکستان میں دہشت گردی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اپوزیشن کی لیڈر بے نظیر بھٹو کا سارا اقتدار ایجنسیوں کے دفاع کی نذر ہو گیا۔ کراچی میں قتل کی واردات سے لیکر حکومت اور عدلیہ کے تنازعہ کو ایجنسیوں کا کھیل قرار دیا جاتا ہے۔

کراچی ہو یا لاہور کی شاہراہ عام آدمی کو روک کر پوچھ لیں دہشت گردی کے در پردہ کن کا ہاتھ ہے۔ انڈین کا پاکستانی ایجنسی کا ضرور نام لے گا کیونکہ اب ہر معاملہ میں سی آئی اے کو ذمہ دار ٹھہرانے کا وقت گزر گیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے جس شہر میں امریکی باشندے دہشت گردی کا براہ راست نشانہ بنے کراچی ہے۔ مارچ 1995ء میں شاہراہ فیصل پر امریکیوں کی ہلاکت کے بعد 12 نومبر 1997ء کو پی آئی ڈی سی پل امریکی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے واقعہ نے کراچی کو ایک بار پھر بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ کراچی پر سرخ دائرہ لگا دیا گیا ہے۔ کراچی کو امریکیوں سمیت غیر

ملکیوں کے لئے غیر محفوظ شہر قرار دے دیا گیا ہے۔ متعدد امریکی باشندے جو اپنے خاندانوں کے ساتھ تھے کراچی سے انخلاء کر گئے کئی خاندان اسلام آباد اور کئی دوسرے خلیج کی ریاستوں کو کوچ کر گئے ہیں۔ 1995ء کی واردات میں امریکی ڈپلومیٹس ٹارگٹ تھے۔ 1997ء کی واردات میں امریکی آڈیٹرز کو ٹارگٹ بتایا گیا دونوں وارداتوں سے ملک کی ساکھ کو نقصان پہنچا پہلا واقعہ رمزی یوسف کی گرفتاری کے بعد ہوا۔ دونوں واقعات سے ایک بات واضح ہے کہ پاکستان میں قانون شکنی بہت آسان ہے اسی تاثر کو دور کرنے کے لئے عدلیہ سے آہنی جنگ میں مصروف وزیر اعظم نواز شریف کو بڑی محنت کرنا پڑے گی۔ وقت بہت مشکل ہے۔ بیوروکریٹس اور ایجنسیاں جھوٹ کی فائلوں کا انبار لگا رہی ہیں۔ ایک مستحکم حکومت مستحکم پاکستان کے مفاد میں ہے وہی ملک کو لاقانونیت، بدامنی اور دہشت گردی کے سلسلہ سے نجات دلا سکتی ہے اس کے بغیر ملک کی ترقی خواب رہے گی ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کار بدامنی سے پہلے ہی خوفزدہ تھے۔ منظم دہشت گردی کی لہر نے ان کو دہشت زدہ کر دیا ہے یونین ٹیکساس کی جس کے امریکی آڈیٹروں کو دہشت گردی کے ذریعہ موت کی نیند سلا دیا گیا۔ پاکستان میں نصف ارب ڈالر کی سرمایہ کاری ہے یونین ٹیکساس او جی ڈی سی اور اوکسیڈنٹل پیٹرولیم کے ساتھ مل کر ملک کی تیل کی ضروریات کا 50 فیصد پیدا کرتی ہے۔ پاکستان کے لئے یہ کمپنی بڑی اہم ہے اس کے ملازمین کو مارنے سے بیرون ملک جو پیغام جائے گا پاکستان کے لئے سازگار نہیں ہوگا۔ اقتدار ز قبضہ کرنے اور کسی کو اقتدار سے ہٹانے میں مصروف سیاستدانوں، بیوروکریٹس، پاور بروکرز اور ملک کے اہل حکمرانوں کو اس کا جس قدر جلد احساس ہو جائے ملک کے لئے بہتر ہے وقت نکل رہا ہے وقت کا کوئی انتظار نہیں کرتا۔ وقت کے حاکم سمجھ جائیں اسی میں ان کی بقاء ہے۔

میرا گھر لہولہان ہو گیا......غنویٰ بھٹو

''یہ غنویٰ ہے''۔ بیگم نصرت بھٹو نے کوئی آٹھ سال پہلے غنویٰ بھٹو کا ان الفاظ میں تعارف کرایا تھا جو دمشق سے ان سے اور اپنی نند بے نظیر بھٹو سے ملنے آئی تھیں۔ مرتضیٰ بھٹو کا آنا ممکن نہیں تھا۔ اپنی بہن کے پہلے دور اقتدار میں جلا وطن ریڈیکل سیاستدان وطن واپس نہیں آسکے دوسرے دور میں آ گئے مگر یہ واپسی ان کو بہت مہنگی پڑی۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے مگر محفوظ رہے۔ بے نظیر بھٹو کی جمہوریت میں ۷۰ کلفٹن سے چند قدم کے فاصلے پر پولیس نے فائرنگ کر کے ان کی جان لے لی۔ پولیس کی ایکسٹرا جوڈیشل کلنگز کا دفاع کرنے والی وزیراعظم کا اپنا بھائی ایکسٹرا جوڈیشل کلنگ کا نشانہ بن کر شاہراہ ایران پر زخموں سے چور پڑا رہا۔ ایک پولیس افسر اے پی سی (بکتر بند گاڑی) میں ڈال کر مڈایسٹ اسپتال کے گیٹ پر پھینک کر چلا گیا۔ مرتضیٰ بھٹو خون بہہ جانے کی وجہ سے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ فاطمہ اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر یتیم ہو گئے۔ فاطمہ کی دلدوز پکار کو اسلام آباد پہنچنے میں بہت دیر لگی۔ وزیراعظم رات گئے آئیں تو ان کے سامنے ان کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ شاہنواز بھٹو کی لاش پاکستان لانے والی بے نظیر اپنے آخری بھائی کو دفنانے کے لیے لاڑکانہ پہنچ گئیں بے نظیر میں اپنے بھائی کی بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ بلاول ہاؤس اور ۷۰ کلفٹن کے جو فاصلے مرتضیٰ کی زندگی میں برقرار رہے اس کی موت کے بعد اور بڑھ گئے تھے۔ ۷۰ کلفٹن

کے مکینوں کا آخری سہارا جا چکا تھا جہاں اب رینجرز کے جوان ۲۴ گھنٹے پہرہ دیتے ہیں۔

بیگم غنویٰ سے گزشتہ دنوں ایک ملاقات میں ہونے والی گفتگو پیش کی جا رہی ہے۔

☆ آپ کے گھر پر رینجرز کے پہرے ہیں۔ آپ اس ملک میں سیاست کیسے اور کب تک افورڈ کر سکتی ہیں؟

O پولیس اور پہرے کسی کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ سب سے بڑا محافظ خدا ہے۔ مرتضیٰ کی جان لے لی گئی اب ہمارے پاس کیا رہ گیا ہے مگر میری زندگی کا مقصد مرتضیٰ کے بچوں کا تحفظ اور مرتضیٰ کے مشن کی تکمیل ہے۔ اس مقصد سے میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ یہ صحیح ہے ۷۰ کلفٹن میں رینجرز کی چوکی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ پاکستان کے کتنے لوگوں کو یہ سیکیورٹی میسر ہے۔ میرا جینا مرنا پاکستان کے عوام کے ساتھ ہے۔ میں پاکستانی ہوں، پاکستان میرا وطن ہے۔

☆ سیاست کا تجربہ کیسا رہا؟

O تجربہ ہو رہا ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہیں۔ اچھے بھی ہیں برے بھی، مخلص بھی، مفاد پرست بھی۔ سیاست کہیں کی ہو، یہی کچھ ہے۔ میں چاہتی ہوں لوگوں کی غربت دور ہو، ان کو خوشحالی ملے، ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے، یہی ذوالفقار علی بھٹو کا مشن تھا، یہی مرتضیٰ کا مشن تھا، یہی میرا مشن ہے۔

☆ ایسا نظر آتا ہے کہ آپ کے اور بے نظیر کے درمیان کوئی سیز فائر ہو گیا ہے؟

O میں اس تنازعہ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ آگے کی طرف دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہہ گیا ہے۔ وقت کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے تاریخ کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ میں کسی بحث میں الجھے بغیر اپنے مقاصد پر توجہ دینا چاہتی ہوں۔

☆ کیا فاطمہ اور ذوالفقار نے اس المناک حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ مرتضیٰ اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے ہیں؟

O فاطمہ تو کچھ سمجھدار ہے۔ پاپا کے غم نے اس کو دکھی شاعرہ بنا دیا ہے۔ اس کی شاعری میں بڑی گہرائی اور سوز ہے۔ اس نے شاعری میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ ذوالفقار بچہ ہے، کمسن ہے، وہ بھی پاپا کے بغیر جینا سیکھ رہا ہے ہماری طرح۔ ہم سب ہمت سے کام لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زندگی کٹھن ہے۔ مرتضیٰ کی یاد سب سے بڑا سہارا ہے۔

☆ آپ کی والدہ آپ کے سیاست میں حصہ لینے کے حق میں نہیں تھیں، اب وہ کیا کہتی ہیں؟

O ماں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میری خوشی میں ان کی خوشی ہے۔ وہ بچوں کو بہت یاد کرتی ہیں۔ اس لیے ان کو ملانے لے گئی تھی۔

☆ پاکستان کی سیاست کا کیا بنے گا۔ کیا بحران یونہی رہے گا؟

O میرے خیال میں بحران ختم نہیں ہوا ہے، ٹل گیا ہے۔ مسائل وہی جوں کے توں ہیں۔ تنازعہ کی صورتحال وہی ہے۔ تصفیہ کہاں نظر آ رہا ہے۔ صورتحال مستحکم نہیں ہے اسے کون مستحکم کہے گا۔ فاروق لغاری نے استعفیٰ دے کر ملک کو بحران سے بچایا ہے۔ وہ بااصول آدمی ثابت ہوئے ہیں۔ حکومت کے آدمیوں کو سپریم کورٹ پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ عدلیہ پر حملہ ہے۔ اس سے بدترین مثال قائم ہوئی ہے۔

☆ کیا آپ سردار فاروق لغاری کو اپنی پارٹی میں ویلکم کریں گی؟

O ان کے لیے دروازے کھلے ہیں، وہ آئیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ سردار فاروق لغاری بااصول آدمی ہیں۔ استعفیٰ دے کر اپنی اصول پسندی کا ثبوت دے چکے ہیں۔

☆ آپ کے لیے پاکستان کے عوام کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں مگر یہ ہمدردی سیاسی حمایت میں نہیں بدل سکی۔ الیکشن میں پی پی پی (شہید بھٹو) کو خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی؟

O ہم نئے تھے۔ ہم پر اتنا بڑا سانحہ گذرا ہے، ہم اس صدمہ سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ الیکشن سر پر آ گئے۔ ہم خود کو منظم کر رہے ہیں۔ میں چاروں صوبوں کے دورے کر

رہی ہوں۔ پنجاب میں بڑا ریسپانس ملا ہے۔ لوگوں میں بڑا ولولہ پایا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد کا میرا دورہ بہت کامیاب رہا۔ بھٹو اور مرتضیٰ کے شیدائی ہر جگہ ہیں۔ پورا ملک ان سے بھرا ہوا ہے۔ عوام ہمارا ساتھ دیں گے۔

☆ بھٹو اکاؤنٹس کی بڑی بازگشت سنائی دے رہی ہے، آپ کا اس پر کیا ردعمل ہے؟

O مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے جب بھٹو اکاؤنٹس کا نام لیا جاتا ہے۔ بھٹو اکاؤنٹس نہیں ہیں زرداری اکاؤنٹس ہیں۔ یہ اکاؤنٹس جب فریز ہوئے، میری بہن نے اس کی خبر سن کر مجھے فون کیا۔ وہ بڑی فکر مند تھی۔ میں نے کہا ہمارے اکاؤنٹس نہیں ہیں یہ زرداری اکاؤنٹس ہیں۔ بھٹو کا نام کیوں لیا گیا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو کے پاس کوئی اکاؤنٹس نہیں ہے۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ اکاؤنٹس کسی کے ہیں، نام کسی کا لیا جا رہا ہے۔ عوام کو ان کے حقوق ملنا چاہئیں۔ یہ ان کا بنیادی انسانی حق ہے۔ گھروں میں بجلی نہیں ہے، پانی نہیں ہے، اسکولوں میں تعلیم نہیں ہے، اسکول نہیں ہیں، اسکول ہیں تو ٹیچر نہیں ہیں۔ ہسپتال نہیں ہیں، ہسپتال ہیں تو ڈاکٹر نہیں ہیں، دوائیں نہیں ہیں، لوگوں کے لیے روزگار نہیں ہے۔ بے روزگاری ہے، برطرفی ہے۔ یہ صورتحال بدلنا پڑے گی کیونکہ عوام کا احساس کرنا پڑے گا۔ میں موٹر وے کے خلاف نہیں ہوں اس کی ضرورت تھی مگر عوام کے بنیادی مسائل کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ قوم کا مسئلہ موٹر وے نہیں ہے۔ یہی میرا موقف کالا باغ ڈیم پر ہے۔ ڈیم ضرور بنے مگر اتفاق رائے سے۔ کوئی چیز قوم کے اتحاد اور یکجہتی سے بڑی نہیں ہے۔

میں نے بیروت میں بڑا خون دیکھا ہے جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ کراچی میں وہی خونریزی نظر آئی ہے۔ میرا گھر تک لہولہان ہوگیا۔ خونریزی بند ہونی چاہیے۔ یہ بڑا نقصان ہے۔ قوم کا بہت نقصان ہو چکا ہے۔ پاکستانی قوم کسی اور نقصان کو افورڈ نہیں کرسکتی۔ جو مجھ پر گزری ہے میں نہیں چاہتی کسی اور کا مقدر بنے۔ حکمرانوں سیاستدانوں کو ملک کی تعمیر کرنا چاہیے۔ مرتضیٰ بھٹو نے اس ملک کے لیے خون دیا ہے۔ میرا دل اپنے اس ملک کے خون کے آنسو روتا ہے۔

محترمہ غنویٰ بھٹو کچھ دیر کے خاموش ہو کر اپنے سامنے لگے مرتضیٰ بھٹو کے پورٹریٹ کو دیکھنے لگیں۔ ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔ پی پی پی (شہید بھٹو) کے مرکزی سکریٹری اطلاعات سید خادم علی شاہ، عبداللہ بلوچ، نور جہاں سومرو سب خاموش بیٹھے تھے۔ خاموشی طویل ہو گئی تو اس کو توڑنا ناگزیر ہو گیا۔

☆ مرتضیٰ کا کیا ڈریم تھا؟

O مرتضیٰ عوام کی خوشحالی کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ ایک ایسا پاکستان چاہتے تھے جس میں غریبوں کے دکھ بانٹے جائیں، ان کو روزگار ملے، تعلیم ملے، صحت ملے، خوشیاں ملیں۔ میں ان کے ان خوابوں کو کبھی بکھرنے نہیں دوں گی۔ یہ میرا پاکستان کے عوام کے ساتھ وعدہ ہے۔ پاکستان کے عوام بہت محنتی، مخلص اور جفاکش ہیں۔ وہ بہتر زندگی کے حقدار ہیں۔

رات بیت چلی تھی۔ ۷۰ کلفٹن پر رینجرز کی چوکی میں چاق و چوبند جوان مستعد بیٹھے تھے۔ شاہراہ ایران پر سناٹا طاری تھا۔ کلفٹن گارڈن کے تاریک درختوں کے سائے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ انہی درختوں کی اوٹ سے چند بزدلوں نے ایک بہادر کو نشانہ بنایا تھا۔ بے نظیر مرتضیٰ بھٹو کا انتقام نہیں لے سکی۔ کیا فاطمہ مرتضیٰ کا انتقام لے سکے گی؟

پاکستان کے پاور بروکرز

مرد آہن جنرل ضیاء الحق کے دور کی بات ہے۔ ۱۹۸۵ء کی غیر جماعتی قومی اسمبلی کے انتخابات ہو چکے تھے۔ پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھانے کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے آزمودہ کار الٰہی بخش سومرو اور میر ظفر اللہ جمالی کی سیاہ شیروانیاں تیار تھیں۔ دونوں کو صدر مملکت وزیر اعظم بنانے کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔ الٰہی بخش سومرو اور میر ظفر اللہ جمالی حلف برداری کے لیے تیار تھے مگر قرعہ فال مرنجاں مرنج محمد خان جونیجو کے نام نکلا جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے جانشین کی حیثیت سے پاکستان کے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ سندھ کو طاقتور نہ سہی مگر وزیر اعظم تو بہرحال مل گیا تھا۔

سندھڑی کے محمد خان جونیجو کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج سجانے کا کریڈٹ حروں کے روحانی پیشوا پیر صاحب پگارا کو حاصل ہوا۔ پیر صاحب پگارا نے اپنے قابل فخر مرید کو وزیر اعظم بنوا دیا تو اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے دیکھتے رہ گئے۔ پیر صاحب نے اس وقت ''پاور بروکر'' کا صحیح رول ادا کیا۔ کراچی کے سندھ کلب میں جنرل ضیاء الحق سے پیر صاحب پگارا کے مذاکرات ہوئے جو فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق کے پورے دور میں پیر صاحب خود کو بڑے فخر سے جی ایچ کیو کا آدمی کہہ کر اس سے ''واسطہ داری'' پر ناز کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے پر آشوب دور میں ان کی یہ پوزیشن برقرار رہی۔ سینٹ کا الیکشن ہو، سندھ اور پنجاب کی وزارت، کارپوریشنوں کی سربراہی یا تجارتی اور

رہائشی پلاٹوں کی الاٹمنٹ ہر مسئلہ کنگری ہاؤس میں حل ہوتا تھا۔ سندھ کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ کے لیے پیر صاحب کی پرچیوں پر ''خیر پور جا سائیں'' لکھا ہوتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے قائم علی شاہ وزیر اعلیٰ بنے تو یہی الفاظ برقرار رکھے گئے۔ سیاستدان اور بیورو کریٹس کنگری ہاؤس پر حاضری کو لازمی خیال کرتے تھے۔ جس سے پیر صاحب خوش ہوتے اس کا کام نہیں رکتا تھا۔ اس دوران یہ انکشافات ہوتے رہے کہ سینیٹ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ٹکٹ کے لیے امیدواروں سے رقوم وصول کی گئی تھیں۔ سندھ میں سینیٹ کے الیکشن میں بڑی دلچسپ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب مسلم لیگ کا ایک امیدوار غیر مسلم لیگی امیدوار سے ہار گیا تو مخالفین نے پیر صاحب پر الزامات لگائے۔

پیر صاحب سے ایک تقریب میں جب پوچھا گیا کہ بعض لوگ آپ پر الیکشن میں سرمایہ لینے کا الزام عائد کرتے ہیں تو انہوں نے بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جو لوگ پاکستان بننے کے بعد سے لوٹ کھسوٹ کر رہے ہیں ان سے کوئی نہیں پوچھتا ہم تو اپنا پیسہ واپس لے رہے ہیں''۔

پیر صاحب پگارا کو کنگ میکر کی حیثیت مل گئی مگر سندھ کے ووٹروں نے ان کو براہ راست انتخاب میں کبھی ووٹ نہیں دیئے۔ وہ جب کھڑے ہوتے پی پی پی کے پرویز علی شاہ ان کو ہرا دیتے جن کو ''فاتح پگارا'' کا نام دیا گیا۔ **1988**ء اور **1990**ء کی انتخابی ہزیمت کے بعد پیر صاحب نے انتخابی سیاست کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ **1993**ء اور **1997**ء کے الیکشن میں ان کے صاحبزادوں نے حصہ لیا، مگر جمہوری سیاست سے گریز کے باوجود پیر صاحب کی اہمیت میں کمی نہیں ہوئی ہے۔

پیر صاحب پگارا کا جہاں سندھ میں کنگ میکر کا رول رہا وہاں پنجاب میں ان کے برادر نسبتی مخدوم زادہ حسن محمود عرصہ تک فعال رہے۔ ان کو جوڑ توڑ کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ سیاسی فیصلوں میں ان کی رائے کو وزنی خیال کیا جاتا تھا۔ پیر پگارا سے رشتہ داری سے

سندھ اور پنجاب کے سیاسی تعلقات استوار ہوئے جو تقریباً چار عشروں تک قائم رہے۔ پھر جب پیر صاحب اور ان کی اہلیہ رضیہ بیگم کی علیحدگی ہوئی تو کنگری ہاؤس میں عملی طور پر جھاڑو پھر گئی۔ اس صدمہ سے سنبھلنے میں پیر صاحب کو وقت لگا۔ بہر حال وہ اب نئی ازدواجی زندگی شروع کر چکے ہیں۔

پیر صاحب پگارا اور ان کے معتقد جام صادق علی دونوں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ میں تھے۔ پیر صاحب نے عوامی لیگ سے علیحدگی اختیار کی تو ان کی ایما پر جام صادق بھی علیحدہ ہو گئے۔ جام صادق علی نے 1970ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیا پھر ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بھٹو دور میں جام صادق علی نے کراچی کی زمین بے دریغ مستحق اور غیر مستحق لوگوں میں الاٹ کی۔ اس زمانہ میں یہ لطیفہ مشہور تھا کہ بھٹو جام صادق علی سے ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ ''یار کہیں قائد اعظم کے مزار کو الاٹ نہ کر دینا''۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد جام صادق علی اعلانیہ لندن فرار ہو گئے۔ جلا وطنی کے دنوں میں جام صادق نے بڑی سختیاں برداشت کیں۔ ان کی بے نظیر کے دور میں وطن واپسی پر وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کے نعرے لگے۔ جام صادق علی بے نظیر حکومت کے قیام کے بعد نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھی تھے۔ پیر پگارو نے جام صادق کی معافی قبول کر لی۔ جس کے بعد ان کا ایم کیو ایم کے اشتراک سے سندھ میں اقتدار کا نیا دور شروع ہوا اور جام صادق سے پی پی پی نے اس طرح بدلہ لیا کہ ان کی قبر کو بم سے اڑا دیا گیا۔ جام صادق کے بیٹے جام معشوق اب مسلم لیگ کے ساتھ ہیں، جو قومی اسمبلی کا الیکشن آزاد حیثیت میں جیتے ہیں۔

سندھ کے ہارون خاندان کو آمریت اور جمہوریت دونوں میں خاطر خواہ طور پر نمایاں پوزیشن حاصل رہی۔ یوسف ہارون کو عرصہ تک کنگ میکر کی حیثیت ملی رہی۔ ان کے لیے ہر دور میں یہ تاثر عام تھا کہ جب پاکستان کے دورہ پر آتے تو اسلام آباد میں حکومت

ہل جاتی تھی۔ سیاستدان اور اخبار نویس سسٹم کی تبدیلی کی قیاس آرائیاں کرنے لگتے تھے۔

یوسف ہارون پاور بروکر کے عہدہ سے ریٹائر ہوکر حالات کا خاموشی سے جائزہ لے رہے ہیں۔ نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے تنازعہ کے دوران جو اداروں کی جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ یوسف ہارون اسلام آباد میں رہے اور ان کے رفقا کے الفاظ میں صورتحال کو انجوائے کرتے رہے۔

یوسف ہارون کے چھوٹے بھائی محمود ہارون جنرل ضیاء الحق کے دست راست تھے جن کو بے نظیر بھٹو نے سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ اقتدار کی خواہش بھی کبھی کیا گل کھلاتی ہے۔ محمود ہارون ضیا دور میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی منظوری دینے والی وفاقی کابینہ کے رکن تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کو اپنی موت تک یہ شکایت رہی کہ بے نظیر نے بھٹو کے قاتلوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ کم و بیش یہی شکایت مخدوم خاندان کے خلیق الزماں کو رہی۔ جنہوں نے بے نظیر کا ساتھ چھوڑ کر اپنے خاندان سے بغاوت کر دی تھی۔ مخدوم خاندان کو سندھ میں طاقتور سمجھا جاتا ہے جس کے سربراہ امین فہیم ہیں مگر اب تک یہ خاندان حیران ہے کہ وہ اقتدار سے کیوں دور ہے۔

ہر بحران کے دور میں امین فہیم راولپنڈی اسلام آباد سے رابطے بڑھا دیتے ہیں۔ ان کے حامی اخبار نویس ان کے برسر اقتدار آنے کی قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں مگر منزل۔ ان سے دور ہی رہتی ہے۔

غلام مصطفیٰ جتوئی کا خاندان سیاسی طور پر طاقتور ہے جس کی سینیٹ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی تینوں منتخب اداروں میں نمائندگی ہے جتوئی کے لیے 1985ء میں وزیر اعظم بننے کا سنہری موقعہ تھا مگر انہوں نے بے نظیر کی ایما پر الیکشن کا بائیکاٹ کر کے گنوا دیا۔ ملک کی سیاست میں جتوئی خاندان کی اہمیت مسلم ہے۔

سومرو خاندان کو بھی بڑی اہم پوزیشن حاصل تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں الٰہی بخش سومرو وفاقی وزیر تھے ان کے بھائی افتخار سومرو سندھ کے وزیر تھے۔ اس وقت الٰہی

بخش سومرو قومی اسمبلی کے اسپیکر ہیں۔ سومرو خاندان یو بی ایل اور نیشنل بینک کی سربراہی سنبھالے ہوئے ہے۔

سندھ میں محدود پیمانہ پر قاضی فیملی پاور گیم میں موثر رہی ہے۔ جس میں قاضی اکبر، قاضی عبدالمجید عابد کے بعد قاضی اسد عابد اور قاضی امین کا رول ہے۔

پنجاب میں لغاری خاندان، مزاری خاندان، چودھری برادران، مخدوم قریشی ہر دور میں سیاسی طور پر فعال رہا ہے۔

بلخ شیر مزاری نگران وزیراعظم بننے کے بعد غیر موثر ہو گئے مگر فاروق لغاری نے اپنے سیاسی کارڈز صحیح ہاتھ سے کھیلے جو ایک وزیراعظم (بے نظیر) کی رخصتی کے بعد دوسرے وزیراعظم (نواز شریف) کے لیے خطرہ بن گئے۔ سندھ میں تالپور خاندان کے احمد علی تالپور اور رسول بخش تالپور کے دور بھی اتنے ہی اہم تھے جتنے سرحد میں ارباب برادران، کلثوم سیف اللہ، سلیم سیف اللہ، جاوید سیف اللہ، یوسف خٹک، اسلم خٹک اور بلوچستان میں جوگیزئی اور جمالی اہم تھے۔

سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ پاور بروکرز کے طور پر بیوروکریٹس کا کردار بھی ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

بے نظیر اور آصف زرداری

"یہ مونچھوں والا آدمی کون ہے، جو روز آپ کے دفتر میں بیٹھ کر گھنٹوں ٹیلی فون کرتا ہے"۔

1980ء کی دہائی کے اوائل میں کے ڈی اے کنٹرولر آف بلڈنگز احمد حسین سے جب یہ پوچھا گیا تو انہوں نے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ نعیم احمد ڈائریکٹر ماسٹر پلان جو بعد میں ڈی جی کے ڈی اے بنے کا آدمی ہے، حاکم علی زرداری کا بیٹا ہے، بڑے تعلقات والے لوگ ہیں، اس کا نام آصف ہے۔ کیپری سینما کے پیچھے آصف پلازہ ان ہی کا ہے"۔

یہ تھا وہ انداز جس میں کراچی کے بلدیاتی رپورٹروں کا آصف علی زرداری سے تعارف ہوا۔ سفید کلف دار قمیض شلوار سیاہ سینڈل مونچھوں پر مستقل تاؤ انگریزی اردو اور سندھی میں بات چیت۔

آصف علی زرداری کے کیریئر کی ابتدا اوسط درجہ کے بلڈر کی حیثیت سے ہوئی جو اپنے بلڈر ساتھیوں کی طرح احمد حسین اور نعیم احمد کے دفتر کے چکر لگانے پر مجبور تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ فلیٹ سائٹ کی بڑی مانگ ہوتی تھی، کراچی کے سیاستدان حنیف طیب، زہیر اکرم، ندیم، حافظ تقی بلڈرز کے دفتروں میں پائے جاتے تھے۔ آصف علی زرداری اس دور میں سادہ مزاج کے بلڈر تھے جو کے ڈی اے کے چپڑاسیوں میں مقبول

تھے۔ افسروں کے ساتھ بیٹھ کر دال چاول اور بھنے ہوئے چنے کھاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب آصف زرداری اپنے گھر سے جو 70 کلفٹن سے دور نہیں تھا بے نظیر بھٹو کو جلوس کی قیادت کرتے اور آتے جاتے دیکھتے تھے۔ ان کے والد حاکم علی زرداری ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی میں تھے مگر سندھ کے ہر سمجھدار سیاستدان کی طرح بھٹو کو ان کا اقتدار ختم ہونے پر چھوڑ چکے تھے۔ زرداری فیملی کو سندھ میں عام طور پر مفاد پرست سمجھا جاتا ہے حاکم علی اور آصف علی دونوں کو جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں کسی جہاد کا شوق نہیں تھا۔

دونوں نے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لیا اور ہار گئے۔ ان انتخابات کا بے نظیر بھٹو کی ایما پر نو سیاسی جماعتوں کے اتحاد ایم آر ڈی نے بائیکاٹ کیا تھا۔ اس وقت ولی خان، شیر باز مزاری، غوث بخش بزنجو، نواب زادہ نصر اللہ خاں، معراج محمد خان، فتحیاب علی خاں سب کو بے نظیر کی اور بے نظیر کو ان کی ضرورت تھی۔ بے نظیر بھٹو نے خود ساختہ جلا وطنی سے واپس آ کر موسم خزاں میں الیکشن کے لیے ضیاء جاوے کی تحریک چلائی۔ جنرل ضیاء نہیں گئے تحریک ناکام ہوگئی۔ بے نظیر بھٹو لندن چلی گئیں پھر لندن ہی سے ان کی آصف علی زرداری کے ساتھ منگنی کا اعلان ہوا تو کیماڑی سے خیبر تک لاکھوں جیالے دل پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہا کہ بیگم صاحبہ (نصرت بھٹو) نے کیا کر دیا کیا پورے ملک میں کوئی صحیح رشتہ نہیں ملا تھا؟

بے نظیر بھٹو منگنی کے بعد عید منانے وطن واپس آئیں تو لاڑکانہ میں کارکن رو دیئے بے نظیر نے کہا ''میں تمہاری بہن ہوں، آصف تمہارا بہنوئی ہے میں نے بیگم صاحبہ کے فیصلہ کے آگے سر جھکایا ہے میں ایک مشرقی لڑکی ہوں''۔

اسی روز سے آصف علی زرداری اپنے مخالف اور حامی دونوں جیالوں کے لیے ''دولہا بھائی'' بن گئے۔

بے نظیر بھٹو کو بلوچی نژاد سندھی بزنس مین میں کیا خوبی نظر آئی تھی؟ اس سلسلے میں ڈاٹر آف دی ایسٹ، میں بے نظیر بھٹو نے لکھا ہے کہ لندن میں ایک جگہ ڈنر پر جاتے ہوئے

ہم راستہ بھول گئے تو آصف ہمیں ہنساتے رہے۔ (یہ منگنی سے چند روز پہلے کا واقعہ ہے) پھر شہد کی ایک مکھی مجھے تنگ کرنے لگی تو آصف نے مجھے سنبھالا پاکستان کے طاقتور وزیر اعظم کی بیٹی کو اپنے ہونے والے شوہر کی یہ ادا بھا گئی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے حامیوں اور مخالفوں کو یہ اطمینان تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی شاہنواز بھٹو کی موت اور بیگم نصرت بھٹو کی خطرناک بیماری کے بعد بے نظیر کی زندگی میں عرصہ بعد کوئی خوشی آئی۔ بھٹو کی بیٹی خوش تھی۔ جیالے خوش تھے جنرل ضیاء خوش تھے کہ ایک مخالف سیاست دان گھر کی ہو جائے گی۔ بھٹو خاندان اور زرداری خاندان نے اس رشتہ میں رازداری سے کام لیا مگر حکومت کو علم تھا کہ 70 کلفٹن اور زرداری ہاؤس کے درمیان خواتین کی آمد ورفت ہو رہی ہے۔

آصف زرداری کو خوش قسمت ترین آدمی سمجھا گیا۔ زرداری ہاؤس سے بے نظیر کے لیے روایتی مہندی آئی، وہی روایتی گانے ہوئے، لڑکے اور لڑکی والوں میں نوک جھونک ہوئی بے نظیر کی سہیلیاں سوسن فیروزہ اور سمیعہ انتہائی خوش تھیں۔ مہندی میں آصف زرداری کے دوست آغا سراج نمایاں تھے آصف کے بہنوئی منور تاپور تھے بہنیں عذرا اور فریال تھیں۔ سب خوش تھے۔

بے نظیر بھٹو نے لیاری کے غریبوں کو فراموش نہیں کیا تھا ککری گراؤنڈ میں ایک بڑے استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں لاہور کے کاریگروں نے آتش بازی کا شاندار مظاہرہ کیا۔ بھٹو کی بیٹی 70 کلفٹن سے رخصت ہو کر زرداری ہاؤس جا چکی تھی۔ ولیمہ کی تقریب میں بیگم حاکم علی زرداری بے نظیر کا ہاتھ پکڑ کر روایتی ساس کی طرح مہمانوں سے ملا رہی تھیں۔ بے نظیر، آصف، حاکم علی، بیگم حاکم، نصرت بھٹو، صنم بھٹو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو نے دمشق سے مبارک باد بھیجی اپنے چھوٹے بھائی کو یاد کر کے بے نظیر کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں باپ اور بھائی ختم ہو گئے واحد بھائی جلاوطن تھا۔

جنرل ضیاء الحق جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حکم نامہ پر دستخط کیے

17 اگست 1988ء کو فضائی حادثہ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے کہا زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، جس طرح بیگم نصرت بھٹو بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو کو بھٹو کا آخری دیدار کرنے کا موقعہ نہیں ملا اسی طرح جنرل ضیاء کی اولاد اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے سے محروم رہی۔ اس سانحہ نے پاکستان میں جمہوریت کی راہ میں واحد اور سب سے بڑی رکاوٹ دور کر دی تھی۔ قائم مقام صدر غلام اسحاق خاں نے الیکشن کرائے۔ پاکستان کے وزیر اعظم بننے کے روایتی امیدوار غلام مصطفیٰ جتوئی، الٰہی بخش سومرو ہار گئے۔ بے نظیر بھٹو لاڑکانہ سے کراچی پہنچیں تو ان کے لیے وی وی آئی پی لاؤنج کھول دیا گیا۔ وزیر اعظم مقرر ہوئے بغیر بے نظیر ملک کی وزیر اعظم تھیں آصف علی زرداری مرد اول بن گئے تھے۔ حاکم علی زرداری خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے ذوالفقار علی بھٹو کو مصیبت میں چھوڑنے والے ان کی بیٹی اور اپنی بہو کی پارٹی میں شامل ہو چکے تھے حاکم علی کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئر مین مقرر کیا گیا تھا۔

آصف علی زرداری ابتدا میں بیک گراؤنڈ میں رہے مگر رفتہ رفتہ اپنی پوزیشن سامنے لاتے رہے فیصلہ سازی میں ان کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی ان کے مخالفین ان کو مسٹر ٹین پرسنیٹ، کہنے لگے تھے۔

اٹھارہ ماہ بعد بے نظیر بھٹو کو گھر بھیجا گیا تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی مگر کرپشن میں صرف آصف زرداری کا نام تھا بے نظیر بھٹو کی سلیٹ کلین تھی سندھ کے مرد آہن جام صادق علی سندھ اسمبلی میں ایک نشست رکھ کر صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے اپوزیشن کی پی پی پی کے لیے ضیا دور واپس آ گیا تھا۔ اپنے مخالفین کی خواہشوں کے برعکس آصف زرداری جیل میں ڈٹ گئے بے نظیر کے شوہر نے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے نظیر کا شریک حیات ان کی طرح اسٹیبلشمنٹ کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا تھا جیالوں کی نظروں میں آصف زرداری کا احترام بڑھ گیا۔ مخالف جیالے تک ان کو آصف بھائی کہنے پر مجبور ہو گئے تھے بے نظیر بھٹو نے سیاسی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کارڈ صحیح کھیلے ''گو بابا گو'' کا نعرہ لگایا نواز

شریف اپنی عادت کے مطابق خود کو وزیر اعظم بنانے والے صدر سے تنازعہ شروع کر چکے تھے۔ بے نظیر نے مارگریٹ تھیچر کے مشورہ پر اسحاق اور نواز دونوں کو "ڈمپ" کر دیا۔

تین سال تک اپوزیشن میں رہنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ایک بار پھر پاکستان کی وزیر اعظم بن گئی تھیں۔ آرمی اسٹیبلشمنٹ ان کے ساتھ تھی۔ ان کے حامیوں کو یقین تھا کہ بے نظیر اپنی غلطیوں کو نہیں دہرائیں گی آصف علی زرداری کو پاور کوریڈور سے فاصل پر رکھیں گی مگر مخالفین کو اعتماد تھا کہ بے نظیر نے اپنی غلطیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔ اپنے شوہر کی محبت میں وہ دیوانی ہیں یہی دیوانگی ان کی حکومت کو ایک روز لے ڈوبے گی۔ پھر وہی ہوا آصف زردار کا عمل دخل صدر کے انتخاب سے ایسا شروع ہوا جو کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ماحول کے تحفظ کے منصوبہ سے لے کر غیر ملکی سرمایہ کاری تک پاور کوریڈور سے پاور پروجیکٹ تک مرد اول کا ہر لفظ آخری تھا۔

بے نظیر بھٹو کے اقتدار کے دن گنے جا چکے تھے۔ اپوزیشن کے لیڈر نواز شریف مرتضیٰ کے قتل کے بعد حالات اچانک بدلے فاروق لغاری نے جن کو خود بے نظیر نے صدر بنایا بالآخر اپنی لیڈر کو گھر بھیج دیا اور ان کے شوہر کو گرفتار کر لیا گیا۔ فاروق لغاری نے بے نظیر کے خلاف چارج شیٹ پڑھ کر سنائی تو فاروق بھائی فاروق الحق بن گئے۔ غدار غدار بے نظیر کے کیمپ میں صدر کے لیے یہی نعرے لگتے تھے۔ بے نظیر کو یقین ہے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے ان کے خیال میں چاولوں سے آبدوزوں تک گولڈ سے طیاروں تک آصف زرداری نے ہر ڈیل میں پیسہ بنایا ہے خود آصف زرداری نے کبھی یہ بات نہیں چھپائی کہ پیسہ کمانے کو وہ زندگی کا واحد مشغلہ سمجھتے ہیں آصف زرداری کو ان کے مخالف تک دوستوں کا دوست، تسلیم کرتے ہیں یہ سندھ کا کلچر ہے کسی سوالی کو مایوس نہیں لوٹایا جاتا ہے میں کسی ضرورت مند کو نو نہیں کہہ سکتا تھا آصف زرداری نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت مند کا منہ چھوٹا تھا تو میرا کیا قصور ہے۔

بے نظیر کو بھٹو فیملی کے دوستوں نے خبردار کیا کہ آصف زرداری کو سیاسی طور پر

آگے نہ آنے دینا۔ 1988ء سے 1990ء کا تجربہ تمہارے سامنے ہے۔ بے نظیر نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کردیا آصف زرداری سینیٹر منتخب ہوئے تھے ان کو پرائم منسٹر ہاؤس میں دفتر دیا گیا 1996ء میں جب وہ سرمایہ کاری کے وزیر بنائے گئے لوگوں نے کہا کہ اسلام آباد سے بے نظیر کے جانے کے دن قریب آگئے کچھ لوگ ان کو ڈیفیکٹو پرائم منسٹر کہنے لگے تھے۔ آصف زرداری کی باتیں ختم نہ ہوتی تھیں روپیہ اور پولو کے لیے وہ دیوانے تھے اپنے کئی دوستوں سے کہتے پائے گئے۔ اس ملک کی ایک خوبی ہے یہاں آپ ہر آدمی کو خرید سکتے ہیں۔ اس بار آصف نے میڈیا پر خاص توجہ دی۔

اردو کالم نویس اظہر سہیل بی بی سی کے ظفر عباس ڈان کے خیام الدین ان کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ ظفر عباس کے پاس اکثر ناشتہ کرتے تھے ان کے سندھ کے دوستوں کے لیے برملا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جن کے پاس سگریٹ کے پیسے نہیں ہوتے تھے اب وہ مرسڈیز کاروں میں گھومتے ہیں۔ اسی دوست نوازی کی آصف زرداری اور بے نظیر دونوں سزا بھگت رہے ہیں۔ ایکس فرسٹ کپل کے خلاف کرپشن کے 65 مقدمات تیار ہیں احتساب کمیشن میں ریفرنس دائر کیے گئے ہیں۔

بے نظیر آصف اور بیگم نصرت بھٹو کے ایک کروڑ 31 لاکھ ڈالر کے سوئس اکاؤنٹس فریز کردیے گئے ہیں۔ نامعلوم رقم کے برطانوی اکاؤنٹس فریز کرنے کے لیے حکومت برطانیہ سے درخواست کی گئی ہے امریکہ میں بھی اثاثوں کو منجمد کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔

بے نظیر اور آصف نے اپنے اقتدار میں کتنی دولت بنائی اس کا فیصلہ مشکل ہے نیویارک ٹائمز کے مطابق دونوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ڈیڑھ ارب ڈالر سے زیادہ رقم غیرقانونی طور پر کک بیکس کے ذریعہ بنائی ہے۔ آصف نے بے نظیر سے اپنی شادی کو بے پناہ پاور کے حصول کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے شوق کا کوئی مول نہیں تھا۔ پولو کے گھوڑوں سے لے کر سرے پیلس تک کہیں ان کا ہاتھ نہیں رکتا تھا۔ بے نظیر بھٹو

ایک مشرقی بیوی کی طرح اپنے شوہر کا بدستور دفاع کرتی ہیں، آصف بے قصور ہے ان کے خلاف کرپشن کی اسٹوری ڈرامہ ہے۔ آصف نے جھکنے سے انکار کر دیا ہے وہ میرا ساتھ دے رہے ہیں اور میں ان کا ساتھ دے رہی ہوں۔

پاکستان میں بہت سے لوگوں کی رائے میں بات اتنی سی نہیں ہے، مگر لوگ سوال کرتے ہیں کہ نواز شریف کو کورٹ میں جانے سے کون روک رہا ہے جس کا بے نظیر روز مطالبہ کرتی ہیں اگر صحیح ٹرائل ہو تو میں اپنا دفاع کر سکتی ہوں۔

کیا آصف زرداری نے پاکستان کی دو بار وزیر اعظم بننے والی دختر مشرق کے لیے اپنا دفاع ناممکن نہیں بنا دیا ہے؟ ایک سیاستدان نے جس کے بھٹو فیملی سے قریبی تعلقات ہیں اعتراف کیا کہ میں اس گیم میں بے نظیر اور آصف دونوں کو قصور وار سمجھتا ہوں بی بی نے 1990ء سے سبق نہیں لیا۔ ان کا یہی انجام ہونا تھا۔ اپنے محل نما بنگلہ میں حاکم علی زرداری نے کہا ''میرا بچہ بے قصور ہے، ہم تو اس سیاست میں خوامخواہ پھنس گئے۔ ہمیں کیا ملا''۔

پاکستان کے بہت سے لوگ حاکم علی زرداری سے اتفاق نہیں کریں گے۔ مگر پاکستان کی سیاست بڑی عجیب ہے بھٹو کی بیٹی بے نظیر کو اپنے شوہر آصف کی حاکم علی کی بیٹی فریال کو اپنے شوہر منور تالپور کی فکر ہے دونوں اپنے شوہروں کو بچانے کے لیے اسٹیبلشمنٹ سے لڑ رہی ہیں۔

کراچی سنٹرل جیل میں چار سالہ آصفہ اور سات سالہ بختاور اپنے باپ کو دیکھ کر بے اختیار لپٹ جاتے ہیں۔ نو سالہ بلاول سوچوں میں گم کھڑا رہتا ہے۔ بلاول کے باپ پر ماموں مرتضیٰ کے قتل کا الزام ہے وہی ماموں جس نے 20 ستمبر 1996ء کو بلاول کی سالگرہ سے ایک روز پہلے سالگرہ کا تحفہ بھیجا تھا مگر یہی تحفہ جب بلاول کو ملا اس کا ماموں اپنے باپ اور بھائی کے پہلو میں دفن ہو چکا تھا۔

گھر خالی ہے مگر کمپرومائز نہیں کیا

سجاد علی شاہ

پاکستان کے چیف جسٹس کی حیثیت سے سپریم کورٹ کے بنچ کی سربراہی کرتے ہوئے ۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو جسٹس سجاد علی شاہ نے ججوں کی تقرری کے مسئلہ پر سنیارٹی کے اصول پر جو فیصلہ نظریں جھکا کر دیا۔ اس فیصلہ نے عدلیہ کا سر بلند کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس وقت کے اپوزیشن لیڈر نواز شریف نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ اس فیصلہ کے نو ماہ کے اندر بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی۔ بے نظیر حکومت کی برطرفی کو کرپشن اور ایکسٹرا جوڈیشل کلنگز کی پاداش میں جائز قرار دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حق میں فیصلہ دینے والی عدلیہ ملک کی متلاطم تاریخ میں پہلی بار جرات مندانہ فیصلے کر رہی ہے۔ انہیں فیصلوں کے درمیان پاکستان مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف تاریخی مینڈیٹ لے کر وزیراعظم منتخب ہوئے۔ صدر، وزیراعظم، چیف جسٹس تینوں ایک ساتھ اور ''بے نظیر مخالف'' سمجھے جا رہے تھے۔ مگر یہ مثلث سپریم کورٹ کے پانچ ججوں کی تقرری اور انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں کے قیام کے تنازعہ پر پہلے منتشر ہوئی، پھر بکھر گئی۔ پوری قوم اس تنازعہ میں یرغمال بنی رہی اور ستر ارب روپے کا نقصان ہوا۔ حکومت اور عدلیہ کا تنازعہ وزیراعظم اور چیف جسٹس کا تنازعہ بن گیا۔ جس میں صدر چیف جسٹس کے ساتھ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

صدر اور چیف جسٹس دونوں گھر چلے گئے۔ صدر نے استعفیٰ دے دیا۔ چیف جسٹس کو سپریم کورٹ کے ۱۰ رکنی بنچ نے ہٹا دیا۔ پہلے دو رکنی بنچ نے چیف جسٹس کو اختیارات کے استعمال سے روک دیا پھر دس رکنی بنچ نے ان کی تقرری بھی غیر قانونی قرار دے دی۔

مسٹر جسٹس سجاد علی شاہ اپنے خلاف سپریم کورٹ کے فیصلہ کے روز کراچی میں تھے۔ پہلے روز ان سے رابطہ کی کوششیں ناکام رہیں۔ اگلے روز انہوں نے ملاقات کا وقت دیا۔ مسٹر جسٹس سجاد علی شاہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے ان کی میز پر ایک انگریزی اخبار کے اداریہ کے فوٹو اسٹیٹ رکھی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا ''شاہ صاحب آپ ایڈیٹوریل دیکھ رہے ہیں؟''۔

انہوں نے کہا سارے مسئلہ میں اخباروں نے صحیح رول ادا کیا ہے۔ پاکستان کے اخبارات کا کردار تاریخی ہے۔ میں نوائے وقت اور دی نیشن کا خاص طور ر ذکر کروں گا دونوں اخبارات نے عدلیہ کی آزادی قانون کی حکمرانی کو ہمیشہ سربلند رکھا ہے اور اس کے حق میں بڑی مضبوطی سے اسٹینڈ لیا ہے۔ میں دونوں اخباروں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ مجید نظامی اور عارف نظامی سے میرے قریبی تعلقات ہیں دونوں کا رول گرانقدر رہا ہے۔

☆ عام خیال ہے کہ عدالتی مفاہمت سے جس کا آپ کی طرف سے مظاہرہ کیا گیا ملک میں محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہوئی جس سے نقصان ہوا آپ اس کا کس طرح دفاع کریں گے؟

O جج کا کام انصاف کرنا ہے۔ یہ عدالتی مفاہمت نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے جس عمل کی ابتدا فیصل آباد میں افسروں کو ہتھکڑیاں لگا کر اس کی انتہا یہ ہوتی کہ پوری قوم کو ہتھکڑی لگ جاتی۔ کسی کو تو بولنا تھا۔

☆ آپ کے کچھ پرانے دوستوں سندھ کے سیاست دانوں کا خیال ہے کہ آپ شروع ہی سے باغی ہیں۔ آپ کی طبیعت میں بغاوت بھری ہوئی ہے؟

O یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ سسٹم کا باغی ہوں نہ سوسائٹی کا۔ میں نے قاعدے قانون کے تحت چلنے کی کوشش کی ہے۔ میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس کا فیصلہ میں تاریخ پر چھوڑتا ہوں۔ تاریخ خود فیصلہ کرے گی۔ تاریخ کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔

☆ اس سارے بحران کے دوران کوئی مرحلہ ایسا نہیں آیا جب آپ کو یہ مشورے دیئے گئے ہوں کہ کیوں اس تنازعہ میں پڑتے ہیں۔ مفاہمت کرلیں؟

O مجھے مستقل مشورے دیئے گئے کہ کیوں اتنا نقصان کرنے پر تلا ہوا ہوں۔ فائدے لوں۔ مراعات لوں۔ آخر مجھے ریٹائر ہونا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی ہے۔ مراعات لے لیں تو آرام سے گزرے گی۔ پاکستان کے لوگوں کی یادداشت کمزور ہے۔ لوگ اچھی اور بری دونوں باتیں بھول جاتے ہیں۔ مراعات لو۔ لوگ بھول جائیں گے۔ میں نے کہا۔ مجھے مراعات نہیں چاہئیں۔ میں نے انکار کردیا۔ مشورے دینے والے ناراض ہوگئے۔ اب تک ناراض ہیں۔

☆ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس کا کون ذمہ دار ہے۔ آپ پاکستان کے چیف جسٹس تھے۔ تاریخ میں پہلی بار ایک چیف جسٹس کو ہٹایا گیا ہے۔

O بات صاف ہے میں حکومت کے لیے ناپسندیدہ شخصیت بن گیا تھا۔ میرا وجود آئین اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو صحیح سمجھا کیا ہے۔ آئین اور قانون کے مطابق ہر کام کیا ہے۔ میرا ہر فعل ہر اقدام آئین اور قانون کے تحت ہے۔ نہ کوئی غیر قانونی کام کیا نہ کبھی کروں گا۔ جو فیصلہ چیف جسٹس کی تقرری غیر قانونی قرار دینے کا آیا ہے۔ میں اس کے خلاف پٹیشن دائر کروں گا۔ مجھے معلوم ہے ریویو پٹیشن قبول بھی ہوجاتی ہے۔ میں نے دو ریویو پٹیشن مسترد نہیں کی تھیں۔ دو آدمی بیٹھ کر چیف جسٹس کو ہٹا دیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں اپنے وکلاء غلام حسین عباسی اور عبدالحفیظ پیرزادہ سے صلاح مشورہ کر رہا ہوں۔

☆ جو فیصلہ آیا ہے وہ بنچ کی طرف سے ہے۔ کیا اس سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوگی؟

O میں اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ساری صورت حال سے عدلیہ کی آزادی کو بے پناہ نقصان ہوا ہے۔ عدلیہ کی آزادی کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے تقدس کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے سنگین نتائج نکلیں گے۔ مجھے دکھ ہوا میرے وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ کا انتظار تک نہیں کیا گیا۔ اس کے دلائل مکمل ہوئے بغیر فیصلہ دے دیا گیا۔

☆ لوگ کہتے ہیں اور مبصرین لکھ رہے ہیں کہ عدلیہ میں اکثریت آپ کے ساتھ نہیں تھی خلاف ہوگئی تھی؟

O یہ نمبر گیم ہے۔ پورے ملک کو نمبر گیم کا ٹارگٹ بنا دیا گیا ہے۔ اتنے آدمی ساتھی ہیں اتنے آدمی نہیں، اتنے ووٹ ہیں۔ یہ نمبر گیم عدلیہ میں آ گیا ہے یہ نقصان دہ ہے۔ ابھی شارٹ آرڈر آیا ہے مکمل فیصلہ نہیں آیا ہے مجھے اس کا انتظار ہے۔

☆ کیا اس تنازعہ کے دوران آپ نے اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا؟ بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ آپ کچھ آگے چلے گئے تھے۔

O آئین کے اندر رہ کر کام کرنا حدود سے تجاوز نہیں ہے۔ آئین کی دفعہ ۱۸۴ سی (۳) کے تحت یہ عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ انتظامیہ اور مقننہ کو اپنی حدود سے تجاوز سے روکیں۔ یہ عدلیہ کی آئینی ذمہ داری ہے۔ میں نے اپنی آئینی ذمہ داری پوری کی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ عزت ذلت روزی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ نہ کوئی پریشانی ہے۔ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے۔ میں نے اصولوں پر، قاعدے پر اور قانون پر نہ کبھی کمپرومائز کیا ہے نہ کبھی کروں گا۔ اصولوں پر کمپرومائز کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔ نہ میرا طریق کار ہے نہ کبھی کیا ہے۔ نہ میرے دل میں اس کا کبھی خیال آیا ہے۔ میں اپنے حال میں خوش ہوں۔

☆ کیا آپ اپنے خلاف فیصلہ کے بعد سپریم کورٹ کے بنچ پر بیٹھیں گے؟

O ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اپنے وکلاء سے مشورے لے رہا ہوں۔ قانونی مسئلہ ہے۔ اہم معاملہ ہے، فیصلہ سوچ سمجھ کر کروں گا۔ سارا معاملہ شروع سے آخر تک غلط ہوا ہے۔ کوئٹہ بنچ کا فیصلہ غیر قانونی تھا۔ ایسا کہیں ہوا ہے کہ دو بندوں نے بیٹھ کر چیف جسٹس کو نکال دیا ہو۔ عدلیہ کی تاریخ غلط اور مسخ کر دی گئی ہے۔

☆ آپ کو متنازعہ چیف جسٹس کہا جائے گا۔ آپ کو اس تنازعہ میں کیا حاصل ہوا؟

O مجھے کیا حاصل ہوا۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میرا گھر خالی ہے۔ میرے خیال میں مجھے بہت کچھ ملا ہے۔ میں نے آئین اور قانون کو سربلند رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اصولوں پر سودے بازی نہ کر کے اپنا نقصان کرایا ہے تو میں اسے اپنا فائدہ سمجھتا ہوں میں صحیح ہوں یا غلط۔ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ مگر میرا نام کمپرومائز کرنے والوں میں نہیں ہوگا۔ میں مطمئن ہوں۔ یہی اطمینان میری زندگی کا حاصل ہے۔

کاش بھٹو خاندان ایک ہو جائے

فوزیہ بھٹو

پاکستان میں فوج کے بعد سب سے زیادہ عرصہ برسرِاقتدار رہنے والا بھٹو خاندان انتشار کا شکار ہے۔ ۷۰ کلفٹن اور بلاول ہاؤس کے فاصلے بڑھ چکے ہیں۔ بے نظیر بھٹو اور غنویٰ بھٹو کی کشمکش ختم ہونے کے آثار نہیں ہیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی زندگی میں شروع ہونے والا تنازعہ برقرار ہے۔ اس تنازعہ میں مرتضیٰ بھٹو کی پہلی بیوی فوزیہ بھٹو ایک معصوم فریق ہیں جو اپنی بیٹی فاطمہ کو اپنی تحویل میں لینے کے ارادہ سے اٹلانٹک کے پرسکون ساحل سے بحیرہ عرب کے متلاطم ساحل تک پہنچی ہیں۔ گزشتہ دنوں فوزیہ بھٹو سے باتھ آئی لینڈ میں ایک خصوصی انٹرویو کیا گیا۔

سوال: آپ کے پاکستان کے دورہ کا کیا مقصد ہے؟

جواب: میں اپنی بیٹی فاطمہ سے ملنے آئی ہوں میں اس کی ماں ہوں میں اپنی بچی کے لیے ترستی رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں فاطمہ سے ملوں۔ اس سے بات کروں۔ فاطمہ میری بیٹی ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں اس سے کیسے دور رہ سکتی ہوں۔

سوال: غنویٰ بھٹو نے کہا ہے کہ آپ کے اس مشن کے سیاسی محرکات ہیں۔ بے نظیر بھٹو اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں؟

جواب: یہ غلط ہے۔ بے نظیر بھٹو کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ نہ کوئی واسطہ ہے۔ میری

بے نظیر سے ملاقاتیں ہوئی ہیں ان کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ فاطمہ نے آپ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے؟

جواب: یہ غلط ہے۔ میں فاطمہ سے اپنے پچھلے دورہ میں مل چکی ہوں۔ میں فاطمہ سے ملنے اس کے اسکول گئی تھی۔ میں جب پاکستانی بچی سے ملنے آتی ہوں۔ اس کو غائب کر دیا جاتا ہے۔ کبھی اسے ملک سے باہر بھیج دیتے ہیں کبھی شہر سے باہر۔ یہ بڑی ناانصافی ہے میں انصاف چاہتی ہوں۔ میں ایک ماں ہوں جو دکھی ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلی بار جب میں آئی تو فاطمہ کو دمشق بھیج دیا گیا تھا۔ میں جانتی ہوں ایک ماں کے لیے بیٹی کے بغیر زندگی کچھ نہیں ہے۔ یہ سیاست نہیں ہے۔ میرا کوئی مفاد نہیں ہے میں اپنی بچی کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ میری بچی کو مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ مرتضٰی ناراض ہو کر فاطمہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سالوں تک مجھے بچی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ مرتضٰی کی وطن واپسی کے بعد ہمارا رابطہ رہا۔ مرتضٰی فاطمہ کی پرورش میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ مرتضٰی کی شہادت کے بعد میں تڑپ کر بچی کے لیے آئی کہ اس سے مل لوں ایک نظر دیکھ لوں کتنی بڑی ہو گئی ہے۔

سوال: کیا آپ فاطمہ کو اپنے ساتھ امریکہ لے جانا چاہتی ہیں؟

جواب: یہ فیصلہ فاطمہ خود کرے گی۔ پاکستان اس کا وطن ہے۔ یہاں اس کے باپ کی دادا کی قبریں ہیں۔ یہاں اس کی روٹس (Roots) ہیں۔ فاطمہ کا اسکول ہے۔ سہیلیاں ہیں میں اس کو چھیننا نہیں چاہتی ہوں۔ شاہنواز بھٹو کی بیٹی بھی ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی ماں، میری بہن ریحانہ، میری طرح اسکول ٹیچر ہے۔ نہ میں نے دوسری شادی کی۔ نہ اس کا ارادہ ہے۔ نہ میری بہن نے کی ہے۔ میں مرتضٰی کا اور میری بہن شاہنواز کا غم دل سے نہیں بھلا سکی ہیں نہ کبھی بھلا سکیں گی۔ یہ غم تو زندگی بھر ساتھ رہے گا۔

سوال: آپ کیا چاہتی ہیں؟

جواب: میرا صرف ایک مسئلہ ہے۔ بھٹو خاندان ایک ہو جائے اس خاندان نے بہت سانحے دیکھے ہیں۔ اب دلوں کو ملانے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمارا مذہب ایک ہے ہمارا کلچر

ایک ہے۔ خواہ کتنی رنجشیں ہوں غلط فہمیاں ہوں ہم ایک ہو سکتے ہیں۔ میری خواہش ہے بھٹو خاندان دوبارہ متحد ہو جائے بچھڑے ہوئے قریب آ جائیں مل جائیں۔ بھٹو خاندان کے تین آدمی جدا ہو چکے ہیں۔ پہلے ذوالفقار علی بھٹو جدا ہوئے، پھر شاہنواز ہم سے بچھڑ گئے، پھر مرتضٰی روتا چھوڑ گئے۔ یہ کیا زندگی ہے یہ کیسی زندگی ہے۔

سوال: بے نظیر بھٹو سے آپ کی ملاقات کا کیا مقصد تھا؟

جواب: میں بے نظیر سے صرف اس وجہ سے ملی کہ فاطمہ کی آنٹی ہے اس کے سوا اس ملاقات کا مقصد نہیں تھا۔ میں کیا مقصد حاصل کروں گی۔

سوال: شاہنواز کی بیٹی سسی کا مرتضٰی کی بیٹی فاطمہ سے رابطہ ہے دونوں کی خط و کتابت ہوتی ہے؟

جواب: میں نے فاطمہ کے لیے بہت پیغام بھیجے مگر اسے شاید نہیں ملے۔ سسی بھٹو فیملی کی فرد ہے۔ وہ سب کو یاد کرتی ہے۔ وہ پاکستان آنا چاہتی ہے۔ اس کی امریکہ سے آمد میں کچھ مشکلات ہیں۔ سسی کا نام شاہنواز نے رکھا تھا۔ سسی ۱۵ سال کی ہوگئی ہے۔ وہ لاس اینجلس میں ٹینتھ گریڈ میں پڑھ رہی ہے۔

سوال: کیا سسی پاکستان آنا چاہتی ہے؟

جواب: سسی تو پاکستان آنے کے لیے ترس رہی ہے۔ وہ اپنے باپ کی، چچا کی، دادا کی قبروں پر حاضری دینا چاہتی ہے۔ اسے جب بھی موقع ملا ضرور آئے گی۔ اس وقت حالات کی وجہ سے اس کی آمد ممکن نہیں ہے۔

سوال: مرتضٰی بھٹو کی موت کے بعد کیا فاطمہ سے آپ کا رابطہ ہوا۔ کیونکہ غنویٰ نے سوال کیا ہے کہ آپ اتنا عرصہ کہاں رہیں؟

جواب: مجھے افسوس ہے غنویٰ نے ایسی بات کہی ہے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو جو ہی سانحہ کلفٹن رونما ہوا فاطمہ نے مجھے فون کیا کہ کوئی حادثہ ہو چکا ہے۔ فاطمہ نے روتے ہوئے کہا فائرنگ ہوئی ہے۔ پاپا ہسپتال میں ہیں۔ پھر مرتضٰی ہم سے جدا ہو گئے۔ بے رحم موت نے

ایک رحمدل انسان کو چھین لیا۔ ہماری زندگی تاریک ہوگئی۔

سوال: آپ کی غنویٰ سے ملاقات ہوئی تو کیا بات کریں گی؟

جواب: پاکستان کے پچھلے دورہ میں غنویٰ سے سرسری سی ملاقات فاطمہ کے اسکول میں ہوئی تھی۔ میں غنویٰ سے کہتی ہوں میرا تمہارا غم ایک ہے۔ آؤ بیٹھ کر ایک دوسرے کا غم بانٹیں۔ غنویٰ سمجھدار ہے۔ میں سمجھدار ہوں۔ ہمیں سمجھداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بہت نقصان ہوگیا ہے۔ غنویٰ حقائق سے بھاگ رہی ہے اسے یہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ غلط سوچ ہے۔ میں بیگم نصرت بھٹو سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں ان کے لیے فکرمند ہوں۔ ان کی صحت صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک دکھی ماں ہیں بیگم نصرت بھٹو نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ میری صنم بھٹو سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں اس سے بھی ملنے کی خواہشمند ہوں۔ میں چاہتی ہوں مجھے اپنی بیٹی فاطمہ سے ملنے دیا جائے۔ میرا یہی مسئلہ ہے۔

سوال: آپ کہتی ہیں مرتضیٰ کی بیوہ ہوں، ۷۰ کلفٹن کا موقف ہے کہ آپ کو مرتضیٰ نے طلاق دے دی تھی؟

جواب: مرتضیٰ نے مجھے ہرگز طلاق نہیں دی تھی۔ ہمارے درمیان کچھ غلط فہمی ضرور تھی، جو رفع ہوگئی تھی۔ مرتضیٰ فاطمہ کو لے گئے تھے مگر انہوں نے نہ کبھی طلاق کی بات کی نہ کبھی اپنی زبان سے طلاق کا لفظ نکالا۔ نہ کوئی دستاویز ہے نہ کوئی چیز ہے نہ میرے علم میں ہے۔ میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے نہ کروں گی۔ میں افغان شہزادی نہیں ہوں میری ماں کا شاہی خاندان سے تعلق رہا ہے میں پندرہ سال سے افغانستان نہیں گئی میں امریکہ میں سیٹل ہوں اور بچوں کو پڑھا کر میری گزر اوقات ہو رہی ہے۔ مجھے پاکستان کے سسٹم کا اندازہ ہے مگر مجھے یقین ہے مجھے انصاف ملے گا۔ میں انصاف کی تلاش میں آئی ہوں۔ میں بہت ڈری ہوئی ہوں میں ایک خوفزدہ ماں ہوں۔ ماں کا درد ماں جان سکتی ہے جو اپنی اولاد سے بچھڑ گئی ہو۔ فاطمہ کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔

خوش شکل اور خوش لباس فوزیہ بھٹو کی آنکھیں چھلک پڑیں آن واحد میں ان کی

آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ایک ماں سات سمندر پار سے اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملنے آئی ہے۔سندھی اجرک میں ہو یا مغربی اسکرٹ میں۔ ماں ماں ہے۔ یہی زندگی ہے۔ بھٹو خاندان کے مردوں کے جانے کے بعد عورتوں میں کشمکش جاری ہے۔کبھی موت رحمدل اور زندگی بے رحم نظر آتی ہے۔

اقتدار کی جنگ کی دلچسپ داستان
صدر اور وزیراعظم کی کشمکش

پاکستان میں اقتدار کی کشمکش سیاسی اور غیر سیاسی قوتوں تک محدود نہیں ہے۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان باہمی تعاون اور باہمی محاذ آرائی کی تاریخ دلچسپ ہے کبھی صدر وزیراعظم کو لاتا ہے، کبھی وزیراعظم صدر کو لاتا ہے۔ کبھی ایک جاتا ہے کبھی دوسرا کبھی دونوں جاتے ہیں شاید یہ ملک کی تقدیر ہے کہ اسے استحکام نصیب ہونا مشکل ہے۔ پاکستان میں طویل آمریت کے بعد جمہوریت کا سورج 1985ء میں طلوع ہوا۔ سندھڑی کے مسلم لیگی محمد خان جونیجو کی مختلف خوبیوں میں سے ایک ان کی منسکر المزاجی تھی۔ دبلے پتلے دراز قد جونیجو کو بے نظیر بھٹو طنزیہ ''ضیاء کا وزیراعظم'' کہتی تھیں۔ جب خود جونیجو سے اس بارے میں پوچھا جاتا تو مسکرا کر کہتے کہ ''انکو کہنے دیں''۔ سادہ مزاج اور مسکین وزیراعظم پاکستان کے اقتدار پر 1977ء سے 1988ء تک قابض رہنے والے جنرل ضیاء الحق کو برداشت نہیں ہوئے۔ ضیاء نے خود اپنے لائے ہوئے وزیراعظم کو اچانک گھر بھیج دیا۔ اپنا بنایا ہوا گھروندہ توڑنے پر جنرل ضیاء الحق 90 روز بھی زندہ نہیں رہ سکے اور ایوان صدر اور دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جنرل ضیاء الحق پاکستان کے پہلے صدر تھے جنہوں نے ایک وزیراعظم کو پھانسی دی۔ صدر اور وزیراعظم کا تنازعہ شاید اسی روز سے جڑ پکڑ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد موقر برطانوی جریدہ دی اکانومسٹ نے ٹائٹل پر جنرل ضیاء کی تصویر کے ساتھ یہ

سرخی دی we also hang our Prime Minister جس وزیراعظم نے جس فوجی افسر کو کئی افسروں پر ترجیح دے کر چیف آف آرمی اسٹاف بنایا اس نے اپنے محسن کو ہی تختہ دار تک بھیج دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے خاتمہ کے بعد سندھ سے محمد خان جونیجو کو وزیراعظم چنا گیا۔ مگر جونہی انہوں نے منتخب وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے اختیارات کا استعمال شروع کیا صدر اور وزیراعظم کی سرد جنگ شروع ہوگئی۔ افغان مسئلہ پر دونوں کا موقف الگ الگ تھا۔

جنرل ضیاء جہاد اور جونیجو سیاسی تصفیہ کے حق میں تھے۔ جینوا معاہدہ نے صدر اور وزیراعظم کے درمیان مفاہمت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ امن و امان میں ناکامی اور نااہلی کا بے بنیاد الزام لگا کر جونیجو حکومت برطرف کردی گئی۔ پیر پگارا نے کہا جونیجو نے جس روز سوچا کہ میں وزیراعظم ہوں اسے گھر بھیج دیا گیا مگر ہمیں خوشی ہے کہ سندھی وزیراعظم زندہ واپس آگیا ہے۔ شریف جونیجو نے چالاک صدر کے اقدام پر احتجاج کیا اور کہا کہ میں عوام کی عدالت میں جاؤں گا۔ عوام میرے ساتھ ہیں۔ محمد خان کو اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی حسرت لئے اللہ کی عدالت میں چلے گئے۔

عوام کی عدالت سے سرخرو بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم اس شرط پر بنایا گیا کہ جنرل ضیاء کے دیرینہ لیفٹیننٹ غلام اسحاق خان کو قائم مقام سے مستقل صدر بنا دیں گی۔ بے نظیر بھٹو اس لحاظ سے پہلی وزیراعظم تھیں جن کو ایسا صدر قبول کرنا پڑا جس نے ڈیڑھ سال بعد ان کو مسترد کر دیا۔

بینظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو فضل الٰہی چودھری کی شکل میں اپنا صدر لائے جو محض کوٹہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھا۔ بھٹو دور میں آٹھویں ترمیم نہیں تھی وزیراعظم سب کچھ تھا۔ اس وقت سیاسی جماعتوں کو تشویش تھی کہ سارے اختیارات کا مالک وزیراعظم ہے۔ طاقت کا توازن نہیں ہے۔ اس تشویش کے اظہار میں جماعت اسلامی کے

پروفیسر غفور احمد نے کہا کہ وزیر اعظم (جونیجو) ریل کے ڈبے کی طرح ہیں۔ جہاں انجن (صدر) لے جاتا ہے چلے جاتے ہیں۔ محمد خان جونیجو نے ملک سے مارشل لاء کے خاتمہ کے لئے آٹھویں ترمیم کی کڑوی گولی برداشت کی۔ یہی گولی ان کی وزارت اعظمی کے لئے بارود ثابت ہوئی۔ آئین کی دفعہ 58(2B) نے صدر کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار دے دیا تھا جس کے ذریعہ وہ جب چاہے وزیر اعظم کی چھٹی کر سکتا تھا۔ غلام اسحاق خان نے خود کو صدر بنانے والی بے نظیر بھٹو کے خلاف 1990ء میں یہ آئینی حق استعمال کیا۔ بے نظیر بھٹو کے بطور وزیر اعظم اپنے بزرگ صدر سے اچھے تعلقات رہے۔ پھر ان تعلقات میں کشیدگی آئی صدر ان کی حکومت کی کارکردگی پر تنقید کرنے لگے۔ بے نظیر حکومت کے طریق کار پر ان کو اعتراض تھا۔ مسٹر ٹین پرسینٹ کی داستانیں عام تھیں۔ بینظیر بھٹو کو ہٹا کر ان کے ایک انکل غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگراں وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کی اپنے عہدہ سے نگران کا لفظ ختم کرنے کی حسرت پوری نہیں ہو سکی۔ پنجاب سے جمہوری دور کا پہلا وزیر اعظم محمد نواز شریف کی شکل میں سامنے آیا غلام مصطفیٰ جتوئی کی اس وارننگ پر کسی نے توجہ نہیں دی کہ چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی جنم لے گا۔ پنجاب سے وزیر اعظم لا کر فیڈریشن کو خطرہ سے دوچار کر دیا گیا۔ پاکستان کا منتخب وزیر اعظم پنجاب سے آ گیا جس نے چھوٹے صوبوں کے پانی کی تقسیم اور فنانس کمیشن ایوارڈ جیسے مسائل حل کئے۔ وزیر اعظم نواز شریف اپنے صدر غلام اسحاق کے ساتھ صحیح چلتے ہوئے اچانک آٹھویں ترمیم کو صحیح ہوم ورک کے بغیر ختم کرنے کی راہ پر نکل کھڑے ہوئے۔ بے نظیر بھٹو نے گو بابا گو کا نعرہ لگایا تو نواز شریف ان کے ساتھ تھے۔ ایوان صدر کو سازشوں کا گڑھ قرار دیا گیا۔

نواز شریف نے پاکستان ٹیلی ویژن سے اسٹیبلشمینٹ کے سب سے بڑے اور آزمودہ کار نمائندہ غلام اسحاق کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ان کی اس تقریر پر آج تک واہ واہ ہوتی ہے۔ صدر نے وزیر اعظم کو برطرف کر کے قومی اسمبلی توڑ دی۔ سپریم کورٹ نے نواز

شریف کی حکومت بحال کردی مگر پاکستان کے منتخب وزیراعظم میں استعفیٰ طلب کرنے والی قوتوں کو نو کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مگر اسٹیبلشمنٹ نے ہمیشہ ''یس'' کہنے والے صدر کو بھی گھر بھیج دیا۔ اس طرح بینظیر بھٹو کے الفاظ میں ''میں نے مارگریٹ تھیچر کے مشورہ پر صدر اور وزیراعظم دونوں کو ایک ساتھ ڈمپ کردیا''۔ دونوں کی ڈمپنگ کے بعد اقتدار کا ہما ایک بار پھر ماروی میلرجی بے نظیر بھٹو کے سر پر بیٹھ گیا۔ قائم مقام صدر وسیم سجاد صدارتی امیدوار تھے۔ ان کا مقابلہ ڈیرہ غازی خان کے تمن دار سردار فاروق لغاری سے تھا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے آدمی کے حق میں فیصلہ دیا۔ سی ایس پی' آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ فاروق لغاری سیاسی اور غیر سیاسی قوتوں دونوں کے لئے قابل قبول تھا۔ وسیم سجاد کو ان کے اپنے اتحادیوں نے ''ڈچ'' کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس طرح بے نظیر بھٹو کے ''فاروق بھائی'' پاکستان کے نویں صدر بن گئے جن کو ان کی ہمشیرہ کی ہدایت ملی کہ انہیں ''محترمہ'' کے لقب سے پکاریں۔ فاروق لغاری کوئی ایک سال تک بے نظیر بھٹو کے لئے وفادار ثابت ہوئے پھر انہوں نے حکومت کی کارکردگی پر وزیراعظم کو خطوط لکھنا شروع کردیئے۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں جوں جوں ایوان صدر سے آنے والے خطوط کا انبار لگتا گیا۔ فاروق لغاری اور بے نظیر بھٹو کے فاصلے بڑھتے گئے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا معاملہ اس میں شامل ہوگیا۔ صدر کھل کر وزیراعظم اور ان کی حکومت پر تنقید کرنے لگے۔ 5 نومبر 1996ء کو فاروق لغاری نے اپنی لیڈر کو گھر بھیج دیا جو بے نظیر بھٹو کے لئے ''فاروق الحق'' بن چکے تھے۔ سردار فاروق لغاری کی ملک میں واہ واہ ہوئی کہ کرپٹ حکومت کو ختم کردیا۔ شریف فیملی نے اس اقدام کی بے حد تعریف کی۔ صدر مملکت کو مرد مجاہد قرار دیا گیا۔ تاریخی مینڈیٹ سے وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد نواز شریف اور فاروق لغاری کے تعلقات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ قوم کو اطمینان تھا کہ صدر اور وزیراعظم کے درمیان بہتر ورکنگ ریلیشن شپ قائم ہوجائے گی۔ یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ نواز شریف کے وزیراعظم بننے کے چھ ماہ کے اندر ہی ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ باقاعدہ محاذ آرائی کی شکل اختیار

کرگئی۔ وزیر اعظم کے الفاظ میں ایوان صدر ایک بار پھر منتخب حکومت کے خلاف سازشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ مگر اس بار وزیر اعظم محمد خان جونیجو تھا نہ بے نظیر بھٹو۔ وزیر اعظم کو پاکستان کی تاریخ میں سب سے بڑا مینڈیٹ ملا تھا۔ پارلیمنٹ کی قوت ان کے ساتھ تھی۔ پاکستان کی متلاطم سیاسی تاریخ میں پہلی بار وزیر اعظم نے صدر کو گھر بھیج دیا تھا۔ نواز شریف تو رائے ونڈ نہیں گئے البتہ سردار فاروق لغاری چوٹی پہنچ گئے۔ اقتدار کی چوٹی سے زمین کی گہرائی تک کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

عجیب وغریب شہر، کراچی

ملیر کے کوارٹر کے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر فرش پر گولیوں کے نشان اور خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ سسکیوں اور آہوں کے پس منظر میں ایک خاتون سر پر سفید دوپٹہ اوڑھے اندر نکلیں تعزیت کرنے والوں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ان کی رندھی ہوئی آواز ابھری "مجھے صرف یہی اطمینان ہے کہ انہوں نے میرے بیٹے کی جان میری نظروں کے سامنے لی ہے۔ اغوا کر کے لے جاتے تو خدا جانے کیا کرتے آنکھیں نکال دیتے، جسم میں سوراخ کر دیتے، معلوم نہیں لاش بھی ملتی یا نہیں، اس کی تو آواز تک نہیں نکلی۔ بندوق چلنے کی آواز سن کر میں بھاگ کے آئی تو میرا بیٹا بہت دور جا چکا تھا"۔

خاتون سے تعزیت کرنے والے آدمی صرف تین تھے ایک ایسے علاقے میں جہاں اگر کسی ضعیف آدمی کا بھی انتقال ہو جائے تو سینکڑوں افراد جنازے اور سوئم میں شریک ہوتے تھے آج الطاف حسین، بے نظیر بھٹو، آفاق احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، آزاد بن حیدر، معراج محمد خان، سردار شیر باز مزاری، حلیم صدیقی، سلیم ضیا کا وہی کراچی کتنا بدل گیا ہے۔

بحیرہ عرب کے ساحل سے ملیر کے ریگستان تک کراچی نے طویل سفر طے کیا ہے اس سفر میں جہاں بھارت سے پاکستان بننے پر پیدل سرزمین پاک پہنچنے والے عبدالقدیر خان نے سائنسدان بن کر پاکستان کا ایٹمی طاقت بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہیں بے شمار

قلاش لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے۔ سائیکل پر اخبار فروخت کرنے والے نیوز پیپر ایمپائر کے مالک ہیں، ایک منجن فروش ملک کے دس بڑے صنعت کاروں میں سے ایک اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مالک ہے کسی زمانے میں کراچی کی فٹ پاتھوں پر سونے والے آج ملک کے سب سے بڑے شہر کے ان بڑے بلڈرز میں شامل ہیں جن کے پاس موبائل فون پر ہیلو کہنے کا وقت نہیں ہے۔ پی پی پی، ایم کیو ایم، مسلم لیگ کے نمائندے ان کی جیب میں ہوتے ہیں۔ اسی شہر میں بلڈنگوں کے مالک 8۔اے کی خستہ حال بسوں میں سفر کرتے ہیں کروڑ پتی بیوپاری ویگن میں پچاس پیسے کے لیے کنڈیکٹر سے پٹائی تک گوارا کر لیتا ہے۔ یہ کراچی ہے عجیب وغریب شہر یہاں کوئی بھوکا اٹھتا تو ضرور ہوگا سوتا نہیں ہوگا جہاں مزدور معاشی بدحالی کے باوجود حلوہ پوری کا ناشتہ کرتا ہے۔ ڈش انٹینا کے ذریعہ کچی آبادی میں بھارت کی ثقافتی یلغار دیکھتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ وزیر تجارت اسحاق ڈار نے پیاز پانچ روپے کلو برآمد کرنے کی اجازت کیوں دی جس سے کراچی میں پیاز ۲۵ روپے کلو ہوگئی یہ مزدور جو کبھی کوہستان کے پہاڑوں سے آتا ہے تو کبھی چولستان کے صحراؤں سے، ہمیشہ کل کی فکر میں رہتا ہے۔

الطاف حسین اور آفاق احمد نے ان نوجوانوں کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے جو روزگار کی تلاش میں دور دور سے یہاں آتے ہیں کراچی کا مستقبل ان کو اپنے مستقبل کی طرح تاریک نظر آتا ہے۔ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ کراچی ڈوب رہا ہے کراچی کے ساتھ آخر یہ کیا ہوا ہے۔ آفاق احمد کے ملیر سے الطاف حسین کے لیاقت آباد تک۔

اس عورت کا چہرہ اب تک دیکھنے والوں کو یاد ہے جس نے لیاقت آباد نمبر دس پر ایک رکشہ والے کے قتل پر ماتم کیا تھا برقع پوش عورت اپنی بیمار بیٹی کو عباسی شہید ہسپتال سے گھر لانا چاہتی تھی کراچی کے حالات خراب تھے کوئی رکشہ ڈرائیور آنے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ بوڑھی عورت منت سماجت کر رہی تھی رکشہ ڈرائیور لڑکا آگے بڑھا اور بولا "اماں مجھے مار دیں گے مگر میں تمہیں لے جاؤں گا تمہاری بیٹی بیمار ہے"۔

عورت نے بڑے اعتماد سے کہا ''نہیں بیٹا سب ایک جیسے نہیں ہیں تجھے کوئی نہیں مارے گا میں تیرے ساتھ ہوں یہ سب میرے بچے ہیں مجھے خالہ کہتے ہیں''۔

مگر رکشہ ڈرائیور کی بات صحیح نکلی خالہ کا اندازہ اپنے بھانجوں کے بارے میں غلط تھا۔ خالہ اور اس کی بیمار بیٹی رکشہ سے اپنا سامان اتارنے نہیں پائی تھیں کہ دو ٹی ٹی برداروں نے رکشہ ڈرائیور کا بھیجہ اڑا دیا تھا۔

یہ عبدالستار ایدھی کا کراچی ہے جہاں اب تڑپتے زخمیوں کو دیکھ کر کار والے شیشے چڑھا لیتے ہیں۔ رینجرز ''ہماری ڈیوٹی نہیں ہے'' کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں پولیس والے زخمیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا ڈکیتی ڈال رہے تھے۔

کراچی کو کیا ہوگیا ہے؟ سیاستدان بیوروکریٹس اور ماہرین ہر دور میں نئے نئے نسخے تلاش کر کے لاتے ہیں جب بے نظیر بھٹو کی حکومت ہو تو یہ ماہرین خبردار کرتے ہیں کہ ایم کیو ایم کو حکومت میں شامل کیے بغیر امن قائم نہیں ہوگا۔ مسلم لیگ کے دور میں ایم کیو ایم کے ڈیڑھ سال تک حکومت میں رہنے کے بعد وزیر اعظم نواز شریف نیویارک براستہ لندن لاہور واپسی پر اعلان کرتے ہیں کہ ''متحدہ کے بغیر کراچی میں امن ممکن نہیں ہے''۔

حکومت مختلف ہے الفاظ وہی ہیں۔

کسی بھی سیاستدان سے پوچھیں کہ اس مسئلہ کا کیا حل ہے۔ تو وہ سوال کرے گا کہ اگر حالات خراب ہیں تو کراچی میں اتنے فلائی اوور کیوں بن رہے ہیں۔ پیزا ہٹ، کے۔ ایف۔ سی کے بعد میکڈونلڈ کے آؤٹ لیٹ کیوں کھل رہے ہیں میریٹ، شیریٹن، پرل کانٹی نینٹل میں مہمانوں کو قطار میں لگنا پڑتا ہے۔ بوفے لنچ اور ڈنر پر محسوس ہوتا ہے کہ لاٹھی چارج کی نوبت آجائے گی بڑے بڑے بیوروکریٹس بچوں کے لیے برگرز کی ٹرے تھامے کلفٹن اور ڈیفنس کے آؤٹ لیٹ پر رات گئے تک نظر آتے ہیں۔ بوٹ بیسن پر رات تین بجے دن ہوتا ہے۔ کار پہنچنے نہیں پاتی ہے کہ بیروں کا غول اسے گھیر لیتا ہے ''صاحب'' چکن کڑاہی شورمہ، فالودہ، آئس کریم، صاحب پان'' شہریوں کا کاروں سے

نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہی رونق شراب کی دکانوں پر نظر آئے گی شام سے رات تک بھیڑ ہوتی ہے یہ حکومت مے نوشی کے فروغ میں بے نظیر بھٹو کی حکومت پر بازی لے گئی ہے کراچی میں 40 نئے مے خانے کھولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیاقت جتوئی کے خیال میں شراب عام ہو گئی تو ٹینشن کم ہو جائے گی۔ مسلم لیگ کے مسلم لیڈروں کی سفارش پر غیر مسلم ارکان اسمبلی کو شراب کے بے دریغ لائسنس دیئے گئے جہاں سے مسلم مے خوار اندھا دھند شراب خرید رہے ہیں مارشل لاء ہو یا جمہوریت کراچی میں شراب کی مانگ کبھی کم نہیں ہوتی مارشل لاء میں چھپ کر پینے والے جمہوریت میں ڈٹ کر پیتے ہیں۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے پولیس والے رشوت کے لیے راہگیروں کے منہ سونگھتے اور نشے میں لہراتی کار کے ڈرائیور کے لیے راستہ بناتے پائے جاتے ہیں۔

مے نوشوں کی نظر میں جن میں تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کے اکابرین شامل ہیں کراچی کے حالات اس وجہ سے خراب ہوئے کہ جنرل ضیاء الحق نے عشرت کدے بند کر دیئے اور مے خانوں پر تالے ڈال دیئے۔ اس سے برائی جو محدود تھی پورے شہر میں پھیل گئی گلشن اقبال، گلستان جوہر، ڈیفنس، کلفٹن، صدر کون سی جگہ ہے جہاں پارٹیاں نہیں ہوتی ہیں؟ ایس ایچ او کو رشوت نہ ملے تو فحش حرکات کے الزام میں پکڑے گا اسی رات افسر کی ہدایت پر رہا کر دے گا۔

نہ غداری مستقل نہ وفاداری

''غدار کون، وفادار کون'' پاکستان کی متلاطم سیاست میں یہ بحث کبھی ختم نہیں ہوگی جب سیاستدان حکومت میں ہوتے ہیں سارے مخالفین غدار نظر آتے ہیں۔ جب حکومت سے نکالے جاتے ہیں وہی غدار ملک کے وفادار نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کو جپھیاں ڈالنے لگتے ہیں۔ پی پی پی دور کے وزیر قانون بیرسٹر اعتزاز احسن اس طرز عمل کی بہترین مثال ہیں۔ جب بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت تھی، نواز شریف نے الزام لگایا کہ بھارت کے خلاف جدوجہد کرنے والوں سکھوں کی فہرستیں اعتزاز احسن کے ذریعہ بھارت کے حوالے کردی گئی ہیں۔ پورے ملک میں طوفان برپا ہو گیا۔ اعتزاز احسن کی طرف سے انکار کو کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ معاملہ اس وقت ختم ہوا جب بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوئی۔ یہی غدار اعتزاز احسن اب ''محب وطن'' نواز شریف کے وکیل ہیں۔ بلکہ ان کی وکالت باقاعدہ طور پر شروع تک نہیں ہوئی کہ خود مسلم لیگ کے لیڈروں میں یہ بحث چل نکلی ہے کہ نواز شریف سے کارگل کے مسئلہ پر دھماکہ خیز بیان اعتزاز احسن نے دلوایا ہے۔ کوئی دور کی کوڑی لایا ہے کہ اس میں درپردہ متحدہ قومی موومنٹ کے ڈاکٹر فاروق ستار کا ہاتھ ہے۔ دونوں تردید کر رہے ہیں۔ مگر اس ملک میں تردید بیک پیج پر جگہ پاتی ہے۔ اس پر توجہ کون دیتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اس ملک میں جو اپنے قیام کی نصف صدی مکمل کر چکا ہے یہ

تنازعہ کب طے ہوگا کہ کون ملک کا وفادار ہے کون نہیں؟

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے پھانسی پانے والے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے یہ تنازعہ شروع ہوا جنہوں نے معاہدہ تاشقند کی مخالفت کر کے سیاست میں اپنا سفر شروع کیا۔ وہ اپنی تقریروں میں یہی کہتے تھے کہ تاشقند کی بلی تھیلے سے نکالوں گا۔ اس کی نوبت نہیں آئی۔ قوم کو کبھی حقیقت معلوم نہیں ہوسکی۔ مشرقی پاکستان کا المیہ ہوا جسے اسکول کی کتابوں میں چند سطروں میں سمیٹ دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان اور بھارت کی جنگ ہوئی اور بنگلہ دیش بن گیا۔ سیکنڈری اسکولوں کے بچوں کو بھی اس عظیم سانحہ کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا گیا۔ جو نسل اس وقت اسکولوں میں تھی اس کو یہی بتایا گیا کہ جنرل نیازی شیر ہے، شیر کبھی ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ پاکستانی شیر نے بھارتی گیدڑوں کے سامنے ہتھیار ڈالے، اسلامی تاریخ مسخ ہوگئی۔ یہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے جسے شاید کارگل کے ذریعہ کھولنے کی کوشش کی گئی تھی جس کو اب مہم جوئی قرار دیا جارہا ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے کسی کردار کو بے نقاب نہیں کیا گیا۔ عام پاکستانی اس بات پر مطمئن ہوگیا کہ ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کو تاریخ نے سزا دے دی۔ تینوں غیر فطری انجام سے دوچار ہوئے۔

تاریخ کے فیصلے بڑے بے رحم ہوتے ہیں مگر اصل واقعات کیا تھے؟ کیوں یہ سانحہ ہوا؟ کس کا کیا کردار تھا؟ اس پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ آہنی پردہ روس میں نہیں پاکستان میں ہے۔ اس سازش کا سویلین کردار تو پھانسی چڑھ گیا مگر کسی باوردی بندے کو ایک منٹ کے لیے کسی عدالت نے نہ طلب کیا نہ سزا دی۔ جنرل نیازی جو خود کو ''ٹائیگر'' کہلوانا پسند کرتے تھے، بھارت کی قید سے واپس آئے تو کراچی کے علاقہ ناظم آباد میں لاکھوں شہری ان کا خطاب سننے کے لیے امڈ پڑے مگر ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'' کہتے ہوئے گھروں کو واپس چلے گئے۔ اتنے بڑے سانحہ پر قوم سوگئی۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اسلام آباد کی فائلوں کی دنیا میں دفن ہوگئی۔ کسی میں یہ جاننے کی ہمت نہ تھی کہ کیا ہوا تھا؟ فوٹو

اسٹیٹ کے زمانہ میں یہ مضحکہ خیز دعوے کیے گئے کہ رپورٹ کی ایک ہی کاپی تھی، رپورٹ کہاں گئی؟ یہ راز ہے۔ خود ریٹائرڈ ائر مارشل اصغر خان کے مطابق اس سانحہ کے دوران جب وہ ایک بار ملتان گئے اور تقریر کی کوشش کی کہ مشرقی پاکستان کے مسئلہ کا سیاسی حل نکالا جائے تو لوگوں نے ان پر نفرت سے تھوک دیا۔ ان کی نظروں میں وہ غدار تھے۔ پھر اس ''غدار'' نے بھٹو کی خلاف پی این اے کی تحریک چلائی۔ ساری قوم ''راشا راشا، اصغر راشا'' کے نعرے کے آگے جھوم رہی تھی۔ اصغر خان کا پاکستان کا حکمران بننے کا خواب مارشل لاء کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بھٹو کی حکومت کا ان کے اپنے مقرر کردہ مسکین اور مرنجاں مرنج آرمی چیف جنرل محمد ضیاء الحق نے تختہ الٹ دیا۔ مگر جب یہی بھٹو پاکستانی جنگی قیدیوں اور پاکستانی علاقہ کی واپسی کا معاہدہ کرنے شملہ گئے جماعت اسلامی سے لے کر نیپ تک سب کے سب لیڈروں نے ان کو رخصت کیا۔ بھٹو خالی ہاتھ گئے تھے مگر خالی ہاتھ واپس نہیں آئے۔ اس کارنامے کو ان کے مخالفین تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ آزاد کشمیر کے ایک متنازعہ مجاہد اول نے جو ہر حکمران کو وہ بندوق کئی بار پیش کر چکے ہیں جس کے ذریعہ کشمیر میں بھارتی راج کے خلاف پہلی گولی چلائی گئی، بھٹو پر کشمیر کے سودے کا الزام عائد کیا۔ پی این اے کی تحریک میں جو پرتشدد تحریک تھی، اس الزام کی بازگشت سنائی گئی۔ پھر مجاہد اول نے خود تسلیم کیا کہ کشمیر کا شملہ میں کوئی سودا نہیں ہوا تھا، یہ الزام سیاسی سٹنٹ تھا۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے بھٹو کو ہٹایا، ان کو ایک سیاسی مخالف کے قتل کی سازش کے الزام میں پھانسی دی گئی۔ بھٹو کو قاتل اور خائن قرار دے دیا گیا۔ بھٹو کو گڑھی خدا بخش میں دفن کر دیا گیا، نہ پہاڑ روئے نہ دریائے سندھ سرخ ہوا۔ تیسری دنیا کا لیڈر خاموشی سے دوسری دنیا میں چلا گیا۔ مگر بھٹو کی پھانسی کے ۲۰ سال بعد بھی کراچی کے لیاقت آباد، پنجاب کے فیصل آباد میں بے شمار لوگ ایسے مل جائیں گے جو یہ کہنے میں پس و پیش نہیں کریں گے کہ بھٹو غدار تھے، بھٹو کے مخالفین کو یہ کریڈٹ دینا چاہیے کہ ان کے پروپیگنڈہ کا ہتھیار اتنا مضبوط تھا کہ قوم آج تک ان کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔

اس قوم نے ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کا نیا روپ دیکھا، کرکٹ میچ دیکھنے بھارت جا رہے ہیں جسے کرکٹ ڈپلومیسی کا نام دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق غیر مقبول تھے، بھارت کو یہ بات پسند تھی۔ بھارتی سیاستدان اور دانشوران کی انکساری سے متاثر ہو کر واپس جاتے، انڈین ایکٹر شتروگھن سہنا اپنی فیملی کے ساتھ آرمی ہاؤس میں ٹھہرتا تھا۔ اس کے بچے جنرل ضیاء کو ''دادا'' کہتے تھے۔ کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا، جنرل ضیاء الحق آرمی چیف تھے۔ ان کی حب الوطنی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ شروع میں بھٹو کے مخالف سیاستدان ان کے گرد جمع ہوئے۔ جماعت اسلامی، پی ڈی پی، جمعیت علماء اسلام مارشل لاء کی بی ٹیم بننے پر آمادہ ہوگئیں۔ پیپلز پارٹی کے جیالے ''غدار'' اور انڈین ایجنٹ تھے۔ سیاسی جماعتوں کو رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ جنرل ضیاء الحق کے اقتدار کا کھیل لمبا ہو رہا ہے۔ ۷۰ کلفٹن میں بیگم نصرت بھٹو کی سربراہی میں سیاستدانوں کا ایک اجلاس ہوا۔ ولی خان، شیر باز مزاری، نوابزادہ نصر اللہ خان، غوث بخش بزنجو، ملک قاسم سب شریک تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی غدار سے محب وطن بن گئی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں ایم آر ڈی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے سابق پی این اے کے لیڈروں کے جانے کے بعد روتے ہوئے کہا ''آج میں نے بھٹو کے قاتلوں سے ہاتھ ملا لیا'' بھٹو کے مخالف اب جنرل ضیاء الحق کے مخالف بن گئے تھے۔ ان میں مجاہد اول سردار قیوم شامل ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ان کو ائرپورٹ سے مسلم لیگی لیڈر زین نورانی نے اغوا کرلیا۔ حکومت کی ایماء پر مجاہد اول نے جہاد جمہوریت سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ ایم آر ڈی کی تحریک ہائی جیک ہوگئی۔ کراچی کے نوجوان سلام اللہ ٹیپو نے پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرلیا۔ اس نے ایک فوجی افسر طارق رحیم کو مار دیا۔ بھٹو کے بیٹے مرتضیٰ اور شاہنواز اس ہائی جیکنگ کے پیچھے تھے جنہوں نے الذوالفقار تنظیم کو دنیا میں متعارف کرایا۔ دنیا دنگ رہ گئی، یہ کیا ہوگیا؟ جنرل ضیاء الحق کو پہلی بار پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ۵۴ قیدی پاکستان کی جیلوں سے رہا کر کے دمشق پہنچا دیئے گئے۔ پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی سیاست شروع ہوگئی۔ بم کے دھماکے

اور قتل کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ حکومت کو ہر واردات میں ''الذوالفقار'' کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ ''را'' پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اس دور میں پنجاب کے مرد آہن غلام مصطفیٰ کھر نے بھارت سے مدد طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ ''میں بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر واپس آؤں گا'' جنرل ضیاء کی حکومت نے کہا ''کھر غدار ہے، انڈین ایجنٹ ہے'' وہی کھر پھر پاکستان کے وفاقی وزیر کا حلف اٹھا رہے تھے۔ پاکستان میں نہ غداری مستقل ہے نہ وفاداری مستقل ہے۔ بزرگ سندھی سیاستدان جی ایم سید کو ہمیشہ غدار کہا گیا اور سمجھا گیا۔ جنرل ضیاء الحق ان سے گھنٹوں مذاکرات کرتے تھے۔ خود جی ایم سید کہتے تھے ہم جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہیں، ہم پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں، اس کا بھی یہی مشن ہے۔ ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ بے نظیر بھٹو کے دور میں جی ایم سید کو رہا کرنے کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ جی ایم سید نے ساری سیاست نظر بندی میں کی۔ وہ پاکستان کے اعلانیہ مخالف تھے، اب ان کے پوتے اور بیٹے گاڑیوں پر پاکستان کا جھنڈا لگا کر سفر کرتے ہیں، یہ بھی سیاست ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی حکومت جن کو ''غدار'' اور ''دہشت گرد'' کہتی تھی، ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں عوام دوست کے نام سے منتخب ہو گئے۔ پی پی پی کی سیاسی قوت کا فوجی حکومت کو اس وقت اندازہ ہوا جب کئی بلدیاتی کونسلوں نے بھٹو کے لیے تعزیتی قرار دادیں منظور کیں۔ عدالتی فیصلہ کے باوجود بھٹو اپنے حامیوں کی نظر میں قاتل نہیں ہیرو تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے بھانپ لیا کہ تاریخ کا رخ کیا ہے؟ انہوں نے کہا الیکشن اس وقت کراؤں گا جب مثبت نتائج کا یقین ہوگا۔ صرف محب وطن جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت ہوگی۔ اشارہ واضح تھا پی پی پی، اے این پی، پی این پی جیسی جماعتیں محب وطن نہیں ہیں۔ محب وطن جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے مختلف دھڑے تھے۔ سندھ کے طاقتور سیاستدان پیر پگاڑو نے بھٹو کو ہمیشہ غدار سمجھا۔ جنرل ضیاء الحق نے ان کے مرید محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم بنا دیا۔ جونیجو نے کسی کو غدار نہیں کہا۔ سیاسی آدمی تھے بے نظیر بھٹو کی

طویل جلا وطنی سے واپسی میں رکاوٹ نہیں ڈالی، بے نظیر نے کہا ہم چاہتے تو چھاؤنیوں پر قبضہ کر سکتے تھے، ہم محبِ وطن ہیں۔ عوام ہمارے ساتھ ہیں، وہی فوج جو شاید پی پی کا چیپٹر کلوز کر چکی تھی، اپنے آرمی چیف کی ہلاکت کے بعد بے نظیر بھٹو کو اقتدار سونپنے پر آمادہ ہوگئی۔

پاکستان میں بہت سے لوگوں کے لیے جنرل ضیاء الحق کے طیارے کا حادثہ ایک مسٹری ہے۔ اعجاز الحق اور ہمایوں اختر امریکی محکمہ دفاع تک گئے مگر اس راز کو کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کوئی کے جی بی، کوئی را، کوئی الذوالفقار کا اب تک نام لیتا ہے۔ کوئی یقین سے دعویٰ کرتا ہے کہ سی آئی اے کا آپریشن تھا۔ جنرل ضیاء افغان مسئلہ پر امریکہ کے ساتھ ''یوٹرن'' لینے کو آمادہ نہ تھے۔ یہ فیصلہ ان کو مہنگا پڑا ہوگا۔ وہ سیاستدان نہیں تھے ''یوٹرن'' لینا ان کے لیے آسان نہ تھا۔ سیاستدانوں کے لیے بہت آسان ہے، پاکستان کی سیاست کے دو کردار بزرگ ولی خان اور جوان الطاف حسین اس کریکٹر کی نمائندگی کرتے ہیں جسے مصلحت پسندی کہا جا سکتا ہے۔

ولی خان کو پنجاب میں مقبول ہونے کی حسرت رہی۔ اہل پنجاب نے ان کو کبھی محبِ وطن نہیں سمجھا، ان کی وفاداری پر شک کیا۔ ان کے والد غفار خان کو کبھی محبِ وطن نہیں گردانا جو کہتے تھے میں ''جناح'' کے پاکستان کو نہیں مانتا۔ پنجاب کے قلب لاہور سے جنرل ضیاء الحق کی سرپرستی میں سیاسی افق پر ابھرنے والے نواز شریف نے چارسدہ کے ولی خان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہ اتحاد دس سال تک رہا جسے سندھ اور بلوچستان میں پنجاب اور سرحد کا اتحاد سمجھا گیا۔

عطاء اللہ مینگل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''ولی خان نواز شریف کے ساتھ مل کر کھاتے، ہمارے ساتھ مل کر روتے ہیں'' عدالتی بحران میں نواز شریف رو پڑے۔ تجربہ اور بصیرت دونوں کی کمی تھی۔ ولی خان نے گلے لگایا، آنسو پونچھے۔ نواز شریف نے اس شخص کو اپنا استاد قرار دے دیا جسے پنجاب نے کبھی صحیح تسلیم نہیں کیا مگر جب

کالا باغ ڈیم اور پختونخواہ کا مسئلہ اٹھا تو نواز شریف اپنی راہ جدا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ولی خان نے اپنے نظریات کبھی نہیں بدلے مگر نواز شریف نے اپنے خیالات تبدیل کر لیے تھے۔ یہی معاملہ الطاف حسین کا ہے۔ پہلے بے نظیر بھٹو نے آصف زرداری کے ساتھ عزیز آباد جا کر ایم کیو ایم کے قائد کو الطاف بھائی کہا۔ الطاف حسین نے جواب میں آصف زرداری کو دولہا بھائی بنا لیا۔ ۳۱ نکاتی معاہدہ پی پی پی اور ایم کیو ایم میں طے پا گیا۔ یہ معاہدہ سی او پی کی نذر ہو گیا۔ اب نواز شریف کی الطاف حسین کو بھائی بنانے کی باری تھی۔ عزیز آباد میں دونوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا یہ بھائیوں کا اتحاد ہے۔ الطاف نواز بھائی بھائی کے نعرے کی پورے کراچی میں گونج تھی۔ نواز شریف کے دور میں کراچی میں آپریشن ہوا۔ وزیر اعظم نے اپنے اتحادی کے خلاف کریک ڈاؤن کا حکم دے دیا۔ یہی روایت اپنے دوسرے دور میں برقرار رکھی۔ ایم کیو ایم کے وزراء دہشت گردی کے مقدمات میں مطلوب اور مفرور تھے۔ نواز شریف نے سندھ میں اپنی حکومت کی قربانی دی۔ یہ ان کی حکومت کی مکمل قربانی کی ابتدا تھی۔

بے نظیر بھٹو نے اس لحاظ سے نواز شریف سے مختلف نہیں کیا کہ ایم کیو ایم کے ساتھ طویل مذاکرات کیے پھر اس کو دہشت گرد اور چوہے کہا۔ بے نظیر بھٹو، نواز شریف دونوں کو یقین ہے کہ کراچی کے دہشت گردوں کو بھارت میں تربیت ملتی ہے مگر خود کارگل کے واقعہ پر نواز شریف کے اٹک جیل میں انکشاف نے ان کے حامیوں، مخالفوں سب کو ششدر کر دیا۔ پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والے وزیر اعظم نے کہا مجھے کارگل آپریشن سے بے خبر رکھا گیا۔ یہی الزام بھارت کے وزیر دفاع نے کارگل بحران کے دوران لگایا تو نواز حکومت نے تردید کی تھی۔ وہی نواز شریف جنہوں نے بے نظیر بھٹو کو پاکستان کے لیے ''سکیورٹی رسک'' قرار دیا تھا۔ بھارتی لیڈروں کو کشمیری مجاہدین کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے الزام کی تردید تک نہیں کر سکے۔ نواز شریف سیاست میں ہلچل مچانے کے قائل ہیں۔ جب اپوزیشن لیڈر تھے تو بے نظیر حکومت میں نیلا بٹ میں

انکشاف کیا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے۔ حکومت پریشان ہوگئی۔ ایک امریکی میگزین نے نواز شریف کی فوٹو کے اوپر سرخی لگائی (Demolition Man) پاکستان میں ڈیمولیشن مین کی کمی نہیں ہے۔ پاکستان کے نئے مردِ آہن جنرل پرویز مشرف سے کراچی میں ایک نوجوان نے پوچھا ''کیا طالبان کلچر کو سرحد پر روکا نہیں جائے گا جس سے پاکستان کو نقصان پہنچ رہا ہے''۔ انہوں نے کہا ''ہم افغانستان کے پختونوں کے ساتھ ہیں، خواہ حکمت یار کی شکل میں ہوں یا طالبان کی'' یہ موقف صحیح ہے۔ جنرل ضیاء کا ورثہ جنرل مشرف تک برقرار ہے مگر ایک تاریخی حقیقت نظر انداز نہ کی جائے۔ بی بی سی کے مطابق افغان جنگ کے وقت پاکستان میں پانچ ہزار افراد افیون استعمال کرتے تھے۔ اب منشیات کے عادی افراد کی تعداد پچاس لاکھ ہے۔ کیا کھویا کیا پایا، فیصلہ مشکل نہیں ہے۔ یہ غداری ہے یا حب الوطنی؟ فیصلہ قوم کرے گی۔ کیا پاکستان میں ٹرتھ کمیشن کے قیام کی ضرورت نہیں ہے تاکہ قوم اندھیرے سے نکل سکے جو اس کا مقدر بن گیا ہے۔

کراچی میں ''مین ہیٹن'' بنانے کی سازش

پاکستان کے ساحلی شہر اور کمرشل کیپٹل کراچی کو ہانگ کانگ بنانے کی اسکیم خاموشی سے دم توڑ گئی۔ اب نیا دور ہے نئے تقاضے ہیں۔ کراچی میں نیویارک کے مین ہیٹن کی طرز پر اسکائی لائن بنانے کی سکیم پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا خواب سابق مرد اول آصف علی زرداری نے اپنی بیگم کے دور حکومت میں دیکھا کہ کراچی کے ساحل پر مین ہیٹن بنایا جائے۔ اس خواب کا خیال ان کو یوں آیا کہ کلفٹن بوٹ بیسن کے قریب سمندر سے ملحق مائی کلاچی روڈ پر ڈھائی سو ایکڑ کے لگ بھگ اراضی برسوں سے خالی پڑی تھی۔ اس اراضی کے کئی دعویدار تھے۔ کے پی ٹی اس زمین پر اپنا دعویٰ جتا رہی تھی، کے پی ٹی جیت گئی، افسران کامیاب ہو گئے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے ساتھ ہی آصف علی زرداری کا خواب ڈھیر ہو گیا۔ مین ہیٹن کا خواب ادھورا رہ گیا۔ اب یہ خواب کے پی ٹی کے افسروں نے پورا کرنے کی ٹھانی ہے۔

کے پی ٹی کے افسروں کی ایسوسی ایشن کو اس قیمتی زمین پر چار سو رہائشی پلاٹس الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔ ہر پلاٹ کی مارکیٹ ویلیو ۵۰ لاکھ سے ایک کروڑ روپے کے درمیان ہے۔ مگر حکام کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک سو ایکڑ کا ایریا الگ کر لیا گیا ہے جس پر کمرشل پلازے اور مارکیٹیں تعمیر کی جائیں گی۔ اس طرح یہ ایریا اربوں روپے مالیت کا ہے جس پر پلازے بن گئے تو افسروں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

یہ زمین کے پی ٹی کے افسروں کی ایسوسی ایشن کو قرعہ اندازی کے ذریعہ الاٹ کی جائے گی۔ جس کے لیے افسروں سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ اس مرحلہ پر اعتراض کا پہلو یہ اٹھایا جا رہا ہے کہ کے پی ٹی افسروں کو رہائشی مقاصد کے لیے پلاٹ کیوں الاٹ کر دیے گئے۔ اگرچہ یہ بڑی اچھی بات ہے، ان کو اپنے گھر بنانے کا حق حاصل ہے مگر کمرشل پلاٹس الاٹ کرنے کا جواز نہیں ہے۔ اس سے مسائل جنم لیں گے۔

مائی کلاچی کا اوپن ایریا بھیڑ بھاڑ سے مستقبل کا بولٹن مارکیٹ اور صدر بن جائے گا۔ اس سے ماحول کے لیے آلودگی کے باعث خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مائی کلاچی کے نام پر کراچی کا نام پڑا ہے۔ قدیم شہر کی ماہی گیر عورت تھی جو روایت کے مطابق اپنے سات بیٹوں کو بچانے نکلی تھی جن کو ایک وہیل مچھلی نگل گئی تھی، مائی کلاچی طوفان میں گھر گئی تھی مگر اس وہیل کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئی جو اس کے بیٹوں کو نگل گئی تھی۔

بلوچوں کی ایک اور روایت کے تحت سات بیٹوں کی قبریں قدیم علاقہ میں اب تک موجود ہیں۔ مائی کلاچی بہادر عورت تھی۔ بے نظیر بھٹو جب حکومت میں تھیں، کراچی کے باغیوں سے نمٹنے کے لیے یہی کہتی تھی میں مائی کلاچی کی طرح کراچی کی بیٹی ہوں۔ اس شہر کا، پاکستان کا دفاع کروں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کراچی کو جتنا خطرہ بلڈرز سے ہے اتنا تحریکیں چلانے والے سیاستدانوں سے نہیں ہے۔ مگر مائی کلاچی کی اراضی کا بچاؤ ضروری ہے۔ یہ کراچی کا مستقبل ہے پاکستان کا مستقبل ہے۔ اندھا دھند کمرشلائزیشن کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔ کراچی کا ساحل پہلے ہی گندہ، آلودہ، خراب اور خطرناک ہو رہا ہے۔ سمندر کے ساتھ کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں جس سے خوبصورت ساحل چھپ گیا ہے۔ کنکریٹ کے فلیٹوں نے سمندر کی جھاگوں کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے۔ کمرشلائزیشن سے بلڈرز کو یہ فائدہ ہوا کہ چند سالوں میں ۵ لاکھ روپے کا فلیٹ ۶۵ لاکھ سے ۹۵ لاکھ روپے تک کا ہو گیا ہے۔ اس سے ساحل کا حسن ماند پڑ گیا، مجروح ہو گیا، مسخ ہو گیا۔

سی ویو سے بوٹ بیسن تک کراچی کے ساحل کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یہ ایک طویل

کہانی ہے۔ ساحل تباہ ہو گیا کسی نے آنسو تک نہیں بہایا۔ کلفٹن کے ساحل پر پاور فل ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی نے وسیع قلعہ اراضی سمندر کو کاٹ کر نکال لیا جس سے افسروں کے لیے رہائشی اور تجارتی پلاٹ نکالے جائیں گے۔ ساحل خراب ہوا تو کیا ہوا، کیا فرق پڑتا ہے؟

سی ویو پر گھوڑے اور اونٹ چند سو گز کے بعد رک جاتے ہیں۔ سمندر میں پتھروں کی دیوار کھینچ دی گئی ہے جو کچھ سی ویو کے ساتھ ہوا اس سے ساحل خطرناک ہو گیا ہے، ایک سو کے لگ بھگ شہری طوفانی موجوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ سمندر ختم ہوا، ساحل مجروح ہوا، اور انسانوں کو خطرہ لاحق ہوا ہے۔ ماہرین ساحل سمندر کو کاٹ کر آبادیاں قائم کرنے کے عمل کو سنگین جرم قرار دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کراچی کو عالمی معیار کا شہر بنانے کی غرض سے یہاں مین ہیٹن طرز کی عمارتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کراچی کا ساحل ختم ہو جائے گا تو سمندری طوفان نہ صرف ان نئی آبادیوں کو تباہ کر دے گا بلکہ یہ آبادیاں سمندری طوفان کو شہر میں داخل ہونے کے لیے راستے بھی ہموار کر دیں گی۔ مین ہیٹن کے حامی ماہرین کا کہنا ہے کہ نئی پوش آبادیوں سے ساحل سمندر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ہی سمندری طوفانوں کا خدشہ ہے۔ دنیا بھر میں ساحل سمندر پر قائم آبادیاں نہ صرف سمندر کی خوبصورتی بڑھاتی ہیں بلکہ انہیں بہترین تفریح گاہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان آبادیوں سے کراچی کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

کراچی کے ساحل کے علاوہ مکران کے ساحل پر بھی نئی آبادیاں قائم کرنے کی تجویز سامنے آ رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ مکران کوسٹل روڈ پراجیکٹ کی تعمیر کے بعد بلوچستان میں بھی اعلیٰ طرز کی ساحلی آبادیاں قائم کی جائیں گی جس سے تعمیر و ترقی کے نئے راستے کھلیں گے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید طرز کی عمارتیں اور آبادیاں کسی بھی شہر کے حسن میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں لیکن اس بات کو دلیل بنا کر شہر کے قدرتی حسن کو تباہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ کراچی کا ساحل بھی ایک ایسی ہی قدرتی جگہ ہے جسے تباہ کرنا کراچی کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

پاکستان میں سیاسی دھڑے بندیاں

پاکستان میں سیاسی دھڑے بندی کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ کسی سیاسی رہنما کو اپنی قیادت سے ذرا بھی اختلاف ہو تو وہ غصے میں آ کر اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ ایک الگ دھڑا بنا لیتا ہے۔ موجودہ ملکی صورتحال میں نئے نئے دھڑے سامنے آ رہے ہیں۔ ۳۱ مسلم لیگی نواز شریف کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں جنہوں نے ان کی قیادت کو چیلنج کیا ہے۔ اس دھڑے کے روحِ رواں میاں اظہر، اعجاز الحق، خورشید محمود قصوری اور فخر امام ہیں۔ یہ نواز شریف کے خلاف ان کے دورِ اقتدار میں ہی بغاوت کرنے کے اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اس سے سیاستدانوں، حکمرانوں اور اخبار نویسوں کے لیے مسئلہ پیدا ہوگا کہ اس دھڑے کو کیا نام دیا جائے۔ نواز شریف اور ان کی اہلیہ آسانی سے اسے غدار گروپ قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس کا نام ضروری ہے۔

مسلم لیگ میں دھڑوں کے نام الگ الگ ہیں۔ نواز شریف کی مسلم لیگ (ن) ہے۔ پیر پگاڑو کی زیرِ قیادت گروپ مسلم لیگ (فنکشنل) ہے۔ پیر پگاڑو پر جب کوئی ست روی کا الزام عائد کرتا ہے وہ اطمینان سے جواب دیتے ہیں۔ فکر مت کرو، میں فنکشنل ہونے والا ہوں۔ بزرگ سیاستدان خواجہ خیر الدین پیر پگاڑو کے ساتھ تھے جنہوں نے ان سے الگ ہو کر مسلم لیگ (خیر الدین گروپ) بنا لیا تھا۔ یہ گروپ جنرل ضیاء الحق کے خلاف تھا۔ پیر پگاڑو کا گروپ حکومت کے ساتھ تھا۔ خواجہ خیر الدین نے اپنا گروپ اشتعال میں

بنایا کنگری ہاؤس میں جب خواجہ خیر الدین پیر پگاڑو سے ملنے گئے تو مسلم لیگی رہنما اور پاکستان کی پہلی خاتون شپ بریکر بیگم سلمٰی احمد ان کے ساتھ تھیں۔ ان کو دیکھ کر پیر پگاڑو نے اپنے مزاج کے مطابق ایسا فقرہ چست کیا کہ خواجہ صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا گروپ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ خواجہ خیر الدین محمد حسین چٹھہ کے قریبی ساتھی تھے چٹھہ فیملی کے حامد ناصر اب مسلم لیگ (چٹھہ گروپ) کے سربراہ ہیں۔ حامد ناصر چٹھہ بے نظیر بھٹو اور نصر اللہ خان کے ساتھ گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس میں ہیں۔ بے نظیر بھٹو نے چٹھہ کو ہمیشہ اہمیت دی۔ ان کے آدمی منظور وٹو کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنایا۔ وٹو اپنا گروپ مسلم لیگ (جناح) کے پلیٹ فارم سے بنا کر اپنی بقا کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ (جناح) کو مسلم لیگ (ج) لکھا جا سکتا ہے تو مسلم لیگ (چٹھہ) (چ) کہلا سکتی ہے۔ مسلم لیگ (ق) مسلم لیگ (قیوم گروپ) جس کو کراچی میں پرانے سیاسی کارکن خان امان اللہ چلا رہے ہیں۔ سیاستدانوں کی آل پارٹیز کانفرنسوں میں ان کے دم سے بڑی رونق ہے۔ ایک اور مسلم لیگ (ق) ملک قاسم گروپ ہے۔ جس کے قائد راولپنڈی کے متنازعہ لیڈر کبیر علی واسطی مختلف سیاسی اتحادوں میں شامل رہے ہیں۔ پہلے ملک محمد قاسم کے ساتھ تھے ان سے علیحدہ ہو کر اپنا گروپ بنا لیا۔ ملک قاسم کے دیرینہ ساتھی علی اشرف خان اور سید محمد آغا فیصلہ نہیں کر پائے کہ کیا کریں۔ اب کبیر علی واسطی کو ان کی مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر میر داد خان نے نکال دیا ہے، جس نے واسطی کو نیا دھڑا بنانے کا موقع مل سکتا ہے۔ جو مسلم لیگ (و) ہو سکتا ہے۔ ہوتی گروپ کسی زمانہ میں بڑا سرگرم تھا۔ مسلم لیگ کنونشن اور کونسل جنرل ضیاء الحق کے دور میں اس مسلم لیگ میں ضم ہو گئی، جس کے سربراہ محمد خان جونیجو تھے۔ فدا محمد خان کا اپنا گروپ تھا۔ مسلم لیگ گروپوں اور دھڑوں کے معاملہ میں بڑی زرخیز ہے۔ کلثوم نواز نے مسلم لیگ میں انتخابات کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مسلم لیگ مشرف لیگ بن جائے گی۔ اس طرح سے مسلم لیگ (مشرف گروپ) خارج از امکان نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے صاف کہہ دیا گیا ہے کہ نواز شریف کی پاکستان کی

سیاست میں اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیا مسلم لیگ (ن) نواز شریف کے بغیر سیاست کرے گی؟ پھر اس کا نام کیا ہوگا؟ اسے مسلم لیگ (ک۔ن) کلثوم نواز سمجھا جائے گا۔ مسلم لیگ میں اس لحاظ سے بارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے واقعہ کے نتیجہ میں کئی دھڑے بن سکتے ہیں پاکستان پیپلز پارٹی کو جنرل ضیاء الحق کے آنے کے بعد جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا مسلم لیگ انہی سے دوچار ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی قید اور سزا کے بعد سب سے پہلے کوثر نیازی گروپ بنانے کے لیے سرگرم ہوئے۔ پروگریسیو پیپلز پارٹی بنائی یہ پارٹی فوجی حکومت کے ساتھ تھی جس سے جیالے نفرت کرتے تھے۔ پھر غلام مصطفیٰ جتوئی نے بے نظیر بھٹو سے اپنی راہ علیحدہ کی تو نیشنل پیپلز پارٹی بنائی۔ پیپلز پارٹی کا نام برقرار رکھا۔ یہ پارٹی اقتدار لے سکی نہ پی پی پی کا متبادل بن سکی۔ اگرچہ غلام مصطفیٰ کھر، ایس ایم ظفر، حامد رضا گیلانی، کمال اظفر، پیر آفتاب رانی پور جیسے نام جتوئی کے ساتھ تھے۔ ضیا عباس ہی جتوئی کے ساتھ رہ گئے ہیں۔ باقی جتوئی فیملی ہے۔ مصطفیٰ کھر اور کمال اظفر بے نظیر بھٹو سے معافی مانگ کر واپس چلے گئے مگر بے نظیر کے ناراض اور بھائی مرتضیٰ بھٹو نے اپنی زندگی ہی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو زرداری گروپ قرار دے دیا۔ اس لحاظ سے ان کے لیے پی پی (زیڈ) بن گئی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے پی پی پی (شہید بھٹو) گروپ بنایا جو (ش ب) کہلاتا ہے۔ اب ان کی بیوی غنویٰ بھٹو اور ان کے ساتھی یہ اصرار کرتے ہیں کہ اصل پیپلز پارٹی وہی ہیں پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو گروپ بنانے کی لاہور کے کچھ رہنماؤں نے کوشش کی، مگر حمایت حاصل نہیں کر سکے۔

... پی پی پی کے معاملہ میں یہ تاثر صحیح ہے کہ عوام اور ورکرز بے نظیر بھٹو کے علاوہ کسی کو لیڈر ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ خواہ کتنے ہی گروپ بن جائیں، یہی معاملہ شریف فیملی کا ہے ... اعجاز الحق، میاں اظہر، طارق عزیز، فخر امام کی کوششوں کے باوجود عوام شریف فیملی کو صحیح مسلم لیگ سمجھتے ...

... کے معاملہ میں مذہبی جماعتیں دونوں بڑی جماعتوں سے پیچھے نہیں

ہیں۔ جمعیت علماء پاکستان کا نورانی گروپ جس کے قائد مولانا شاہ احمد نورانی ہیں سب سے بڑا ہے، جس کو صحیح اور نمائندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی حیثیت تسلیم ہے جن کے ساتھ اکثریت ہے۔ جمعیت علماء اسلام کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ جمعیت علماء اسلام کا مولانا فضل الرحمٰن کی زیر قیادت سرگرم فعال اور تسلیم شدہ ہے۔ پاکستان کے اندر اور باہر ان کو مانا جاتا ہے۔ جمعیت علماء اسلام کے سمیع الحق اور مولانا اجمل گروپس ہیں۔ مولانا اجمل نے شہباز شریف کی وزارت اعلیٰ کے لیے پیر پگاڑو سے مذاکرات کیے تھے۔ مگر یہ تجویز بارہ اکتوبر کی کارروائی کی نذر ہوگئی۔ پی ڈی پی اور تحریک استقلال کو مخالفین طنز سے ''تانگہ پارٹیاں'' کہتے ہیں ان میں بڑی پارٹیوں کی طرح گروپ نہیں ہیں۔ چاروں صوبوں کے عوام نوابزادہ نصر اللہ اور اصغر خان کی بالترتیب بزرگ اور ناکام قیادت میں متحد ہیں۔ فوجی جب ریٹائر ہو کر سیاست میں آتے ہیں زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ائر مارشل اصغر خان اس کی قدیم اور جنرل مرزا اسلم بیگ اس کی جدید مثال ہیں۔ مزدور کسان پارٹی کے صدر فتح یاب علی خان اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی پارٹی کے دھڑے نہیں ہیں۔ عمران خان اور فاروق لغاری اب تک تحریک انصاف اور ملت پارٹی کو دھڑوں سے پاک رکھنے میں کامیاب ہیں۔ مخالفین کہتے ہیں کہ دونوں کے پاس اتنے بندے نہیں کہ گروپ بنا سکیں۔

کراچی کے مہاجر قوم پرست دھڑے بندیوں سے محفوظ نہیں ہیں، جب متحدہ قومی موومنٹ مہاجر قومی موومنٹ تھی ایم کیو ایم (الطاف) اور ایم کیو ایم (حقیقی آفاق احمد) میں بٹی ہوئی تھی۔

بے نظیر بھٹو جب وزیر اعظم تھیں، ایم کیو ایم کو الطاف گروپ کہتی تھیں۔ ایم کیو ایم کے متحدہ قومی موومنٹ بننے سے یہ مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ اب نائن زیرو متحدہ قومی موومنٹ ہے۔ لانڈھی مہاجر قومی موومنٹ ہے، مہاجروں کا الطاف حسین کے پاس مینڈیٹ ہے۔ کچھ علاقے آفاق احمد کے سیاسی کنٹرول میں ہیں جن کو ماضی میں ''نو گو ایریا'' کہا

جاتا تھا۔ کراچی کے اربن مسائل کو لے کر کھڑے ہونے والے حسین حقانی کے اربن ڈیمو کریٹک فرنٹ میں بھی بہت سے گروپ بن چکے ہیں۔

قومی محاذ آزادی سے پی پی پھر پی پی سے مسلم لیگ میں جانے والے علمدار حیدر پی پی پی کے شیخ علاؤ الدین کے ساتھ الگ ہوگئے جو کراچی شہری تحریک چلا رہے ہیں۔ اس طرح سندھی قوم پرستوں کے گروپ بنے ہوئے ہیں۔ ایک دھڑے کو جی ایم سید کا خاندان سنبھال رہا ہے۔ ترقی پسند قادر مگسی کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ بلوچ قوم پرست مینگل بگٹی اور حیّ میں بٹے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں، مذہبی جماعتوں سب میں دھڑے ہیں۔ جماعت اسلامی واحد جماعت ہے جو گروپنگ سے آزاد ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ریفرنڈم کے دوران ایک ایسا مرحلہ آیا جب امیر میاں طفیل اور نائب امیر پروفیسر غفور احمد کی راہیں الگ تھیں۔ میاں طفیل نے ریفرنڈم میں ووٹ ڈالا۔ پروفیسر غفور احمد نے کہا کہ میں چھٹی پر ہوں، جماعت اسلامی میں ''بغاوت'' اس طرح ہوتی ہے، متوالوں اور جیالوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اپنی قیادت کے خلاف بغاوت در بغاوت کا عمل جاری نہیں رکھنا چاہیے یہ جمہوریت کے منافی طرز عمل ہے۔

پاکستان کے بزرگ سیاستدان
کیا یہ کبھی ریٹائر بھی ہوں گے؟

پاکستان کے بزرگ سیاستدان، سیاست سے کب ریٹائر ہوں گے؟ جب کسی سیاستدان کا بایوڈیٹا منظر عام پر آتا ہے، یہ مطالبہ اٹھ جاتا ہے۔ بعض سیاستدان سیاست سے ایسے چمٹے ہیں کہ الگ ہونے کا نام تک نہیں لیتے۔ ایسے ہی سیاستدانوں کا ذکر کرتے ہوئے سندھ کے ایک سابق مرد آہن ممتاز بھٹو نے ایک نجی محفل میں کہا ''میں نہیں چاہتا کہ سیاست میں اتنا عرصہ رہوں کہ لوگ ریٹائرمنٹ کا مطالبہ کرنے لگیں اور ضعیفی اتنی ہو جائے کہ لوگ پلنگ پر ڈال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائیں۔ میں اس معذوری کے آنے سے پہلے ریٹائر ہونے کو ترجیح دوں گا''۔

ایک سیاستدان کے منہ سے یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی سیاست میں کوئی ریٹائر نہیں ہوتا حالانکہ بعض پاکستانی سیاستدان ۷۰ اور ۸۰ سال کی عمر کو پہنچے ہوئے ہیں مگر ریٹائر ہونے کے نام نہیں لیتے۔ کسی سیاستدان نے اب تک با عزت طریقہ سے ریٹائر ہونے کی مثال قائم نہیں کی ہے۔ اکا دکا نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا مگر باقاعدگی سے بیان بازی کرتے ہیں۔ کوئی کسی مسئلہ پر ان کی رائے جاننے پر اصرار کرے تو پہلے معذرت کرتے ہیں کہ میں ریٹائر ہو گیا ہوں، پھر ردعمل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کی اولادیں تک سیاست میں آگئی ہیں، ان کی جگہ لے لی ہے

لیکن سیاست میں اپنی جگہ پر رہنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

اس وقت بزرگ سیاستدانوں کی جو لاٹ ہے اس میں ولی خان بھی نمایاں ہیں۔ ولی خان نے زمانہ کا گرم سرد دیکھا ہے۔ خود پاکستان بنتے دیکھا ہے۔ جمہوریت کو قائم ہوتے پروان چڑھتے اور بکھرتے دیکھا۔ پی این اے کے اتحاد کی جیل سے رہنمائی کی، ایم آر ڈی میں سرگرم رہے۔ عین تحریک کے وقت ان کی پارٹی قرارداد بنوں کو لے کر تحریک سے الگ ہوگئی۔ صوبہ سرحد میں پرامن سیاست پر عمل کرتے رہے اور جگہ مخالفت کرتے رہے۔ سیاست میں ولی خان کا اپنا اسٹائل ہے۔ ولی خان عدالتی بحران کے دوران جب اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف بڑی مشکل میں تھے ان کی مدد کو آئے۔ نواز شریف ولی باغ گئے ولی خان کو اپنا استاد قرار دیا۔ استاد کے مشورہ سے شاگرد سجاد علی شاہ سے تو بچ گیا اپنے لائے ہوئے چیف آف آرمی اسٹاف سے نہیں بچ سکا۔

ولی خان کی پارٹی اے این پی فوجی حکومت آنے پر نیوٹرل ہوگئی۔ ولی باغ میں خاموشی چھا گئی جمہوریت کے دعوے کاغذی ثابت ہوئے۔ ان کے بیٹے اسفند یار ولی اور اہلیہ نسیم ولی نے مزاحمت کا ابتدا میں عندیہ دیا مگر پھر اعظم ہوتی کے خلاف احتساب کے مقدمات آڑے آگئے۔ اس وقت ولی خان عملی طور پر قصہ پارینہ بن چکے ہیں مگر عملی ریٹائرمنٹ سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ ولی خان کے حامی ان کو سچا اور اصولی سیاستدان کہتے ہیں۔ مخالف مصلحت پرست کہتے ہیں۔

ولی خان کی پارٹی نے جمہوریت میں اس وقت کی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے جب معاملہ آمریت کا آیا تو خاموش ہو کر ہتھیار رکھ دیئے۔ جنرل ضیاء کی آمریت میں جب کسی نے ولی خان سے پوچھا "ہتھیار آپ کا زیور ہے، آپ کی پارٹی کا زیور ہے۔ آپ نے فوجی آمریت کے خلاف کبھی مسلح جدوجہد کیوں نہیں کی؟"

انہوں نے جواب دیا "حضور میں پٹھانوں کا لیڈر ہوں، میرا کام پٹھانوں کی لاشیں گرانا نہیں ان کی جانیں بچانا ہے"۔ اس سیاست سے ولی خان کو فائدہ ہوا۔ جنرل

ضیاء الحق کے سیاسی فرزند نواز شریف سے ان کا اتحاد برسوں قائم رہا۔ اے این پی کو لاہور میں وقتی طور پر قبول کرلیا گیا جس سے اس کو سیاسی فائدہ ہوا۔ غیر سیاسی فائدے پشاور میں ہوئے جن کے اثرات سے اب تک پارٹی نہیں نکل سکی ہے۔ پختون خواہ کے مسئلہ پر جب بات آگے بڑھی تو نواز شریف نے اپنے بزرگوں کی بات مانی۔ مسلم لیگ اور اے این پی کی راہیں پھر جدا ہوگئیں۔

ولی خان اے این پی میں کسی ایگزیکٹو عہدہ پر نہیں۔ ان کو ''رہبر'' کا عہدہ دے دیا گیا ہے جس کے ذریعہ اے این پی کی سیاسی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے نوابزادہ نصر اللہ خان ان سے مختلف ہیں جو پی ڈی پی کے صدر ہیں۔ مختلف جماعتوں کے اتحاد ''جی ڈی اے'' کے سربراہ ہیں۔ نوابزادہ کی اتحادوں سے دلچسپی آمریت جمہوریت ہر دور میں برقرار رہتی ہے۔ ان کو ''بابائے مذاکرات'' کہا جاتا ہے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان سیاست میں اتنے سینئر ہوگئے ہیں کہ بات چیت قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں سے شروع کرتے ہیں پھر ایوب خان، یحییٰ خان، بھٹو، جنرل ضیاء الحق، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پر لاکر ختم کرتے ہیں۔ اس بزرگی کے باوجود ان کا حافظہ بلا کا ہے، اشعار موقع کی مناسبت سے کہتے ہیں گفتگو بہت اچھی اور دلچسپ کرتے ہیں۔ ان کا سیاست سے ریٹائر ہونے کا ارادہ نہیں ہے نہ شاید ان کے مداح ان کو اس کی اجازت دیں گے۔ ان کے حامی کہتے ہیں یہ جب سرگرم ہوں تو سمجھ لیں کہ ڈکٹیٹر کی شامت آنے والی ہے کوئی حکومت جانے والی ہے۔ بھٹو کے خلاف نوابزادہ نے پی این اے کی تحریک چلائی پھر جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں شامل ہوگئے۔ اس کا اندازہ ان کو نہیں تھا کہ یہ غلطی ان کو بہت مہنگی پڑے گی۔ پی ڈی پی کے سربراہ اپنے دفاع میں کہتے ہیں ''جنرل ضیاء الحق سے الیکشن کے وعدہ پر عمل کرانے کے لیے فوجی حکومت میں گئے تھے''۔ اس اپروچ سے نقصان ہوا، لوگ جمہوری تحریکوں سے عاجز آگئے۔ سیاستدانوں کے مخالفین یہ کہنے لگے کہ سیاستدان اقتدار میں آنے کے لیے تحریکیں چلاتے ہیں۔ پھر نوابزادہ کچھ عرصہ اقتدار سے دور رہے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت

آئی تو کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بن گئے۔ اس حیثیت میں انہوں نے بے شمار غیر ملکی دورے کیے جن پر ان کے مخالفین نے کڑی نکتہ چینی کی۔ ان کو موقع پرست اور مفاد پرست قرار دے دیا۔ جب بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت ختم ہوئی تو نوابزادہ نصراللہ خان نے جی ڈی اے کے پلیٹ فارم سے سیاسی جماعتوں کو متحد کیا۔ جی ڈی اے کے تحت نواز حکومت کے خلاف ''نواز ہٹاؤ، ملک بچاؤ'' کے ایک نکاتی ایجنڈہ پر تحریک شروع کی گئی۔ نوابزادہ نے کراچی میں مرزا ہاؤس کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا جو اپنی ضعیفی اور بیماری کے باوجود سیاسی طور پر سرگرم رہے۔ مگر اتنی سرگرمیوں کے باوجود خود ان کے حامی تک یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ بزرگ سیاستدان سیاست سے کب ریٹائر ہوں گے؟ اپنی جگہ کب خالی کریں گے؟ بہت سے لوگوں کے خیال میں اس رویہ سے نوجوان سیاست دان مایوس ہو رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا لیڈر شپ سنبھالنے کا کبھی موقع نہیں آئے گا۔

سندھ کے لیڈروں میں فرق یہ ہے کہ اپنی نوجوان اولادوں کو آگے لانے میں تامل سے کام نہیں لیتے۔ ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی اپنے بیٹوں کو سیاست کی پرخار اور ناپسندیدہ وادی میں لا چکے ہیں۔ امیر بخش بھٹو اور مرتضیٰ جتوئی خاموشی سے اپنے والدین کو سیاست کے داؤ پیچ سے نبرد آزما دیکھتے ہیں۔ اب یہ سیاست کی کشش ہے کہ بیگم نصرت بھٹو ایک ایسی دردناک کیفیت میں بھی جس میں ہوش و حواس کھو چکی ہیں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکی ہیں سیاست سے ریٹائرمنٹ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نہ ان کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو ان کو ریٹائر ہونے دیں گی یہ المیہ ہے سیاست کا۔

سردار شیر باز مزاری نے یہ نوبت نہیں آنے دی اور خود ریٹائرڈ ہو گئے۔ ان سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرے تو معذرت کر لیتے ہیں کہ سیاست سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ مجھے معاف کریں۔ سردار شیر باز مزاری نے سیاست کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی دوست تھے مگر اصولوں کی بات آئی تو ان کے خلاف کھڑے ہونے میں پس و پیش نہیں کیا۔ بھٹو کی بیٹی نے ان کو پرکشش ''آفر'' کی جو شکریہ

کے ساتھ مسترد کر دی۔ جنرل ضیاء الحق ان کے کلاس فیلو جنرل فضل حق کے ذریعہ پاور شیئرنگ میں شریک کرنا چاہتے تھے مگر وہ بھی ان کی ''نو'' کو ''یس'' میں تبدیل کرنے میں ناکام رہے۔ وہ اپنے بھائی بلخ شیر مزاری سے مختلف ہیں جو حکومت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے دینے کے خلاف ہیں۔

حروں کے روحانی پیشوا پیر پگارا بزرگ سیاستدانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جو جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنا چھوٹا بھائی کہتے ہیں مگر پیر پگارو نے خود اپنا دامن کبھی اقتدار میں براہ راست شرکت سے آلودہ نہیں کیا۔ اپنے مرید محمد خان جونیجو کو پاکستان کا وزیر اعظم بنوادیا۔ ایک مرید غوث علی شاہ کو سندھ کا اقتدار دلوادیا۔ مگر جب ان دونوں نے غلطیاں کیں تو پیر صاحب نے ان سے نظریں پھیر لیں۔ محمد خان جونیجو کے لئے کہا ''خود کو سچ مچ کا وزیر اعظم سمجھنے لگا تھا اس لئے گھر بھیج دیا گیا''۔

پیر پگارو کی سیاست کی یہ خوبی ہے کہ حکومت میں رہ کر اپوزیشن کے اور اپوزیشن میں رہ کر حکومت کے مزے لوٹتے ہیں۔ اس لئے مخالفین اور حامیوں دونوں کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔

تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خان اتنے خوش قسمت نہیں کہ وہ اپنے مخالفین کا ٹارگٹ بنے رہتے ہیں جو ان کو ریٹائر ہو کر گھر میں بیٹھا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ نہ ان کا منشور پڑھیں گے نہ ان کو ووٹ دیں گے۔ سیاست ان کے لئے ذاتی طور پر گھاٹے کا سودا رہے گی۔

بلوچ سردار عطاء اللہ مینگل کے لئے یہ گھاٹے کا سودا اب نہیں ہے ان کے صاحبزادے اختر مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ سردار عطاء اللہ پھر سرگرم ہو گئے ہیں جو ''پونم'' کے پلیٹ فارم کو موثر طور استعمال کر رہے ہیں۔ نسوانی نام کے اس اتحاد کو قد آور شخصیات مل گئی ہیں۔

بزرگ سیاستدانوں کی ریٹائرمنٹ کے متمنی رہنما اور کارکن ابھی تک اس مخمصے

میں ہیں کہ ایک سیاستدان کی سیاسی زندگی کتنی ہونی چاہیے۔ اس کی ریٹائرمنٹ اس کی جسمانی عمر کے اعتبار سے ہونی چاہیے یا اس کی سیاسی زندگی کے حوالے سے بھی ماہرین اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک سیاستدان کو اس وقت ریٹائر ہو جانا چاہیے جب اس کی صحت بالخصوص ذہنی صحت مشکوک ہو جائے۔

پاکستان کے یہ بزرگ سیاست دان خواہ ضعیف ہو جائیں یا کمزور، ان کا وجود اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ سیاست میں وضع داری کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نفسا نفسی کے دور میں یہی غنیمت ہے۔

کرپشن کے سمندر میں قوم ڈوب رہی ہے

کیا پاکستانی قوم سر سے پاؤں تک کرپشن کی دلدل میں دھنس نہیں چکی؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک پاکستانی کو اپنی پیدائش اور موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے بدعنوانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ زندہ ہے تب بھی اور مر چکا ہے تب بھی کرپشن اس کا تعاقب کرتی ہے۔ صورتحال واقعی اس قدر سنگین ہو چکی ہے کہ آج ہر پاکستانی کو قدم قدم پر کرپشن کا سامنا ہے۔

کیا پاکستانی قوم سر سے پاؤں تک کرپشن میں ڈوبی ہوئی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک پاکستانی پیدائش کے سرٹیفکیٹ، اسکول میں داخلہ، ہسپتال میں علاج، امتحان، شناختی کارڈ کے حصول، ملازمت پانے سے بل کے ادا کرنے، شادی کرنے، کرایہ ادا کرنے، پاسپورٹ برائے سفر کرنے سے زندگی گزارنے تک ایسے نذر نذرانے دینے پڑتے ہیں۔ پاکستان کا اس مکروہ پریس کی بدولت کیا حشر ہو رہا ہے کبھی ملک سب سے کرپٹ ملکوں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے تو کبھی تیسرے نمبر پر، سیاستدان جب اقتدار میں آتے ہیں۔ ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ مغربی ادارہ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے جب اقتدار سے نکلتے ہیں اپنے مخالف حکمرانوں کو اس رپورٹ کی بنیاد پر کرپٹ قرار دیتے ہیں۔ اس ملک میں کرپشن اتنی تیزی سے امربیل کی طرح پھیلی ہے کہ فیصلہ مشکل ہو گیا ہے کہ کون کرپٹ ہے کون کرپٹ نہیں ہے۔

کرپشن طرز زندگی بن گئی ہے پاکستان کا گرین پاسپورٹ فخر کے بجائے شرمندگی کی علامت بن گیا ہے۔ پاکستانی بزرگوں کی داڑھیاں چیک کی جاتی ہے تو عورتوں مردوں کے جسم کا کوئی حصہ چیکنگ سے محفوظ نہیں رہتا۔ پاکستانی جسم کے ہر حصہ میں ہیروئن رکھنے، نگلنے، چھپانے کے ماہر ہیں۔ کئی پیٹ میں ہیروئن کے کیپسول پھٹنے سے مر چکے ہیں ایک پورا خاندان پیٹ میں ہیروئن لے جاتے ہوئے سعودی عرب میں پکڑا گیا۔ بمشکل سزائے موت سے بچا۔ پاکستانیوں کے سعودی عرب میں سر قلم ہوتے ہیں۔ اس میں قاتل ہی نہیں اسمگلر بھی ہوتے ہیں۔ اسمگلنگ پاکستانی کی متوازی معیشت بن چکی ہے۔ اسمگلروں کو مذہبی رہنماؤں تک کی حمایت حاصل ہے۔ حکومت خود کالے دھن کو سفید کرنے کی اسکیم پر نیک نیتی سے عمل کر رہی ہے۔ کرپٹ آدمی اسمگلر نادہندہ اور مجرم معاشرہ کا باعزت آدمی ہے۔ وی آئی پی ہے اسے سرکاری تقریبات میں پہلی صف میں جگہ ملتی ہے حکمران بیوروکریٹس پولیس افسران تک اس سے ڈرتے ہیں۔ قانون کا کوئی ڈر نہیں ہے کوئی خوف نہیں ہے جو آتا ہے کرپشن کے دریا میں بہہ جاتا ہے فوجی سویلین کسی کی قید نہیں ہے، کوئی حکومت جمہوریت کی بحالی کے بعد سے اپنے اقتدار کے ۳۷ ماہ مکمل نہیں کر سکی۔ محمد خان جونیجو کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دو بار اقتدار میں آئے دونوں پاپولر ہیں دونوں کی حکومتیں کرپٹ تھیں۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف نواز دور میں کرپشن کے ایک کیس کا فیصلہ آ گیا۔ ان کے شوہر آصف علی زرداری کے خلاف چار سال سے کرپشن کے مقدمات زیر سماعت ہیں۔ سیاستدانوں پر کیا موقوف ملک کے بعض ججوں پر بریف کیس لینے کے الزامات لگے ہیں۔ بعض غلط حلف نامے داخل کر کے ایک سے زائد پلاٹ حاصل کر چکے ہیں۔ علماء کثیر المنزلہ بلڈنگوں اور کمرشل پلازوں کے مالک ہیں۔ ناجائز تعمیرات کی سرپرستی کرنے والے مذہبی رہنماؤں کی کمی نہیں ہے۔ مساجد تک ایسی جگہوں پر بنائی گئی ہیں جو متنازعہ ہیں۔ سیاستدانوں کا حال یہ ہے کہ جو کرپٹ نہیں ہیں سیاست میں کسی قابل ذکر مقام کے مالک نہیں ہیں۔ ان کو عام طور پر نااہل اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔

طویل آمریت کے بعد ۱۹۸۵ء میں جمہوریت بحال ہوئی تو سیاستدان اقتدار میں آ گئے۔ محمد خان جونیجو کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف اقتدار میں آئے۔ دونوں نے معیشت کا برا حال کر دیا۔ بے نظیر بھٹو نے جیالوں کو نواز شریف نے متوالوں کو نوازا۔ دونوں نے اس اعتراض کی پرواہ نہیں کی کہ اپنے عزیزوں کو اقتدار سے دور رکھو۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے شوہر آصف علی زرداری کو سرمایہ کاری کا وزیر مقرر کیا ان کے خلاف ہر طرح کے الزامات لگے۔ بے نظیر بھٹو کے ساتھی تک ان کو ''مسٹر ٹین پرسینٹ'' کہنے لگے تھے۔ ہر پروجیکٹ میں آصف زرداری کا نام لیا جاتا۔ خواہ پاور پروجیکٹس ہوں یا ہاؤسنگ پروجیکٹس۔ آصف زرداری اب تک خود کو ''مسٹر کلین'' ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ جب بے نظیر بھٹو سے ان کے اقتدار کے دنوں میں ان کے بہی خواہ یہ کہتے تھے کہ اپنے شوہر کو پاور گیم سے دور رکھیں تو ان کے دفاع میں کہتی تھیں آصف منتخب رکن ہیں وزارت ان کا حق ہے۔ ہماری پارٹی کی حکومت ہے، اب وزیر نہیں بنیں گے تو کب بنیں گے۔

انہی الفاظ کی بازگشت نواز شریف کے قدر دانوں کو اس وقت سنائی دی جب ان کو یہ مشورہ دیا گیا کہ اپنی حکومت کے دور میں شریف فیملی کو کاروبار سے دور رکھیں۔ میاں نواز شریف نے کہا ہم کاروباری لوگ ہیں اپنے کاروبار کو کیوں نہ وسعت دیں۔ اسی طرح شہباز شریف کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ نہ بنانے کا مشورہ مسترد کر دیا گیا۔ شریف فیملی کی بزنس ایمپائر کو بڑھانے اور شہباز شریف کو پنجاب کا اقتدار سونپنے کا فیصلہ آخر میں مہنگا پڑا۔ اس فیصلہ کے تحت شریف فیملی نے بھارت کو چینی فروخت کی، بھارت کو ۱۱ روپے کلو چینی بیچ کر پاکستان کے عوام سے فی کلو ۹ روپے ربیٹ وصول کیا گیا۔ نواز شریف کے خلاف اب چینی کا اسکینڈل تیار کر لیا گیا ہے۔ نواز شریف کے خلاف کئی اور کرپشن کے مقدمات تیار کیے جا رہے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کیس میں ان کو ۱۴ سال قید بامشقت دے کر کسی عوامی عہدہ کے لیے ۲۱ سال کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا ہے۔ اس نااہلی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان کا طاقتور وزیر اعظم کہلانے والا سیاستدان جو یہ کہتا تھا کہ پیپلز پارٹی کا نام سن کر میرا خون

کھول اٹھتا ہے، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ بے نظیر کو سیاسی سیٹ اپ میں رکھنا ضروری ہے۔ وہی بے نظیر جس کے لیے نواز شریف نے ہمیشہ یہ کہا کہ بے نظیر ملک کے لیے سیکورٹی رسک ہے۔

کرپشن کے الزامات صرف پاکستان کے دو منتخب وزرائے اعظم تک محدود نہیں، ان کے وزراء اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ تک ان کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ پنجاب کے ایک وزیر اعلیٰ عارف نکئی کو کرپٹ قرار دیا گیا ایک اور وزیر اعلیٰ منظور وٹو سزا کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ سرحد کے پی پی پی کے وزیر اعلیٰ آفتاب شیر پاؤ مفرور تھے۔ مسلم لیگ کے وزیر اعلیٰ سردار مہتاب عباسی کے خلاف کرپشن کے کیس کا فیصلہ آیا۔ بلوچستان کے ایک وزیر اعلیٰ ذوالفقار مگسی کے خلاف کرپشن کے الزامات تھے۔ سندھ کے پی پی پی کے دور حکومت کے وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ کے خلاف سات عدالتی فیصلے آ چکے ہیں۔ ان منتخب نمائندوں کی کرپشن کی مالیت اربوں روپے میں ہے یہ وہی لوگ ہیں جن پر عوام نے اعتماد کیا ان کو ووٹ دیئے۔ انہوں نے قوم کو کیا صلہ دیا ہے قوم پوچھتی ہے کہ کیا یہ اس کا مقدر ہے کہ سیاستدانوں کو اقتدار میں لاتی ہے تو وہ قومی خزانہ سے چوری کر کے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔

سب سے بڑی بدقسمتی کی یہ بات ہے کہ کرپشن صرف پلاٹوں کی الاٹمنٹ تک یا ناجائز اور جائز طریقہ سے دولت بٹورنے تک محدود نہیں اس میں انسانی جانوں سے کھیلنے تک کی خطرناک روش کارفرما ہے۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین نے مضر صحت خوردنی تیل ریلیز کرنے کا حکم جاری کیا یہ تیل فرنس آئل میں مل گیا تھا۔ اصولی طور پر سارے اسٹاک کو ضائع کر دینا چاہیے تھا۔ یہ پاکستان ہی ہے جہاں انسانوں کی صحت حکام کا مسئلہ نہیں وہ کسی کو جواب دہ ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ پورٹ قاسم پر یہ تیل دیا گیا تھا۔ پورٹ قاسم کے حکام نے مضر صحت تیل ریلیز کرنے سے انکار کر دیا تو کسٹم کی لیبارٹری نے ''آل کلیئر'' کی رپورٹ دے دی۔

کسٹم افسر نے رپورٹ میں لکھا کہ میرے پیشرو اس قسم کے کیسوں میں یہی فیصلہ کر چکے ہیں میرے خیال میں تیل کی ریلیز کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تیل ریلیز ہو جس سے صوبہ سرحد کے کارخانوں میں گھی بنایا گیا بناسپتی گھی مینوفیکچررز کا ایک وفد چیئرمین سی بی آر سے ملا اور ان کو یقین دلایا کہ خوردنی تیل سے فرنس آئل الگ کر دیا جائے گا یہ ممکن نہیں تھا۔ صرف آئل ریفائنری میں یہ ممکن ہے۔ مگر چیئرمین سی بی آر نے وفد کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا۔ اس چیئرمین نے جو زیر تفتیش ہے، حکومت کو ۲۰ کروڑ روپے ہرجانہ ادا کرنے کی پیشکش کی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ حکومت اس آفر پر غور کر رہی ہے۔ خزانہ خالی ہے۔ حکومت کو ہر قیمت پر خزانہ بھرنا ہے۔ رہی انسانی جانیں تو یہ ضائع ہوتی رہتی ہیں۔

پاکستان کی وزارت صحت نے ایسی بے شمار دواؤں کی فروخت کی اجازت دے رکھی ہے جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں مضر صحت قرار دے کر ممنوع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض دواؤں سے دل، جگر، گردہ کے امراض اور دماغی امراض جنم لے رہے ہیں۔ مگر حکومت ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ایسی دواؤں کی تعداد دو سو ہے۔ جن کی فروخت فی الفور بند ہونی چاہیے۔ عالمی ادارہ صحت ان کی بندش کی منظور دے چکا ہے۔ مگر پاکستان میں وزارت صحت کے بیوروکریٹس قوم کی صحت کے مجرم بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں نقلی، جعلی اور ملاوٹ شدہ دوائیں عام فروخت ہو رہی ہیں۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے شہر کراچی میں چند ڈرگ انسپکٹر وزارت صحت نے مقرر کر رکھے ہیں۔ جن کی تنخواہیں تو ہزاروں میں ہیں۔ رشوت کروڑوں روپے میں ہے۔ ان انسپکٹروں کو ایف بی آئی تک کبھی تلاش نہیں کر سکے گی۔ ملکی اور غیر ملکی کمپنیاں ان کی احسان مند ہیں جو اربوں روپے بنا رہی ہیں۔ کراچی میں گزشتہ بیس سال کے دوران کسی کو جعلی دوائیں بیچنے پر سزا نہیں ہوئی۔ ملاوٹ کے مجرموں کو دس سے بیس روپے بلدیاتی قوانین کے تحت جرمانہ ہوتا ہے۔ سزائے

قید کسی کو نہیں ہوئی کے ایم سی کے فوڈ انسپکٹرز کروڑ پتی ہیں۔

کبھی تاجروں کا یہ موقف صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ حکومت اور بیورو کریسی کے بدعنوان عناصر کا محاسبہ کرنے کو کوئی تیار نہیں ہے یہ کیسے ہو؟ جب عدلیہ کے ارکان اور وکلاء تک اس مکروہ عمل سے محفوظ نہیں ہوں۔ کوآپریٹو کمپنیوں نے پنجاب میں اور انویسٹمنٹ کمپنیوں نے کراچی سندھ اور بلوچستان میں سادہ لوح پنشنرز، بیواؤں اور عام لوگوں کے اربوں روپے لوٹ لیے کسی کا کیا بگڑا ملک کے بڑے بڑے نامی گرامی وکلاء ان لٹیروں کی وکالت پر آمادہ ہو گئے۔ لٹنے والوں کی کوئی پیروی کرنے کو تیار نہ ہوا یہ تو معاشرہ کی کیفیت ہے۔ عدلیہ کے ارکان اور فوجی افسروں کو محاسبہ کے عمل سے آزاد رکھا گیا ہے۔ خود ایک چیف جسٹس سجاد علی شاہ دن رات ججوں کے احتساب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کی کوئی سننے والا نہیں ہے کیونکہ عام پاکستانی سمجھتا ہے کہ عدلیہ صحیح ہو تو اس ملک میں کوئی کام غلط نہیں ہوگا۔

فوج کہتی ہے اس کا اپنا محاسبہ کا نظام ہے۔ عوام کو تو کبھی نظر نہیں آیا جس ملک میں بحریہ اور فضائیہ کے سربراہوں کی سطح کے فوجی افسران اربوں روپے کی کرپشن میں ملوث ہوں اس کا کیا بنے گا۔ فوجی افسر تو ''مقدس گائے'' ہے اس کے ناپاک ہونے کا قوم تصور تک نہیں کر سکتی مگر ایڈمرل منصور الحق مفرور ہے ائر مارشل وقار عظیم بند تھے کتنے اور ملوث ہیں کسی کو اندازہ نہیں ہے۔ کسی نے آج تک نہ پوچھا نہ جواب ملا کہ جنرلوں کے بیٹے صنعتکار کیسے بن گئے۔ چند ہزار روپے کی پنشن سے فیکٹریاں کیسے بن گئیں۔

اس ملک کا کیا بنے گا؟ جس کی جڑوں کو کرپشن کا کینسر نیست و نابود کر رہا ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن پر حکومت کے وزیروں ان کے حامی دانشوروں اور کالم نویسوں کی تقریریں سن کر عام پاکستانی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ''سب چور ہیں''۔ بہتی گنگا میں سب ہاتھ دھو رہے ہیں کرپشن کے خلاف مہم محض ڈھونگ ہے جس نے رشوت کے ریٹ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کیا ہے جب پولیس تھی رشوت کا ریٹ زیادہ تھا رینجرز کو لگایا گیا ریٹ اور بڑھ

گیا اب فوجی افسروں کے آنے سے ریٹ انتہا پر پہنچ رہا ہے۔ عام پاکستانی سیاستدانوں، فوجی افسروں، تاجروں، صنعتکاروں کو مراعات یافتہ طبقہ سمجھتا ہے جن کے بڑے حصہ کو تحفظ حاصل ہے۔ جن کے لیے ایمنیسٹی اسکیم کا آئے دن اعلان ہوتا رہتا ہے۔ عام آدمی جو بلوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے مراعات یافتہ طبقہ کے لیے کولہو کے بیل کی طرح لگا ہوا ہے۔ وہ ناراض ہے برہم ہے نواز شریف اور بے نظیر بھٹو سے عاجز ہے۔ ولی خان، الطاف حسین، عطاء اللہ مینگل، پیر پگاڑو سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ ہر غریب اور محب وطن پاکستانی چاہتا ہے کہ اس کے ملک میں انصاف آئے۔ قانون کی حکمرانی ہو۔ جو جرم کرے اسے سزا ملے۔ کرپٹ سسٹم میں شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا اختیارات کی منتقلی کا نیا مجوزہ نظام کرپشن کو ختم کر دے گا؟ یہ سرے سے قابل عمل نہیں ہے۔ یہ تھا غلام مصطفیٰ جتوئی کا جواب۔ وہ سیاستدان جس نے اپنے کیریئر کا آغاز ضلع کونسل سے کیا یہ نظام نہیں چلے گا۔ ان کی رائے دوٹوک اور حتمی ہے پھر کیا ہوگا؟ کرپٹ مشنری، صاف ستھرا سسٹم کیسے دے گی یہی قوم کا سوال ہے۔

پاور گیم اور بھائیوں کی سیاست

پاکستان میں فیملی پالیٹکس شاید کبھی ختم نہیں ہو سکے گی سیاسی خاندان پاور گیم پر چھائے ہوئے ہیں۔ کئی خاندانوں میں تو یہ کیفیت ہے کہ ایک بھائی مسلم لیگ میں ہے تو دوسرا اپنا پاکستان پیپلز پارٹی میں۔ ایک حکومت کے ساتھ ہوتا ہے تو دوسرا اپوزیشن کے ساتھ۔ کبھی ایک ہی گھر پر مختلف پارٹیوں کے جھنڈے لگے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے جانی دشمنوں کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں۔ سیاست اور اقتدار کی گیم میں بھائیوں کا کیا کردار ہے یہ داستان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ پاورفل مخدوم برادران ہوں یا قریشی یا ہارون یا چوہدری برادران یا مگسی اور مینگل بردران ان کی سیاست ملک میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔

پاکستان میں مجموعی طور پر اقتدار میں آنے والے قریشی برادران میں معین قریشی کو بڑی شہرت ملی جو قومی شناختی کارڈ رکھے بغیر پاکستان کے نگران وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ معین قریشی اصلاحات کا ایجنڈہ لے کر آئے تھے امریکہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو ان پر اعتماد تھا۔ ان کے بھائی بلال قریشی کارپوریٹ سیکٹر کے آدمی ہیں۔ بلال قریشی اپنے بھائی کی میزبانی کرتے ہیں۔ جب ان کے بھائی نگران وزیر اعظم تھے تب بھی بلال قریشی سارے معاملات میں محتاط رہتے تھے۔ قریشی برادران کے برعکس شریف برادران پالیٹکس اور پاور اور بزنس تینوں میں احتیاط کے قائل نہیں تھے۔ بڑے بھائی نواز شریف کو اقتدار ملا

تو چھوٹے بھائی شہباز شریف کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ اس پر شریف برادران کے مخالفین اعتراض کرتے تھے۔ درویش منش عباس شریف نے ان معاملات سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ اقتدار میں نواز شریف کی بے احتیاطی نے سارے شریف برادران کو جدہ پہنچا دیا جو اب عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اسٹیل ملز لگا رہے ہیں۔ شریف برادران اسٹیبلشمنٹ کی پشت پناہی اور ''ابا جی'' کے مشوروں سے عروج تک پہنچے مگر اقتدار کے عروج پر جانے کے باوجود بزنس ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تجارتی لحاظ سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ملک میں بڑے بڑے جدی پشتی تجارتی خاندانوں کو جہاں تجارت میں نقصان ہوا وہاں شریف خاندان کو تجارت میں بے پناہ فائدہ ہوا۔ اس پر شریف برادران کے حامی اور مخالف تک حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ شریف برادران کو یہ ایڈوانٹج ہے کہ ان کا چیپٹر جب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلوز ہوگیا اوپن ہوجاتا ہے۔ پیر پگاڑو کے صاحبزادے ''سائیں برادران'' کہلاتے ہیں ان میں راجہ سائیں اور یونس سائیں اور علی گوہر سائیں شامل ہیں۔ علی گوہر نے اپنے سیاسی راستے جدا کر لیے ہیں۔ پیر پگاڑو کے بھائی نادر شاہ تھے جن کا انتقال ہوگیا ہے خود پیر پگاڑو مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے بھائی کے سیاسی راستے کبھی اکٹھے ہوتے ہیں کبھی جدا جدا۔ صدارتی ریفرنڈم کے بڑے بھائی حامی اور چھوٹے بھائی خلاف ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں دونوں بھائی ریفرنڈم کے خلاف تھے۔ ۱۹۸۴ء سے ۲۰۰۲ء تک یہ تبدیلی آچکی ہے۔ جتوئی برادران اثر و رسوخ کے مالک ہیں بڑے بھائی غلام مصطفیٰ جتوئی ہیں جو نگران وزیر اعظم، وفاقی وزیر اور سندھ کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ جتوئی نے بھٹو خواتین کی غیر حاضری میں پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت اور فوجی آمریت کے خلاف جمہوری تحریک کی رہنمائی کی۔ جتوئی کے لیے جنرل پرویز مشرف کے ریفرنڈم کی حمایت مشکل فیصلہ تھا وہ جنرل ضیاء الحق کے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کی کال دے چکے تھے۔ غلام مصطفیٰ کے بھائی ڈاکٹر غفار جتوئی سینیٹر رہے ہیں۔ مجتبیٰ جتوئی منتخب امیدواروں میں رہے ہیں۔ بڑے جتوئی کے بیٹے اور بھتیجے وزارتوں میں رہے

ہیں۔اب مسرور جتوئی جو غلام مصطفیٰ جتوئی کے صاحبزادے ہیں نوشہرو فیروز کے ناظم ہیں۔ مگر جتوئی برادران کا یہ معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ سیاسی ایشوز پر سارے بھائیوں کا موقف ایک ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کے بھائی حکومت کی حمایت کر رہے ہیں۔

اس معاملہ میں مزاری برادران جتوئی برادران سے بالکل مختلف ہیں۔ بڑے بھائی بلخ شیر مزاری خود نگران وزیراعظم رہے۔ بیک ڈور سے اقتدار میں شرکت کو برا نہیں سمجھتے۔حکومت فوجی ہو یا سویلین اس سے رابطہ میں رہنے کو برا خیال نہیں کرتے چھوٹے بھائی سردار شیر باز مزاری ان کا الٹ ہیں۔ نہ کبھی چور دروازے سے اقتدار میں گئے۔ نہ پسند کرتے ہیں نہ اپنی اولاد کو اجازت دی ہے۔ سردار شیر باز مزاری اپنے بیٹوں کے سیاست تک میں حصہ لینے کے خلاف ہیں۔ان کو کئی بار اقتدار کی آفر ہوئی جسے انہوں نے ہمیشہ مسترد کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں وزیراعظم کا عہدہ ان کے لیے تیار رکھا تھا۔ بے نظیر بھٹو جب وزیراعظم بنیں تو ان کو گورنر سندھ بنانے کے لیے گھر تک گئی تھیں۔سردار شیر باز مزاری راضی نہیں ہوئے۔اب سیاست سے گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں مگر اب بھی کسی صورت بیک ڈور سے پاور شیئرنگ پر رضا مند نہیں ہوں گے۔

مخدوم برادران کا ہر دور میں بڑا چرچا رہا ہے۔مخدوم امین فہیم سب سے بڑے ہیں جو سروری جماعت کے سربراہ ہیں۔ اس لحاظ سے سیاسی اور روحانی دونوں طرح سے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔امین فہیم بے نظیر بھٹو کی جگہ پاکستان پیپلز پارٹی کے قائم مقام سربراہ ہیں جن کے جنرلوں سے رابطے ہیں۔ بے نظیر بھٹو بڑے مخدوم پر بڑا اعتماد کرتی ہیں مگر ان کی فوجی حکومت کے ساتھ پاور شیئرنگ پر آمادہ نہیں ہوئیں جس سے امین فہیم کا اقتدار میں آنے کا خواب پورا نہیں ہوسکا۔مخدوم خلیق الزمان ان کے چھوٹے بھائی ہیں جو سیاست سے مایوس ہو کر این جی اوز میں چلے گئے تھے۔اب خلیق الزماں اپنی اوریجنل پارٹی پی پی پی میں واپس آنا چاہتے ہیں۔امین فہیم ان کی واپسی کا اعلان تک کر چکے ہیں

جس کی خلیق الزماں نے تردید کر کے ''بھائی جان'' کو شرمندہ کر دیا۔ ان کے ایک اور بھائی مخدوم رفیق الزماں حیدر آباد کے ضلعی ناظم ہیں جو بھائی جان کے مشورہ پر صدر جنرل پرویز مشرف کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ مخدوم خاندان بہت پاورفل ہے۔ اسٹیبلشمنٹ سے اس کے ہمیشہ تعلقات رہے ہیں۔ امین فہیم اب تک بے نظیر بھٹو اور بھٹو فیملی سے وفاداری نبھا رہے ہیں۔ مخدوم خاندان یہ سمجھتا ہے کہ اقتدار پر اسی کا حق ہے جس سے اسے طویل عرصہ تک محروم رکھا گیا ہے۔ بے نظیر بھٹو سے وفاداری بھی اقتدار سے محرومی کی وجہ قرار دی جاتی ہے۔

گجرات کے چوہدری برادران کا ہر دور میں چرچا رہتا ہے چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی دراصل بھائی نہیں کزن ہیں۔ چوہدری برادران پنجاب کے اقتدار کے اتنے ہی خواہش مند ہیں جتنے سندھ کے مخدوم برادران سندھ کے اقتدار کے طلبگار ہیں۔ دونوں عرصہ تک محروم رہے ہیں چوہدری شجاعت حسین چوہدری ظہور الٰہی کے صاحبزادہ ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی نے جنرل ضیاء الحق سے وہ قلم مانگا تھا جس سے انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے لیے رحم کی درخواست مسترد کر کے ان کی پھانسی کے حکم نامہ پر دستخط کیے۔ یہ قلم ظہور الٰہی اپنے پاس کچھ عرصہ بھی نہ رکھ سکے۔ الذوالفقار کے قاتلوں نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ چوہدری ظہور الٰہی کے ورثہ کو چوہدری شجاعت حسین آگے بڑھا رہے ہیں۔ جب نواز شریف اقتدار میں تھے ان کے ساتھ تھے ان کی حکومت برطرف ہونے پر ان کے اولین مخالفین میں سے تھے۔ اب مشرف حکومت کے پوری طرح ساتھ ہیں۔ چوہدری شجاعت حسین نے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا اجلاس میں مسلح محافظوں کے ساتھ جا کر اپنا امیج خراب کیا ہے۔ وہ کمیٹی کی اپنے خلاف فائنڈنگ کو تبدیل کرانا چاہتے تھے۔

اعجاز الحق چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ ہیں اعجاز الحق جب نواز شریف کے ساتھ تھے دونوں اسلام آباد میں جنرل ضیاء الحق کی قبر پر جا کر ان کے مشن کو مکمل کرنے کا اعلان کرتے تھے۔ اعجاز الحق اور انوار الحق کو ''حق برادران'' کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کو

اسلام آباد میں مہنگے پلاٹ الاٹ کیے گئے اعجاز الحق سیاست میں سرگرم ہیں۔ اپنے ڈکٹیٹر والد کا دفاع کرتے ہیں بے نظیر بھٹو کے اپنے والد کی طرح سخت خلاف ہیں۔ البتہ ان کے بھائی انوار الحق نے سیاست میں ہاتھ ہلکا رکھا ہوا ہے۔ اعجاز الحق نواز شریف کی کابینہ میں منسٹر نہیں بنے کیونکہ وہ پرائم منسٹر کے امیدوار تھے۔

سندھ کے تالپور برادران میر رسول بخش تالپور اور میر علی احمد تالپور اپنے دور کے پاورفل پرائم منسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے بہت خلاف تھے۔ علی احمد تالپور فوجی حکومت کے وزیر دفاع بنے جو فوج کی تعداد کے سوال پر برہم ہو جاتے تھے۔ رسول بخش تالپور ذوالفقار علی بھٹو کے دیرینہ ساتھی تھے۔ سندھ کے گورنر بنے پھر اختلاف کر کے گورنر ہاؤس سے ایسے رخصت ہوئے کہ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ علی احمد تالپور کو بھٹو کو پھانسی دینے والے جنرل کا وزیر دفاع بننے کا بڑا دکھ انتخابات ہارنے کے بعد رہتا تھا۔

سندھ کے ہارون برادران کا آمرانہ اور جمہوری ہر دور میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ یوسف ہارون تحریک پاکستان کے رہنما تھے۔ جواب سندھ کے حقوق کی بات کرتے ہیں اور یہ انکشاف کرتے ہیں کہ میں نے قائداعظم کو مشورہ دیا تھا کہ آپ سندھی ہیں سندھ کے حقوق کے لیے جدوجہد کریں۔ یوسف ہارون کو طویل عرصہ تک پاکستان کے ''کنگ میکر'' کی شہرت حاصل رہی جواب کم ہو گئی ہے اب ان کا گزارہ پاکستان کے خلاف بیان بازی پر ہے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو سیاستدان خود کو قائداعظم کا فخر سے ساتھی کہتے ہیں ملک کے استحکام کی بات کرنے کی بجائے صوبوں کی آزادی کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ یوسف ہارون سے اقتدار پر قابض اور اس سے محروم دونوں طرح کے سویلین اور غیر سویلین سربراہ صلاح مشورے کرتے ہیں بزرگی کے باوجود اب بھی کوئی شام کا اخبار ان کے وزیراعظم بننے کی افواہ شائع کر دیتا ہے۔ محمود ہارون ان کے مقابلہ میں بہت محتاط ہیں فوجی حکمرانوں پر جب مشکل وقت آتا ہے ان کو بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے وزیر داخلہ تھے۔ بے نظیر بھٹو سے گورنر سندھ بننے کی خواہش نے یہ وقت بھی دکھایا

کہ کراچی ائرپورٹ پر بے نظیر بھٹو کے بچوں بلاول اور بختاور کو گود میں لے کر بیٹھنا پڑا۔

ہارون برادران کے محمود ہارون سندھ کے گورنر رہے تو جتوئی برادران کے لیاقت جتوئی سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے یہ دادو کے جتوئی کہلاتے ہیں جن کے والد عبدالحمید جتوئی نے سویلین ڈکٹیٹروں کی مخالفت اور فوجی ڈکٹیٹروں کی حمایت کی ہے۔ لیاقت جتوئی نواز حکومت کی برطرفی کے بعد اچانک ملک سے فرار ہو گئے تھے ان کے خلاف کرپشن کے کئی مقدمات تھے۔ لندن اور دبئی سے ''کلین'' ہو کر واپس آ گئے اب مسلم لیگ (ق) میں شامل ہیں جو ان کی واپسی کے بعد حسب معمول انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔ لیاقت جتوئی کے بھائی صداقت جتوئی سیاست میں ان کے ساتھ سرگرم ہیں مگر اتنی شہرت حاصل نہیں کر سکے جتنی بڑے بھائی اعجاز جتوئی کو ملی جو جوانی میں انتقال کر گئے۔ اعجاز جتوئی پاکستان کے فعال سینیٹر تھے باضابطہ قوم پرست نہیں تھے مگر صوبوں کی خودمختاری کے حامی تھے۔ بلوچستان کے اکبر بگٹی اور ان کے بھائی احمد نواز بگٹی دونوں بلوچستان کے لیے حقوق کے حامی ہیں۔ مگر عرصہ تک دونوں کے راستے جدا رہے۔ ایک ملٹری ڈکٹیٹر شپ کا ساتھ دے کر حقوق لینے کے حامی تھے تو دوسرے اس کی مخالفت کر کے حقوق حاصل کرنے کے حق میں تھے۔ اکبر بگٹی کی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ محبت اور نفرت کی جنگ رہی۔ ان کی بیٹی کی پہلی حکومت میں بلوچستان کے گورنر بنے۔ پھر بلوچستان اسمبلی توڑ کر بے نظیر بھٹو کے لیے بحران پیدا کر دیا۔

بلوچستان کے مگسی، بزنجو اور مینگل برادران سیاست کے افق پر چھائے ہوئے ہیں۔ میر غوث بخش بزنجو ملک کے قابل احترام سیاستدان تھے۔ ان کے بیٹے بزن اور حاصل، بلوچ قوم پرستوں کی رہنمائی کی کوشش کر رہے ہیں۔ غوث بخش بزنجو وراثت کی سیاست کے سخت خلاف تھے۔ اس لحاظ سے بے نظیر بھٹو پر نکتہ چینی کرتے تھے مگر اس کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے ان کی پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ عطاء اللہ مینگل عرصہ تک بزنجو کے ساتھ رہے۔ ان کے صاحبزادے اختر مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ان کے دوسرے بھائی جاوید مینگل ہیں۔

ذوالفقار مگسی بلوچستان کے وزیراعلیٰ تھے۔ یہ مسلم لیگ میں تھے۔ ان کے بھائی نادر مگسی پاکستان پیپلز پارٹی میں تھے۔ دوسرے بھائی عامر مگسی اور طارق مگسی ہیں۔ مگر فیملی کی خوبی یہ ہے کہ دو بھائی نادر مگسی اور طارق مگسی پی پی پی میں ذوالفقار اور عامر مسلم لیگ میں تھے۔ مگسی برادران کا اپنا حلقہ ہے پاکستان کی سیاست میں یہ بہت ضروری ہے۔ خیر بخش مری کے بیٹے مری برادران بلوچ، گزین، چنگیز سیاست میں ہیں۔

پنجاب کے غلام مصطفیٰ کھر غلام مصطفیٰ جتوئی کو اپنا بھائی کہتے ہیں انہوں نے یہ حق ادا کیا جب جتوئی کو نواب شاہ سے الیکشن ہارنے پر کوٹ ادو سے ایم این اے منتخب کرادیا۔ کھر کی ذوالفقار علی بھٹو سے کبھی دوستی رہی کبھی دشمنی۔ اسی طرح بے نظیر بھٹو کے کبھی خلاف رہے کبھی حامی۔ ان دنوں پھر ساتھ ہیں۔ کھر برادران کئی ہیں جن میں مرتضیٰ کھر، ربانی کھر، میلادی کھر نمایاں ہوئے پھر بیک گراؤنڈ میں چلے گئے۔ مصطفیٰ کھر کی شہرت اب سیاست سے زیادہ شادیاں کرنے کی ہے۔ ہر شادی مشہور اور ناکام ہوتی ہے۔ سندھ کا "سومرو" خاندان ہر دور میں پاورفل اور بااثر رہا ہے۔ قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر الٰہی بخش سومرو جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں جونیئر وزیر تھے ان کے بھائی افتخار سومرو سندھ کابینہ میں سینئر وزیر تھے۔ اس پر پی پی پی کے رہنما آفتاب شعبان میرانی یہ نکتہ چینی کرتے تھے کہ سینئر سومرو جونیئر منسٹر ہے جونیئر سومرو سینئر منسٹر ہے۔ سومرو فیملی بینکنگ پر چھائی ہوئی ہے۔ محمد میاں سومرو جو الٰہی بخش سومرو کے بھتیجے ہیں نیشنل بنک کے صدر تھے، سندھ کے گورنر بنے اب چیرمین سینیٹ ہیں۔ الٰہی بخش سومرو کے صاحبزادے زبیر سومرو ایک بنک کے سربراہ ہیں۔ سومرو خاندان کے اسٹیبلشمنٹ سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ الٰہی بخش سومرو پاکستان کے پرائم منسٹر بنتے بنتے رہ گئے جب قرعہ فال سندھڑی کے محمد خان جونیجو کے حق میں نکل آیا۔ اسٹیبلشمنٹ کا اپنا گیم ہوتا ہے کبھی کسی کو نوازتی ہے کبھی کسی کو نوازنے سے عین وقت پر انکار کر دیتی ہے۔ پاکستان کی سیاست میں یہ چلتا رہتا ہے۔

مسلم لیگ میں چوہدری نثار علی خان بھی ہیں۔ ان کے بھائی چوہدری افتخار علی

خان فوج میں تھے۔ نواز شریف چوہدری نثار کو اپنے قریبی معاونین میں شمار کرتے تھے ان کے مشورہ کے بغیر اہم فیصلے نہیں کرتے تھے۔ چوہدری افتخار کو سیکریٹری دفاع بنایا گیا تھا۔ نواز شریف سے جو غلط فیصلے کرادیئے گئے ان میں چوہدری نثار کا نام خود نواز شریف لیتے ہیں۔ نواز شریف نے ایک انٹرویو میں کوئی بات کہی جس پر چوہدری نثار نے خبردار کیا کہ میں نے منہ کھولا تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔ پی پی پی کے مرکزی رہنما چوہدری احمد مختار اور پی آئی اے کے ایم ڈی چوہدری احمد سعید دونوں بھائی ہیں دونوں کے راستے جدا ہیں۔ چوہدری برادران سروس انڈسٹریز کے مالک ہیں۔

صوبہ سرحد میں خان برادرز کا ماضی میں بڑا چرچا رہا جن کو بڑا پاورفل تصور کیا جاتا تھا۔ یہ خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب تھے۔ پھر خان عبدالغفار خان کے صاحبزادہ عبدالولی خان منظر عام پر آئے۔ جنہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا بیشتر حصہ پاکستان کی مخالفت میں صرف کردیا۔ وہ پختونستان بننے کا نعرہ لگاتے تھے جب پچاس لاکھ پختون افغانستان سے پاکستان آگئے تو اس نعرہ سے خاموشی سے دستبردار ہوگئے۔ اب ان کا یہی مطالبہ ہے کہ صوبہ سرحد کا نام ''پختون خواہ'' رکھ دیا جائے۔ خان عبدالولی خان کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی کان پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جن کو اپنے بھائی کی سیاست کی وجہ سے اپنے کیریئر میں نقصان اٹھانا پڑا۔ ولی خان کا سیاسی کیریئر صاف ستھرا رہا کوئی اسکینڈل نہیں بنا مگر ان کی اہلیہ کے بھائی اعظم ہوتی اس سے مبرا نہیں تھے جو کرپشن کے اسکینڈل میں ملوث تھے۔

صوبہ سرحد سے شیرپاؤ برادران آئے۔ حیات محمد خان شیرپاؤ ذوالفقار علی بھٹو کے بہت قریب تھے۔ بم دھماکہ میں ہلاک ہوگئے تو ان کے بھائی آفتاب شیرپاؤ جو فوج میں میجر تھے پی پی پی میں آگئے۔ بے نظیر بھٹو نے اقتدار میں حصہ دار بنایا پھر باغی ہوگئے ملک سے فرار ہوگئے، واپس آکر جیل گئے اب وزیر ہیں۔ سردار فاروق لغاری کے رشتہ دار ہیں۔ آفتاب شیرپاؤ نے بے نظیر بھٹو اور فاروق لغاری میں صلح کرانے کی کوشش کی مگر

کامیاب نہیں ہوئے۔

بے نظیر بھٹو کے گڑھ لاڑکانہ میں صفدر عباسی اور منور عباسی پی پی پی میں ہیں منور عباسی سابق صوبائی وزیر ہیں جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کو لاڑکانہ میں اجرک پہنائی لیکن صفدر عباسی نے جنرل کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ سندھ کے ایک فرسٹ کلاس کرکٹر پیر آفتاب شاہ جیلانی پی پی پی کے محاذ پر فعال ہیں۔ ان کے بھائی پیر امجد شاہ اور پیر شفقت شاہ ہیں۔ پیر آفتاب کچھ عرصہ کے لیے نیشنل پیپلز پارٹی میں چلے گئے تھے پھر بے نظیر بھٹو کے پاس آ گئے۔

سندھ کی سیاست میں دو معتبر شیخ برادران مقبول شیخ اور امتیاز شیخ ہیں۔ مقبول شیخ پاکستان مسلم لیگ (ق) میں شامل ہیں مقبول شیخ کو لیاقت جتوئی نے اپنی کابینہ سے نکال دیا تھا جس پر انہوں نے علیحدہ گروپ بنا لیا تھا۔ اس سے پہلے عرصہ تک خاموش رہے۔ مقبول شیخ جوڑ توڑ کے اتنے ماہر نہیں جتنے ان کے بھائی امتیاز شیخ ہیں۔ امتیاز شیخ بیوروکریٹ تھے جن کو جام صادق علی کے دور میں خاطر خواہ شہرت ملی۔ امتیاز شیخ نے سندھ میں بے نظیر بھٹو کے مخالفین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ امتیاز شیخ نے جتوئی خاندان اور ارباب خاندان کی مدد سے سندھ ڈیموکریٹک الائنس قائم کیا جس کو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ مسلم لیگ کے محاذ پر ملیر کے شیخ برادران نواز شریف کی حکومت کے دور میں اور اس کے بعد بہت فعال رہے۔ وہ کئی بھائی ہیں جس میں علیم عادل شیخ سیاسی طور پر سرگرم ہیں۔ جب نواز شریف کے ساتھ تھے پوری طرح ساتھ تھے ان کے لیے جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ جب ان کی حکومت گئی تو بھرپور طریقہ سے ان کے خلاف ہو گئے۔ علیم عادل شیخ مسلم لیگ (یوتھ ونگ) کے صدر ہیں کئی بچوں کے باپ ہیں مگر ان کو یوتھ ونگ میں رہنے کا شوق ہے۔ جس کے قائد ہیں۔ ان کے بھائی حلیم عادل شیخ ہیں جو ان کی طرح ایکٹیو ہیں۔

پرویز علی شاہ پاکستان پیپلز پارٹی میں تھے جنہوں نے پیر پگاڑو کو ۱۹۸۸ء کے

انتخابات میں ہرایا تو فاتح پگاڑا بن گئے تھے پھر پرویز علی شاہ نے مختلف جماعتوں میں سفر کیا۔کبھی بے نظیر کے ساتھ رہے کبھی خلاف۔عمران خان کی تحریک انصاف میں تھے جس کی صوبائی صدارت سے ان کو ہٹا دیا گیا۔گروپنگ کے ماہر ہیں کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔ان کے بھائی جاوید شاہ پی پی پی میں تھے۔کبھی بھائیوں میں سے ایک سیاست میں ہوتا ہے تو دوسرا سیاست سے دور رہتا ہے۔

برادران کی یہ داستان ان بدنصیب بھائیوں کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہے گی جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ان میں بے نظیر بھٹو کے دونوں بھائی مرتضیٰ اور شاہنواز الطاف حسین کے بھائی بے نظیر دور کے چیف منسٹر عبداللہ شاہ کے بھائی ضامن شاہ وزیر داخلہ معین الدین حیدر کے بھائی احتشام حیدر شامل ہیں۔الطاف حسین، عبداللہ شاہ اور معین الدین حیدر کے بھائی کراچی میں دہشت گردی کا نشانہ بنے جن کو خاک اور خون میں نہلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ان میں اختر مینگل کے بھائی کو حکومت کے انتقام اور سلیم بگٹی کے بھائیوں کو قبائلی تنازعات کی نذر کر دیا گیا۔یہ سارا کھیل پاور اور پالیٹکس کا ہے یہ کتنی جانوں کا نذرانہ لے گا کسی کو اندازہ نہیں ہے۔

سیاستدانوں کے مشاغل
فرصت کے اوقات میں کون کیا کرتا ہے؟

سابق نگران وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی پاکستان کے ان چند سیاستدانوں میں سے ایک ہیں جو بڑی باقاعدگی سے بیرون ملک سیر کو جاتے ہیں ان کا غیر ملکی دورہ کثیر المقاصد ہوتا ہے اپنا طبی معائنہ کراتے ہیں اور امریکہ میں زیر تعلیم بچوں سے ملتے ہیں پھر وقت ملے تو یورپ کی سیر کرتے ہیں جتوئی عام طور پر سمندری سفر ''کروز'' کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی اہلیہ کو بھی سیر کا شوق ہے۔ دونوں پاکستان کی سیاست سے وقت نکال کر تفریح کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں سیاستدانوں کے چھٹی پر جانے کا رجحان نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے ملک کے لیے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ دنیا کے سب سے پاورفل ملک امریکہ کے صدر چھٹیاں مناتے ہیں جس سے انہیں آرام کرنے کا موقع ملتا ہے اگر ہمارے صدر اور وزیر اعظم بھی کچھ روز چھٹی کریں تو اس سے ملک وقوم اور اپوزیشن سب کو ریلیف ملے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سیاستدانوں کی کوئی ہابی ہو لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں سیاست ہی کو کاروبار اور شغل سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی باقاعدہ چھٹی لینے کو تیار نہیں ہے۔

اپوزیشن کی لیڈر بے نظیر بھٹو کی جب اقتدار سے چھٹی ہوئی تو انہوں نے خود کہا ''میں بچوں کو سیر کرانے لندن لے گئی تھی جب وزیر اعظم تھی میرے پاس وقت نہیں تھا''

ایک وقت تھا جب وہ بھی بڑے شوق پالا کرتی تھیں جب اسٹوڈنٹ تھیں تو انہیں ڈاک کے ٹکٹ اور گڑیاں جمع کرنے کا شوق تھا ان کی ساری چیزیں ۷۰ کلفٹن میں تھیں جب ان کا اقتدار میں آنے کے بعد مرتضٰی بھٹو سے تنازعہ بڑھا تو مرتضٰی نے ان کے سارے اسٹیمپ بلاول ہاؤس واپس بھجوا دیئے۔ بے نظیر کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ تاریخ ان کا پسندیدہ مضمون ہے وہ خود کو تاریخ کا طالب علم کہتی ہیں۔ تاریخ سوانح حیات سے لے کر گھروں کی ڈیزائننگ کے موضوع پر وہ پڑھتی ہیں۔

اپوزیشن کی لیڈر کو گپ شپ کا بھی شوق ہے جب فرصت میں ہوں تو اپنی سہیلیوں پوچی فیروزہ سمیعہ سلمٰی لالے اور سوسن کو جمع کر کے گپ شپ کرتی ہیں اپنی بچپن کی سہیلیوں کو بے نظیر نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے بھی بے نظیر کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ جب بے نظیر ضیا دور میں قید تنہائی میں تھیں سہیلیاں ان کی سالگرہ پر ہوم سکریٹری کی اجازت لے کر کیک لے کر جاتی تھیں۔

اسلام آباد کی گوسپ میں دلچسپی لینا بے نظیر کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ جنرل کیا سوچ رہے ہیں بیورو کریٹس کیا کر رہے ہیں۔ نواز شریف نے واشنگٹن و نیو یارک میں کیا بات کی وہ بڑے شوق سے سنتی ہیں اپنی قسمت کا حال جاننا بھی ان کا دلچسپ مشغلہ ہے جادو ٹونے ٹوٹکے پر یقین رکھتی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ ان کے دور اقتدار میں دھنکے بابا اور لاٹھی پیر نے بڑا عروج پایا۔ بے نظیر اتنی مصروف ہیں کہ ان کو آرام کرنے کا کم وقت ملتا ہے۔ بے نظیر کے پڑھنے کی عادت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ طیارہ سے اترتے وقت اخبار ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس پر نشانات لگاتی رہتی ہیں۔ اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھی ہوں تو نوٹس لے رہی ہوتی ہیں۔ وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں ان کو یقین ہے کہ ان کو تیسرا موقع ملے گا۔

پاکستان کے دوسری بار وزیر اعظم بننے والے نواز شریف کو بے نظیر کی طرح مطالعہ کے اتنا شوق نہیں وہ اپنے مشیروں کی معلومات پر انحصار کرتے ہیں۔ غالباً یہی پس

منظر ہے جس کی وجہ سے ملک کے ایک ممتاز کالم نویس نے ایک انگریزی اخبار میں اپنے کالم میں نواز شریف کو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا تھا وزیر اطلاعات مشاہد حسین کی طرف سے اس کی تردید اور تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ نواز شریف بنیادی طور پر فیملی مین ہیں اس لیے ان کے مشاغل گھریلو قسم کے ہیں جن میں اچھے کپڑوں کھانے کا شوق شامل ہے قمیض شلوار اور واسکٹ کے اچھے کپڑے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نیلا رنگ ان کا پسندیدہ ہے۔ مرغن کھانوں کے شوقین ہیں جس میں ناشتہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوستوں کو ناشتہ پر بلاتے ہیں۔ جب فرصت ملے اور دوستوں کے درمیان ہوں تو لطیفے نہ صرف انجوائے کرتے ہیں بلکہ خود بھی سناتے ہیں۔ بزنس مین ہیں مگر سابق مرد اول آصف علی زرداری کی طرح پیسہ بنانے کو زندگی کا واحد مقصد نہیں سمجھتے۔

آصف علی زرداری کو گھوڑے پالنے کا جنون کی حد تک شوق ہے روپیہ جمع کرنے کے بعد ان کا دوسرا بڑا مشغلہ یہی ہے۔ اپنی منگنی کے وقت گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گئے تھے۔ پولو اور شکار کا شوق ہے۔ شادی سے پہلے کلب لائف ان کا مشغلہ تھی۔ ہمدرد آدمی ہیں۔ کسی ملازم کو نکالتے نہیں کئی ملازموں کو جن کے پاس سگریٹ کے پیسے نہیں ہوتے تھے کروڑ پتی بنا چکے ہیں۔

آصف زرداری کو کتابوں رسالوں سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی ان کی اہلیہ کو ہے۔ بے نظیر بھٹو کی پہلی اور دوسری حکومت میں آصف نے حکومت کو کئی بحرانوں سے بچایا۔ فاروق لغاری کے صدر کے عہدہ پر انتخاب میں ان کا اہم رول تھا۔ اس لحاظ سے بحران پیدا کرنا اور حل کرنا ان کا مشغلہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ صدر لغاری اور وزیر اعظم بے نظیر میں تنازعہ آصف علی زرداری کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔

سردار فاروق احمد خاں لغاری شکار کے اتنے ہی شوقین ہیں جتنے ان کے جیسے دوسرے جاگیردار۔ سردار فاروق لغاری سندھ اور پنجاب میں شکار کھیلتے ہیں جو پرندہ بھی ان کی گن کی راہ میں آجائے ڈھیر ہو جاتا ہے اچھے نشانہ باز ہیں۔ کپاس کے کاشتکار کی

حیثیت سے صدر مملکت نے کپاس کے مضمون میں خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔ کپاس اس کی قسموں اور تحقیق پر دس گھنٹے کا لیکچر دے سکتے ہیں۔

پاور گیم میں فاروق لغاری کو لڑکپن سے دلچسپی تھی۔ ان کے ایک کلاس فیلو کے مطابق فاروق کو شروع سے ٹاپ پوزیشن کا شوق تھا انہوں نے سی ایس پی کا امتحان دیا اور ٹاپ میں آئے مگر ان کو احساس ہوا کہ سی ایس پی افسر بن کر ٹاپ پر جانا مشکل ہے بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت میں صدر بننے کے بعد سردار فاروق لغاری نے کافی شکار کھیلا مگر پھر اخباروں اور اپنے سیاستدان دوستوں کی نکتہ چینی کے باعث اس میں کمی کر دی۔

صدر مملکت کے ان دوستوں میں سردار شیر باز مزاری شامل تھے جن کو کتابوں کو جتنا شوق ہے ان کی اہلیہ کو پھولوں اور پودوں کا اتنا ہی شوق ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی اچھی کتاب شائع ہو، مزاری لائبریری کی ضرور زینت بنے گی۔ تاریخ، جغرافیہ، قانون، سیاست، بین الاقوامی امور ہر موضوع کی کتاب ان کے پاس ہے۔ یہی صورتحال اخبارات اور رسائل کی ہے جو دنیا بھر سے ان کے پاس آتے ہیں۔ سیاسی گوشہ نشینی کے باوجود شیر باز مزاری کو پاکستان کے مٹھی بھر باخبر سیاستدانوں میں شامل سمجھا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی سفیر اور غیر ملکی اخبار نویس پاکستان آئیں تو ان سے ضرور ملتے ہیں۔

باخبر سیاستدانوں میں پہلا نمبر شاہ مرداں شاہ پیر صاحب پگاڑا کا ہے۔ کنگری ہاؤس میں ان کے ٹیلی فون ہر وقت بیل کی آواز سے گونجتے رہتے ہیں عام طور پر خود فون اٹھاتے ہیں دوستوں سے ضرور پوچھتے ہیں۔ کیا خبر ہے؟ لائنز ایریا میں قتل کی واردات سے لے کر نواز شریف کی طرف سے سپریم کورٹ میں پیشی کے فیصلہ تک پیر پگاڑو ہر معاملہ سے باخبر رہتے ہیں۔ باخبر ہونے سے فرصت ملے تو اپنے کیمرہ سے فوٹو کھینچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ان کے ڈرانگ روم میں پاکستان کے تقریباً ہر بڑے سیاستدان کا پورٹریٹ لگا ہوا ہے نیوز اور فوٹو کے بعد سگار اور آئس کریم کے رسیا ہیں۔ برانکائٹس کے قدیم مریض ہیں مگر ڈاکٹروں کے مشورہ کے برعکس آئس کریم کھاتے ہیں۔ دوستوں کے معاملہ میں

بڑے محتاط ہیں۔ مشکل سے بھروسہ کرتے ہیں ایک بار بھروسہ ہوجائے تو دوستی مستقل رکھتے ہیں۔

مزدور کسان پارٹی کے صدر فتحیاب علی خان ان کے دوست سے زیادہ ہمسایہ ہیں دونوں کا مارننگ واک میں سامنا ہوتا ہے۔ فتحیاب علی خان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز کے چیئرمین بھی ہیں یہ عہدہ ان کو اپنی اہلیہ ڈاکٹر معصومہ حسن سے ملا جو ویانا (آسٹریا) میں سفارتی خدمات انجام دے کر واپس آئی ہیں۔ فتحیاب کا زیادہ وقت پاکستان اور علاقہ کی صورتحال کے بارے میں سوچنے میں گذرتا ہے یہی ان کا مشغلہ بن گیا ہے ان کے گھر میں خونخوار کتے ہوتے ہیں جس کے باعث علماء ان کی دعوت قبول کرنے سے معذرت کرتے ہیں۔

قومی محاذ آزادی کے چیئرمین معراج محمد خان کا گھر فتحیاب علی خاں کے گھر سے دور نہیں مگر دونوں کے فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ معراج محمد خاں کی نائن زیرو سے قربت نے یہ دوری پیدا کی ہے کراچی سے اسلام آباد تک مزدور رہنما معراج محمد خاں کا بڑا احترام کرتے ہیں جن کی ساری توجہ ان دنوں پاکستان کے اقتصادی اعداد وشمار مرتب کرنے پر ہے۔ کئی سال پہلے وہ خبردار کرتے تھے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بجلی اور گیس کے ریٹ مقرر کریں گے تو ان کے ساتھی تک ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کی وارننگ صحیح تھی۔

معراج محمد خاں اس خوف سے اپنی یادداشتیں نہیں لکھتے کہ بہت سے لوگ بے نقاب اور دوست ناراض ہوجائیں گے جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر غفور احمد کو ایسا کوئی خوف نہیں ہے۔ پاکستان کے سیاسی بحرانوں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں ان کتابوں میں ریفرنس میٹریل بہت ہوتا ہے وہ حالات کو صحیح انداز میں پیش کرنے کے قائل ہیں۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔ پروفیسر غفور احمد باقاعدگی سے چہل قدمی ضرور کرتے ہیں ان کے ایک دیرینہ دوست پیار علی الانا کی جوگنگ مستقل روٹین ہے۔ پیار علی الانا جو عبدالحفیظ پیرزادہ کے ہمسائے ہیں ڈیفنس کے سن سیٹ بلیوارڈ سے بوٹ بیسن تک جوگنگ

کرتے ہیں۔ طویل عرصہ تک وہ بلاول ہاؤس تک جاتے تھے مگر جب بے نظیر نے ان کی جگہ بھی مینوالا کو ترجیح دی تو الانا خود بلاول ہاؤس سے دور ہو گئے۔ قدیم مورتیاں تیر اور نوادرات جمع کرنا پیار علی الانا کا مشغلہ ہے جو ان کو اپنے والد جی الانا سے ورثہ میں ملا ہے۔

سندھ کے سابق گورنر کمال اظفر کو کتابیں جمع کرنے کا جتنا شوق ہے ان کی اہلیہ ناہید کو ڈیزائننگ کا اتنا ہی جنون ہے کمال اظفر نے اپنی گورنر شپ کے دور میں گورنر ہاؤس کی شکل بدل دی پاکستان کے ٹاپ مصوروں کی پینٹنگز گورنر ہاؤس کی دیواروں پر آویزاں کی گئیں کمال اظفر سندھ کے دلیر گورنر تھے جو محافظوں کے بغیر گلبہار تک سفر کر سکتے تھے۔ ان دنوں ان کی توجہ یادداشتیں لکھنے پر ہے کمال اظفر کو بہت سی باتیں معلوم ہیں۔

پی پی پی کے قومی اسمبلی کے رکن پیر آفتاب شاہ جیلانی جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی میں کمال اظفر کے ساتھی تھے دراز قد پیر آفتاب سندھ کے واحد سیاستدان ہیں جو فرسٹ کلاس جو فرسٹ کلاس کرکٹر رہے ہیں۔ پی پی پی کے دور حکومت میں ان کا نام کرکٹ کنٹرول بورڈ کی سربراہی کے لیے زیر غور آیا مگر آصف علی زرداری نے ویٹو کر دیا تھا۔

سندھ کے سیاستدان مخلص اور محب وطن ہیں مگر لیاقت جتوئی کی کابینہ ہو، عبداللہ شاہ کی مظفر شاہ کی یا قائم علی شاہ کی۔ صوبہ کے وزراء کی بڑی تعداد شام کے ڈھلتے ہی مصروف ہو جاتی ہے اور یہی مصروفیت دراصل اب مشغلہ ہے جس پر اکثر سیاستدان بیوروکریٹس اور فنکار متفق ہیں ورنہ تو ان کے مزاج کی طرح ان کے شوق بھی مختلف اور عجیب ہیں۔

الطاف حسین کی شادی
''حق پرست'' حلقوں میں خوشی کی لہر

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین جب پاکستان میں تھے ایک جلسہ میں ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ شادی کب کریں گے انہوں نے کہا میری شادی مہاجر تحریک سے ہو چکی ہے میں تحریک میں ہوں شادی کا کیسے سوچوں جب عظیم بھائی (مقتول عظیم احمد طارق) کو دیکھتا ہوں کیسے بچے پال رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں تو سوچتا ہوں شادی کر کے کیسے کام کرسکوں گا۔ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے الطاف حسین کا یہ عذر قبول کرلیا گیا اس کے بعد ان کی شادی کی بات کبھی کبھار سنائی دیتی عجیب بات یہ تھی کہ ان کے مخالفین اور حامی دونوں کی خواہش تھی کہ الطاف حسین شادی کرلیں اور نئی عائلی زندگی کا آغاز کریں۔

سیاست میں الطاف حسین نے کراچی یونیورسٹی میں ہنڈا ففٹی سے جو سفر شروع کیا ان کو طویل عرصہ کے لیے جلاوطن کر گیا کراچی یونیورسٹی کی لابی، برنس روڈ، عزیز آباد سب کو دیکھنے کو ترس گئے وطن کی یاد ان کو ستاتی رہی جو دولت مند سیاستدان لندن جاتے تھے ان سے ملاقاتوں میں یہی کہتے تھے کہ مجھے پاکستان بہت یاد آتا ہے کراچی کی گلیاں مس کرتا ہوں۔ الطاف حسین نے اپنے لیے جو راہ چنی ہے کسی طور آسان نہیں ہے مگر ان کو اس کی پرواہ کبھی نہیں کہ ان کو ان کے مخالفین انتہائی متنازعہ سمجھتے ہیں یہ سیاست کا المیہ ہے

کہ نواز شریف ہوں یا بے نظیر بھٹو یا الطاف حسین ان کے انتہائی خلاف ہیں لوگ یا ان پر جان چھڑکنے والے ہیں درمیان کا راستہ کوئی نہیں ہے۔ شاید خود الطاف حسین اس بات سے آگاہ ہیں کہ ان کی سیاست اور اس کے انداز پر اعتراض کرنے والوں کی کمی نہیں ہے وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ووٹ بنک ہے جو ہر آپریشن کے باوجود برقرار رہا ہے۔ پھر الطاف حسین کو خبروں میں رہنے کا فن آتا ہے کوئی ایسا ایشو ضرور کھڑا کر دیتے ہیں جس سے بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ سے لے کر اسفند یار ولی تک پریشان ہو جاتے ہیں عین اس وقت جب اے آر ڈی تحریک چلانے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی متحدہ نے 1940ء کی قرارداد کا مسئلہ اٹھا دیا۔ سارے ان کے خلاف ہو گئے۔ متحدہ اور اے آر ڈی دونوں نے اس مسئلہ پر ہاتھ ہلکا رکھا نہ متحدہ اتحاد سے الگ ہوگئی نہ اے آر ڈی نے اس کو نکالا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے طوفان تھم گیا مگر الطاف حسین کہاں چوکنے والے ہیں 30 جنوری 2001ء کو دھماکہ کر دیا الطاف حسین نے بلوچی نژاد خاندان میں رشتہ جوڑ لیا فائزہ گبول ان کی دلہن بن گئیں جو ہر لحاظ سے بہادر کہلائیں گی جس سے الطاف حسین کی کنوارہ کلب کی رکنیت ختم ہوگئی۔ نائن زیرو پر جشن کا سماں تھا۔ قائد تحریک رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ حق پرستوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا عرصہ بعد نائن زیرو پر ڈھولک کی تھاپ سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف خوشی منائی جا رہی تھی۔ الطاف حسین کی سسرال کراچی کے قدیم گبول خاندان کی ہے ان کی دلہن فائزہ خان بہادر سردار الٰہی بخش گبول کے نواسے ملک فیصل خان کی صاحبزادی ہیں اس طرح سے یہ اردو اسپیکنگ پنجابی اور بلوچی کا اتحاد ہے کراچی کے قدیم بلوچ خود کو سندھی شمار کرتے ہیں اس لحاظ سے سندھی بھی اس میں شامل ہیں۔

الطاف حسین نے جس طرح اپنی سیاست سے سب کو حیرت میں ڈالا ہے اپنی شادی سے بھی سب کو حیرت زدہ کر دیا کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد اردو اسپیکنگ (مہاجر) لڑکی سے شادی نہیں کریں گے۔ بے نظیر بھٹو کے سسر حاکم علی زرداری نے اعتراض کیا کہ لڑکی پنجابی ہے الطاف حسین نے ہمیشہ پنجابی اسٹیبلشمنٹ کی

مخالفت کی مگر شادی پنجابیوں میں کی ہے جی ایم سید کے پوتے حیدر شاہ نے کہا کہ لڑکی اردو اسپیکنگ ہے۔ خود گبول فیملی کے سردار عبدالستار گبول نے کہا کہ لڑکی گبول نہیں ہے ملک ہے یہ وہ سیاستدان ہیں جو عوام سے کہتے ہیں کہ متحد ہو جاؤ اسٹیبلشمنٹ تمہیں لڑا رہی ہے بانٹ رہی ہے سیاستدان سندھی پنجابی مہاجر پٹھان بلوچ کے چکر سے کب نکلیں گے یہ افسوس کی بات ہے شادی بالکل ذاتی فعل ہے اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ پیپلز پارٹی سندھ کے صدر نثار کھوڑو نے صحیح کہا کہ شادی فطری عمل ہے اور سنت رسولؐ کی پیروی ہے خود بے نظیر بھٹو نے شادی پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے لگتا ہے اب الطاف بھائی کے جوش میں کمی آئے گی بے نظیر بھٹو کو اندازہ ہے خود ان کی جب شادی ہوئی کتنا طوفان کھڑا کیا گیا تھا کہ یہ شادی اسٹیبلشمنٹ نے کرائی ہے۔ گبول فیملی کا کراچی میں پاکستان پیپلز پارٹی سے دیرینہ تعلق رہا ہے پی پی پی کا ردعمل فطری ہے دلہن پی پی پی کے مرکزی رہنما نبیل گبول کی بھتیجی ہے۔ فائزہ گبول جو پاکستان کے ایک متنازعہ سیاستدان کی دلہن بن گئی ہیں بے نظیر بھٹو کی طرح ''پنکی'' کہلاتی ہیں۔ وہ بمبئی کی قانون ساز اسمبلی کے سابق رکن سندھ اسمبلی کے پہلے ڈپٹی اسپیکر قیام پاکستان کے بعد کراچی کے دوسرے میئر خان بہادر الٰہی بخش گبول کی بڑی صاحبزادی آمنہ گبول کی پوتی ہیں آمنہ گبول کی شادی قیام پاکستان سے قبل ملک مظفر خان سے ہوئی تھی۔ ملک مظفر خان کے چار صاحبزادے ملک ایاز گبول ملک فیصل خان گبول ملک ہمایوں خان گبول ملک یوسف خان گبول ہیں۔ ان کے گھروں میں بلوچی بولی جاتی ہے یہ لوگ باپ کی طرف سے پنجابی ماں کی طرف سے بلوچ اور ڈومیسائل کے لحاظ سے اہل کراچی کہلائیں گے۔ فائزہ گبول نے سینٹ جوزف کالج سے گریجویشن کی جو روانی سے اردو، انگریزی اور بلوچی بولتی ہیں ان کی ساری تعلیم کراچی میں ہوئی ملک فیصل خان کا خاندان دو ہفتے پہلے تک کراچی میں موجود تھا فائزہ گبول کی دادی آمنہ گبول کے والد خان بہادر الٰہی بخش گبول 1927ء میں بمبئی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے ان دنوں سندھ بمبئی کا حصہ تھا۔ الٰہی بخش گبول بڑی باغ و بہار

شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کے والد اور بے نظیر بھٹو کے دادا سر شاہنواز بھٹو اور ممتاز بھٹو کے والد سردار نبی بخش بھٹو بمبئی قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ خان بہادر الٰہی بخش گبول نے بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد 1937ء کے الیکشن میں حصہ لیا اور یوسف ہارون اور محمود ہارون کے والد عبداللہ ہارون کو شکست دی 1956ء میں خان بہادر کراچی کے میئر منتخب ہوئے پھر سندھ کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر طویل عرصہ کے لیے یورپ چلے گئے جہاں سماجی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔

گبول خاندان کراچی کا قدیم سیاسی خاندان ہے جو کسی زمانہ میں کراچی کی نصف اراضی کا مالک تھا مزار قائداعظم جس جگہ تعمیر کیا گیا ہے گبول خاندان کی ملکیت تھی جو اس خاندان نے مزار کی تعمیر کے لیے مہیا کر دی اس کے قریب خداداد کالونی قائم کی گئی جو خان بہادر الٰہی بخش گبول کے والد کے نام پر بنائی گئی گبول خاندان نے ہر جمہوری تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گبول اور ہارون خاندان لیاری کے لیے ہمیشہ زور آزمائی کرتا رہا ہے۔ الٰہی بخش گبول کے دوسرے صاحبزادے عبدالستار گبول نے عبداللہ ہارون کے بیٹے سعید ہارون کو 1970ء کے انتخابات میں شکست دی 1990ء اور 1993ء میں سردار نبیل گبول لیاری سے منتخب ہوئے جو فائزہ گبول کے چچا ہیں۔ فائزہ گبول کے دولہا الطاف حسین ایم کیو ایم کے قائد ہیں 1980ء کے اوائل میں کراچی یونیورسٹی میں اے پی ایم ایس او (آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) بنا کر الطاف حسین نے سیاسی سفر شروع کیا اس سے پہلے بنگلہ دیش سے بہاریوں کی واپسی کی تحریک میں سرگرم تھے الطاف حسین کی سیاست میں کامیابی کو حیرت انگیز کہا جاسکتا ہے غیر ملکی صحافی ان کے جلسے دیکھ کر [illegible] ہو جاتے تھے جس میں ان کے ایک اشارہ پر لاکھوں کا مجمع خاموش اور دوسرے اشارے پر متحرک ہو جاتا تھا۔ الطاف حسین بنیادی طور پر مڈل کلاس کے طبقہ سے وابستہ ہیں جو قیام پاکستان کے بعد ناظم آباد، لیاقت آباد فیڈرل بی ایریا میں آباد ہوا۔ یہ طبقہ غریب مگر خوددار

اور تعلیم یافتہ ہے 80 اور 120 مربع گز کے کوارٹروں میں یہ لوگ رہتے ہیں اس طبقہ میں تعلیم سب سے زیادہ ہے اس لحاظ سے بے روزگاری بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس طبقہ نے الطاف حسین کو لیڈر بنایا کراچی کی تنگ گلیوں کی محرومی کی داستان نے ایم کیو ایم بنائی۔ الطاف حسین نے اپنا نعرہ صرف ''مہاجر'' رکھا جس میں اردو اسپیکنگ طبقہ کی محروم نسلوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ یہ نعرہ سندھ شہر کی سیاست پر دیکھتے ہی دیکھتے چھا گیا ہر گھرانہ اس سے متاثر ہوا۔ سندھ کے ایک سابق گورنر نے ایک نجی محفل میں تسلیم کیا میں کیا کروں الطاف حسین کے خلاف ہوں مگر میرا پورا گھرانہ اس کے ساتھ ہے۔ خود اپنے گھر میں آؤٹ سائیڈر بن گیا ہوں۔

نامور پاکستانی سیاستدانوں کے دلچسپ ریمارکس

رینجرز کی اے پی سی کی کھڑکی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول سے ذرا بڑی اس کھڑکی سے نواز شریف جھانک رہے تھے۔ پہلی بار ان کو جیل سے باہر لایا گیا تھا۔ کراچی کی خصوصی عدالت کے احاطہ میں اے پی سی رکی نواز شریف نے سر باہر نکالا آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک اخبار نویس نے ان کی طرف ٹیپ بڑھا دیا، میاں صاحب کچھ تو بول دیں، وہ خاموشی سے رینجرز کو تکتے رہے۔ کورٹ کے اندر جا کر ہمت پکڑی تو بولے، میں ہائی جیکر نہیں ہوں۔ میری حکومت ہائی جیک کی گئی ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں میں اگلے روز یہ لیڈ تھی۔ نواز شریف شروع میں گھبرائے تھے ان کو یقین نہیں تھا کہ ان کی جان بچے گی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں کارگل کے راز سے پردہ اٹھاؤں گا۔ عدالت میں ان کے بیان میں اس کا ذکر نہ تھا، صرف یہی تھا کہ جنرل پرویز مشرف سے اختلافات کارگل کے تنازعہ سے شروع ہوئے۔ جب خصوصی عدالت نے ان کو سزائے عمر قید سنائی تو عدالت میں بلند ہونے والی چیخ بیگم کلثوم نواز کے بجائے بیگم نصرت شہباز کی تھی۔ بیگم کلثوم نواز نے نواز شریف کے ساتھ کھانا کھایا پھر باہر نکلتے ہوئے اخبار نویسوں کے سوال پر کہا۔ بھٹو نے ہماری پراپرٹی ضبط کر لی تھی یہ بھی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت ہے اللہ اور دے گا۔ کلثوم نواز سیاست میں اچانک آئیں مگر خاطر خواہ تہلکہ مچایا۔ انہوں نے کراچی میں کہا دو تین جنرل ہمارے خلاف ہیں ورنہ پوری فوج ہمارے ساتھ ہے۔ مسلم لیگ نے

ان کے ان ریمارکس تردید کی جو انہوں نے کراچی پریس کلب میں مسلم لیگ کے لیبر کونشن میں ادا کیے تھے "جنرل پرویز معین الدین حیدر اور الطاف حسین ایک ہیں" نواز شریف کی اپنی اہلیہ اور خاندان کے ساتھ جلاوطنی میں سب سے دلچسپ لطیفہ بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ کے ساتھ ہوا جس رات بیگم کلثوم نواز سعودی عرب کے لیے روانہ ہوئیں۔ اس سے چوبیس گھنٹے پہلے نوابزادہ کو فوجی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا یقین دلایا۔ اس پر نوابزادہ نصر اللہ بہت برہم ہوئے، انہوں نے کہا میں نے سیاستدانوں سے معاملات کیے، سرخرو رہا، ایک تاجر سے معاملہ کیا اور میرے ساتھ ہاتھ کر گیا۔ پھر نوابزادہ نے جمہوریت کے مفاد میں شریف فیملی کو معاف کر دیا مگر شاید غوث علی شاہ کے لیے ممکن نہیں ہوگا جن کو شہباز شریف نے یہ تک نہیں بتایا کہ وہ سعودی عرب جا رہے ہیں اور چپکے سے چلے گئے۔ شریف فیملی نے اس طرح فرار سے سندھ میں کھویا ہے جبکہ غوث علی شاہ نے بہت کچھ پایا ہے جو سخت تکلیف اور اذیت کے باوجود ڈٹے رہے اور سرینڈر سے انکار کر دیا۔ نواز شریف یہی کہہ سکے کہ جس طرح حکمرانوں کو میرے جانے کا نہیں پتہ تھا میرے آنے کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی ملک کے ممتاز سیاستدان ہیں، جن کا اپنا دھیما انداز ہے ایک بار اصغر خان نے ان کے خلاف بڑا سخت بیان داغ دیا، اخبار نویسوں نے پوچھا تو جتوئی نے اپنے روایتی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اصغر خان صاحب مہربان ہیں، مہربانی کرتے رہتے ہیں، آج کچھ زیادہ مہربانی کر دی ہے۔ اس طرح محمد خان جونیجو اپنے دھیمے اسٹائل کے لیے مشہور تھے۔ بے نظیر بھٹو کو انہوں نے جلاوطنی سے واپسی کی اجازت دی، انہوں نے ان کو ضیاء کا وزیراعظم کہہ کر تحریک چلانے کا اعلان کیا تو اخبار نویسوں نے ایک تقریب میں جونیجو کو گھیرا۔ سب سمجھے کہ ہر حکمران کی طرح جونیجو بے نظیر پر برس پڑیں گے ان کو غدار اور ملک دشمن قرار دیں گے مگر وہ صرف یہ الفاظ کہہ کر آگے بڑھ گئے "ان کو کہنے دیں" جونیجو کو بیوروکریسی کی طاقت کا شروع میں اندازہ نہ تھا۔ کراچی میں مسلم لیگ کے کارکنوں کے

ان کے ان ریمارکس تردید کی جو انہوں نے کراچی پریس کلب میں مسلم لیگ کے لیبر کنونشن میں ادا کیے تھے ''جنرل پرویز معین الدین حیدر اور الطاف حسین ایک ہیں'' نواز شریف کی اپنی اہلیہ اور خاندان کے ساتھ جلا وطنی میں سب سے دلچسپ لطیفہ بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ کے ساتھ ہوا جس رات بیگم کلثوم نواز سعودی عرب کے لیے روانہ ہوئیں۔ اس سے چوبیس گھنٹے پہلے نوابزادہ کو فوجی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا یقین دلایا۔ اس پر نوابزادہ نصر اللہ بہت برہم ہوئے، انہوں نے کہا میں نے سیاستدانوں سے معاملات کیے، سرخرو رہا، ایک تاجر سے معاملہ کیا اور میرے ساتھ ہاتھ کر گیا۔ پھر نوابزادہ نے جمہوریت کے مفاد میں شریف فیملی کو معاف کر دیا مگر شاید غوث علی شاہ کے لیے ممکن نہیں ہوگا جن کو شہباز شریف نے یہ تک نہیں بتایا کہ وہ سعودی عرب جا رہے ہیں اور چپکے سے چلے گئے۔ شریف فیملی نے اس طرح فرار سے سندھ میں کھویا ہے جبکہ غوث علی شاہ نے بہت کچھ پایا ہے جو سخت تکلیف اور اذیت کے باوجود ڈٹے رہے اور سرینڈر سے انکار کر دیا۔ نواز شریف یہی کہہ سکے کہ جس طرح حکمرانوں کو میرے جانے کا نہیں پتہ تھا میرے آنے کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی ملک کے ممتاز سیاستدان ہیں، جن کا اپنا دھیما انداز ہے ایک بار اصغر خان نے ان کے خلاف بڑا سخت بیان داغ دیا، اخبار نویسوں نے پوچھا تو جتوئی نے اپنے روایتی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اصغر خان صاحب مہربان ہیں، مہربانی کرتے رہتے ہیں، آج کچھ زیادہ مہربانی کر دی ہے۔ اس طرح محمد خان جونیجو اپنے دھیمے اسٹائل کے لیے مشہور تھے۔ بے نظیر بھٹو کو انہوں نے جلا وطنی سے واپسی کی اجازت دی، انہوں نے ان کو ضیاء کا وزیراعظم کہہ کر تحریک چلانے کا اعلان کیا تو اخبار نویسوں نے ایک تقریب میں جونیجو کو گھیرا۔ سب سمجھے کہ ہر حکمران کی طرح جونیجو بے نظیر پر برس پڑیں گے ان کو غدار اور ملک دشمن قرار دیں گے مگر وہ صرف یہ الفاظ کہہ کر آگے بڑھ گئے ''ان کو کہنے دیں'' جونیجو کو بیورو کریسی کی طاقت کا شروع میں اندازہ نہ تھا۔ کراچی میں مسلم لیگ کے کارکنوں کے

ایک اجلاس میں بولے میں بیوروکریسی کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ انہوں نے اکا دکا بیوروکریٹس کو ہٹایا مگر پھر بڑوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں برطرف ہوگئے۔ اس پر پیر صاحب پگاڑو نے تبصرہ کیا۔ جس دن محمد خان نے سوچا میں پرائم منسٹر ہوں اسے نکال دیا گیا۔ مگر پیر صاحب کہتے تھے ہمیں خوشی ہے ہمارا وزیراعظم زندہ واپس آ گیا۔ بے نظیر بھٹو جب پرائم منسٹر کے عہدہ سے برطرف کی گئیں، انہوں نے کہا لاہور کے لیے رول الگ ہے۔ لاڑکانہ کے لیے الگ ہے۔ اس طرح جب ان کی حکومت کی برطرفی کو عدلیہ نے جائز اور نواز حکومت کی برطرفی کو ناجائز قرار دیا تو انہوں نے کہا میرے پاس چمک نہیں ہے۔ نواز شریف کے پاس چمک ہے، جب نواز شریف اقتدار میں تھے، بے نظیر کہتی تھیں ''نواز شریف پاکستان کے لیے گورباچوف ثابت ہوں گے'' اس طرح نواز شریف وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو پاکستان کے لیے سیکورٹی رسک کہتے تھے۔ گورباچوف اور سیکورٹی رسک، دونوں نوابزادہ نصر اللہ کی سربراہی میں اے آر ڈی میں بیٹھے ہیں۔ سندھ کے سیاستدان اپنے دلچسپ ریمارکس کے لیے مشہور ہیں، قوم پرست سیاستدان جی ایم سید نے ایک بار کہا ''جب انوکی اور اکرم کی کشتی ہو رہی تھی ہم سندھی اکرم کی ہار کی دعا کر رہے تھے''۔ جب ان سے پوچھا گیا کیوں، تو انہوں نے جواب دیا ''ہم ڈرتے تھے کہ اکرم جیتا تو حکومت انعام میں سندھ کی زمین دے دے گی''۔ انوکی جیتا تو سندھ کی زمین تو بچے گی۔ ممتاز بھٹو خود کو سندھ پر دس سر قربان کرنے والا کہتے ہیں، پہلے سندھ کے حقوق کے لیے سر دینے کی بات کرتے تھے اب کہتے ہیں کہ کالا باغ ڈیم بنا تو میں ٹکریں مار کر توڑ دوں گا۔

ولی خان نے اس لحاظ سے ترمیم کی ہے کہ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ کالا باغ ڈیم بنا تو بم سے اڑا دیں گے۔ ولی خان اور ان کے خاندان نے پاکستان کے قیام کو ہمیشہ چیلنج کیا اور اعلانیہ کہا کہ ہم جناح کے پاکستان کو نہیں مانتے، مگر جب نواز شریف نے پاور شیئرنگ میں ولی خاندان کو شریک کیا تو ان کے سارے اختلافات دور ہوگئے اقتدار اصولوں اور اختلافات دونوں کو ختم کر دیتا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو جواب اپنی یادداشت بڑی حد تک کھو چکی ہیں، ایک بار بتا رہی تھیں کہ اپنے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کھڑی تھیں، شام کا وقت تھا اچانک آسمان پر ایک تارہ ٹوٹ کر گرا، بھٹو نے ٹوٹے ہوئے تارہ کو دیکھ کر کہا میں چاہتا ہوں دنیا سے ایسے جاؤں اچانک! بھٹو کی بات صحیح ثابت ہوئی پاکستان میں تیزی سے اقتدار پانے والے سیاستدان ۴۹ سال کی عمر میں پھانسی پا کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جن کے آخری الفاظ ''Finish It'' تھے۔ بھٹو کے خلاف جب پی این اے کی تحریک چلی تو ان کے ریمارکس پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ جو انہوں نے اپنی کرسی پر ہاتھ مار کر کہے تھے ''یہ کرسی بڑی مضبوط ہے'' ان کی کرسی مضبوط ثابت نہیں ہوئی۔ اس طرح بھٹو کے ''اُدھر تم اُدھر ہم'' کے ریمارکس (تردید کے باوجود) تاریخ کا حصہ ہیں جو انہوں نے مجیب کی مشرقی پاکستان اور اپنی مغربی پاکستان میں مقبولیت پر کہے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد جب بے نظیر بھٹو اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ 70 کلفٹن میں منظر عام پر آئیں، انہوں نے کہا ''میرے پاپا عوام کے دلوں میں زندہ ہیں'' اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ ایک روز بے نظیر بھٹو اپنی والدہ کو پیپلز پارٹی کی قیادت سے ہٹا دیں گی۔ جنہوں نے ناراض ہو کر کہا تھا ''مجھے ہٹانے والوں نے اپنا منہ کالا کیا ہے'' ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹا کر پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے والے جنرل ضیاء الحق تھے، جنہوں نے اپنی حمایت کرنے والے سیاستدانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ میں سیٹی بجاؤں گا تو یہ دم ہلاتے ہوئے آئیں گے، اس پر سیاستدانوں میں احتجاج کرنے کی ہمت نہیں تھی، جب ایک اخبار نویس نے کیا تو انہوں نے اپنی وردی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''آپ کو اس وردی کا احترام کرنا پڑے گا''۔

جنرل ضیاء الحق ایک بار کراچی آئے تو اخبار نویسوں نے بہاریوں کی واپسی کا مسئلہ اٹھایا، انہوں نے کہا میں بھکاریوں کو کیسے لے سکتا ہوں۔ ان کی گفتگو کی ٹیپ اورنگی میں چلا دی گئی، ہنگامے پھوٹ پڑے، کئی افراد مارے گئے۔ جب اگلی بار جنرل ضیاء الحق آئے تو صاف انکار کر گئے، بولے میں نے بہاریوں کو بھکاری نہیں کہا تھا۔ انہوں نے

اخبار نویسوں کو جھوٹے کہا تو ایک اخبار نویس نے جرات کر کے جواب دیا صدر محترم جھوٹ آپ کی طرف سے بولا گیا ہے۔ تاہم صدر میں یہ بات برداشت کرنے کا تحمل تھا۔ جنرل ضیاء الحق اتنے خشک نہیں تھے جتنے نظر آتے تھے، کراچی کے ایک ڈاکٹر ڈاکوؤں میں اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ایک کیس میں پولیس نے ڈاکوؤں سے ساز باز اور تاوان کی رقم کا حصہ وصول کرنے پر ان کو دھر لیا۔ تو ایک وفد صدر سے ڈاکٹر کی رہائی کے لیے ملا صدر نے ڈاکٹر کی رہائی کا مطالبہ میں کہا کون ڈاکٹر! وہ ڈاکو، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جنرل ضیاء الحق کو بلانے کے لیے اصغر خان نے خط لکھا تھا، پی این اے کے دور میں ان کے ریمارکس بڑے مشہور ہوئے کہ بھٹو کو کوہالہ کے پل پر پھانسی دے دیں گے، اصغر خان بعد میں اپنے ریمارکس سے مکر گئے۔ اس طرح ولی خان نے ایک بار کہا کہ ''بھٹو ایک ایسا سانپ ہے جس کا سر کچل دینا چاہیے'' ولی خان، جب بھٹو کی بیٹی کے ساتھ ایم آر ڈی میں بیٹھے تو ان ریمارکس سے منحرف ہو گئے۔

بیگم نصرت بھٹو جانتی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار تک پہنچانے میں ان سیاستدانوں کا کتنا ہاتھ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب یہ سیاستدان ایم آر ڈی بنانے کے لیے 70 کلفٹن گئے بیگم بھٹو نے ان کے جانے کے بعد صابن سے ہاتھ دھو کر روتے ہوئے کہا ''آج میں نے بھٹو کے قاتلوں سے ہاتھ ملایا ہے'' بھٹو کو اس دور میں ان کے ساتھی حاکم علی زرداری نے چھوڑ دیا تھا۔ بھٹو کی ڈوبتی ہوئی کشتی سے ایک ایک کر کے ان کے دیرینہ ساتھی چھلانگ لگا رہے تھے۔ ان میں سے ایک ساتھی نے کہا میں نے اپنی پگڑی اپنے دوست اپنے بھائی کی جان بخشی کے لیے جنرل ضیاء الحق کے قدموں میں ڈال دی تھی مگر اس ظالم کا دل موم نہیں ہوا۔ اس دور میں بھٹو کے کئی قریبی ساتھیوں نے شادیاں رچائی تھیں۔

بھٹو کی بیٹی نے 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن کا بائیکاٹ کیا جس میں ان کے بعد سسر بننے والے حاکم علی زرداری نے حصہ لیا تھا جن کی معاونت آصف علی زرداری کر رہے تھے۔ خود آصف علی زرداری جب بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت ڈسمس ہونے پر گرفتار

ہوئے تو حاکم علی زرداری نے کراچی میں آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''میرا بیٹا سیاست میں بلا وجہ پھنس گیا میں اس کی زندگی کے لیے فکر مند ہوں''۔ آصف زرداری کی جان کو خطرہ نہیں ہوا مگر ان کو رہائی نہیں مل سکی۔ اس طویل قید سے آصف زرداری نے اپنے حامیوں کی تعداد میں اضافہ اور مخالفین کی تعداد میں کمی کی ہے۔

کبھی صدر بے بس کبھی وزیر اعظم

ایک کالم نویس نے قومی تعمیر نو بیورو کے چیئرمین ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل تنویر نقوی کے لیے ایک بار لکھا کہ ان کی موجودگی میں فوجی حکومت کو کسی مخالف کی ضرورت نہیں ہے۔ کئی بار یہ محسوس ہوا کہ یہ رائے غلط نہیں تھی۔ اب انہوں نے ایک دھما کہ آئین میں ترامیم کا اعلان کر کے کیا ہے۔ اس کے لیے بی بی سی کے پروگرام ''ہارڈ ٹاک'' کو استعمال کیا گیا۔ اس میں میزبان کی رعایت کے باوجود تنویر نقوی یہ بتانے میں ناکام رہے کہ فوجی حکومت اپنے اصل ایجنڈہ کو کب ڈیکلیئر کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ آئین میں ترامیم کی جائیں گی جس کا فوج کو پورا اختیار ہے۔ اس طرح توازن پیدا کیا جائے گا۔ توازن پیدا کرنے کی آخری کوشش جنرل ضیاء الحق کے دور میں کی گئی، جب جنرل ضیاء الحق کی مستقل صدارت کے عوض سیاسی پارٹیوں نے آٹھویں ترمیم کی کڑوی گولی نگلی۔ محمد خان جونیجو کو صدارتی وزیر اعظم کے طور پر لایا گیا۔ محمد خان جونیجو کو ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق برداشت نہیں کر سکے، ان کی چھٹی کر دی گئی مگر جنرل ضیاء الحق کی فضائی حادثہ میں ہلاکت نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کا راستہ ہموار کر دیا جمہوریت بحال ہوگئی، بے نظیر بھٹو ملک کی وزیر اعظم بن گئیں، آٹھویں ترمیم ان کے اقتدار کے تعاقب میں رہی، ان کا اقتدار ختم ہوا، بے نظیر بھٹو کو ڈسمس کر دیا گیا۔ نواز شریف آئے آٹھویں ترمیم کی نذر ان کا اقتدار ہو گیا۔ بے نظیر بھٹو دوبارہ آئیں، پھر آٹھویں ترمیم کی بدولت گھر بھیج دی گئیں۔ نواز شریف دوسری بار

آئے تو انہوں نے سوچا کہ آٹھویں ترمیم کا راستہ بند کردیا جائے۔ پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کو استعمال کر کے نواز شریف نے یہ سمجھ لیا کہ وہ بہت محفوظ ہو گئے۔ جنرل جہانگیر کرامت کو گھر بھیجنے پر ان کو فاتح فوج قرار دیا جانے لگا۔ صدر فاروق لغاری کے استعفیٰ اور رفیق تارڑ کی صدارت سے نواز شریف خود کو محفوظ ترین اور مضبوط ترین خیال کرنے لگے۔ مگر بارہ اکتوبر 1999ء کی رات نے سب کچھ بدل دیا۔ نواز شریف آن واحد میں ہیوی مینڈیٹ کے بوجھ تلے دب گئے۔ جو ترامیم صدارتی اختیار کو ختم کرنے کے لیے لائی گئی تھیں، ایک ہی رات میں غیر موثر ہو گئی جس طرح 1973ء کا آئین ذوالفقار علی بھٹو کو نہ بچا سکا اس طرح آئینی ترامیم نواز شریف کو بچانے میں ناکام رہیں۔ چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے ملک کا اقتدار سنبھال لیا۔ فوج کس طرح اپنے لیے مستقل رول کو یقینی بنائے اس کے لیے تنویر نقوی نے کہا ہے کہ فوج ملک کو تباہ ہوتا نہیں دیکھے گی۔

آئینی ترامیم کا شوشا بم کا دھماکہ ثابت ہوا، اس نے سیاستدانوں کو بیدار کیا۔ حکومت کے حامی اور مخالف دونوں سیاستدانوں نے فوجی حکومت کے مقاصد کی مزاحمت کا اعلان کیا ہے، ان میں پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان مسلم لیگ کے سرکاری اور اپوزیشن دھڑے سمیت مختلف جماعتوں کے قائدین شامل ہیں۔ جنہوں نے حکومت کی اسکیم کو رد کر دیا ہے۔

اقبال حیدر پاکستان پیپلز پارٹی

آئین میں ترامیم کا فرد واحد کو اختیار نہیں ہے، نہ یہ اختیار جنرل ضیاء الحق کو تھا نہ جنرل پرویز مشرف کو ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ملک میں آئین ہے بھی یا نہیں۔ پی سی او (عبوری آئین کے حکم) کے تحت فوجی حکومت بے شمار ترامیم لا چکی ہے۔ ججز کی تقرری کے بارے میں ترمیم ہوئی، 12 اکتوبر 1999ء کے بعد سے حکومت پی سی او کے تحت چل رہی ہے حکومت جب چاہتی ہے اپنی مرضی سے ترمیم کر دیتی ہے، بدقسمتی یہ ہے کہ عدالتیں اپنا کردار صحیح طور پر ادا نہیں کر سکیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ اس

سے ادارے تباہ ہو رہے ہیں۔ اگر فوجی حکومت کا کوئی عزم تھا کہ ترامیم لائی جائیں تو اس کے لیے بھی پارلیمنٹ کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

انہوں نے کہا کہ جنرل ضیاء الحق کی طرح جنرل پرویز مشرف آئینی ترامیم کا پیکج پیش کریں گے۔ حکومت 17 ویں آئینی ترمیم لائے گی جو اتنی جامع ہوگی کہ اس میں ساری ترامیم شامل ہوں گی، جس میں نیشنل سیکورٹی کونسل پارلیمنٹ کو توڑنے کا صدارتی اختیار وزیراعظم کو برطرف کرنے کا اختیار شامل ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا آنے والی پارلیمنٹ آئینی ترامیم کو قبول کرے گی۔ صدر کو اس طرح پاورفل بنایا جا رہا ہے۔ جیسے جنرل ضیاء الحق محمد خان جونیجو کے مقابلے پر بنے تھے۔

س: کیا سیاسی جماعتیں حکومت کی اس ''موو'' کی مزاحمت کریں گی؟

ج: سیاسی جماعتوں نے کہہ دیا ہے کہ آئین کے بنیادی ڈھانچہ میں ترامیم کو قبول نہیں کریں گی۔ اس پر مزاحمت کا لائحہ عمل اختیار کریں گی۔ سپریم کورٹ نے قدغن لگائی ہے کہ آئین میں بنیادی نوعیت کی ترامیم نہیں کی جاسکتیں، مگر موجودہ حکومت ترامیم کرنے کے درپے ہے۔ اس طرح ایک خطرناک صورتحال پیدا ہو جائے گی۔

سلیم ضیاء ایڈووکیٹ، پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف):

فوجی حکومت جو ترامیم لانا چاہتی ہے۔ ان کی پوری قوت سے مزاحمت کی جائے گی۔ ملک میں ہر قسم کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ مگر میں خبردار کرتا ہوں کہ صدارتی نظام لانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ پاکستان ایک فیڈریشن ہے، سارے وفاقی یونٹوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے، یہی قومی یکجہتی کا تقاضہ ہے۔ ماضی میں جو تجربات ہوئے ہیں، ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایوب خان کا دور کیوں ناکام ہوا اس لیے کہ صدارتی نظام تھا، قوم اس نظام کے خلاف تھی۔ میں فوجی حکمرانوں کو خبردار کرتا ہوں کہ طے شدہ امور کو نہ چھیڑا جائے، اس سے خطرناک پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ آئندہ پارلیمنٹ پر یہ معاملہ چھوڑ دیا جائے۔ اس حکومت کو سرے سے ترامیم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اگر حکومت نے پیشگی

ترامیم کیں تو ان سے الیکشن مشکوک ہو جائے گا۔ حکومت کو اس سے باز رہنا چاہیے۔ اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔

حلیم صدیقی، سیکریٹری جنرل پاکستان مسلم لیگ......سندھ:

بنیادی بات یہ ہے کہ کسی کو آئین میں ترامیم کا اختیار نہیں ہے۔ پاور شیئرنگ میں توازن کے لیے جو ترامیم حکومت کرنا چاہتی ہے۔ اسمبلی کے ذریعہ ہونا چاہئیں۔ صدارتی نظام اس طرح دوبارہ آجائے گا۔ قوم نے صدارتی نظام کو مسترد کر دیا ہے اسے دوبارہ لانے کی مزاحمت کرے گی، جب صدارتی نظام تھا اختیارات کو غلط استعمال کیا گیا۔ اس سے خطرناک صورتحال جنم لے گی، حکومت نئے مسائل کو اٹھا کر نئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ اس سے جتنی جلد ممکن ہو گریز کرنا چاہیے۔

نصرت مرزا صدر پاکستان مسلم رابطہ کونسل:

حکومت ترامیم لانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے، یہ جمہوریت کے منافی ہے میں سمجھتا ہوں اس طرح حکومت اپنے خلاف تحریک کے لیے سیاستدانوں کو اکسا رہی ہے۔ کوئی نکتہ تو ایسا آئے گا، جب حکومت کو رکنا پڑے گا، اسٹاپ کرنا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرنا پارلیمنٹ کا کام ہے کہ کس قسم کی کس نوعیت کی ترامیم ہونا چاہئیں۔ سیاسی تحریک راتوں رات کھڑی ہوتی ہے۔ حکومت دیکھتی رہ جاتی ہے کسی کے بس میں کچھ نہیں رہتا ہے حکومت کو اس مسئلہ پر ہوش کے ناخن لینا چاہئیں ورنہ حالات بگڑ سکتے ہیں۔ اس کی ذمہ دار حکومت خود ہوگی۔

مشتاق مرزا اے آر ڈی:

1973ء کا آئین قوم کا متفقہ آئین ہے، اس کے ذریعہ ہی قوم کے اتحاد اور یکجہتی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ حکومت نے آئین میں ترمیم کی کوشش کی تو سیاسی جماعتیں اسے برداشت نہیں کریں گی، اس موو کو سرے سے مسترد کر دیں گی۔ فوجی حکومت آئین کے طے شدہ معاملات کو نہ چھیڑے اس سے مسائل الجھ جائیں گے۔ حکومت 1۔ الیکشن

کرائے۔ 2۔ ٹرانسفر آف پاور کرے اور 3۔ جائے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ آئین میں ترمیم کا تو سپریم کورٹ کو اختیار نہیں ہے۔ یہ اختیار فرد واحد کو کیسے دیا جاسکتا ہے، اس سے سنگین صورتحال پیدا ہو جائے گی، پاکستان کی سیاسی جماعتیں یہ نہیں ہونے دیں گی۔ صدارتی نظام براہ راست یا بالواسطہ مسلط کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جائے گا۔

ملک جن حالات سے دوچار ہے ان میں یہ وارننگ بروقت ہے مگر ہر حکومت ایسی وارننگ کو نظر انداز کر دیتی ہے اور خطرات سے خبردار کرنے والوں کو اپنا مخالف سمجھنے لگتی ہے، جو در حقیقت حکومت کے دوست ہوتے ہیں۔ دشمن نہیں ہوتے ہیں، نئی آئینی ترامیم کے پیش نظر کیا تاریخ خود کو دہرا رہی ہے جنرل ضیاء الحق نے خود کو مضبوط بنایا نواز شریف نے خود کو مستحکم کیا اب جنرل پرویز مشرف کی باری ہے۔

پاکستان میں ہر حکومت خواہ فوجی ہو یا سویلین یہ کریڈٹ لے سکتی ہے کہ طے شدہ مسائل از سر نو کھڑے کرنے کی ماہر ہوتی ہے۔ نواز شریف جب تاریخ کے بھاری ترین مینڈیٹ کے حامل تھے ان کو کیا سوجھی کہ صدر کا پارلیمنٹ کو برطرف کرنے کا اختیار ختم کرنے کے درپے ہوگئے۔ اپنے ''محسن'' برادر فاروق احمد خان لغاری کو ان کے گاؤں جا کر یہ روح فرسا خبر سنائی کہ میں آپ کے اپنی برطرفی کے اختیارات کو ختم کر رہا ہوں۔ سردار لغاری پر یہ خبر بجلی بن کر گری ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ کسی پاورفل ہستی سے رابطہ کرتے۔ صدر کی ساری طاقت آن واحد میں ختم کر دی گئی۔ جسے ربر اسٹیمپ بنا دیا گیا۔ نواز شریف کے حامی خوش تھے کہ تبدیلی کا راستہ روک دیا گیا، اب میاں صاحب کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہٹا سکے گی۔ نواز شریف کے لیے دنیا کی طاقت کیا پاکستان کی سب سے بڑی طاقت مصیبت بن گئی۔ ان کا اقتدار ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف ایوان اقتدار سے جیل پہنچا دیئے گئے۔ ہیوی مینڈیٹ پڑا رہ گیا۔ اس کے مالک کو نہ بچا سکا جس طرح 1973ء کا آئین ذوالفقار علی بھٹو کو نہ بچا سکا۔ اس آئین سے غداری کی سزا موت رکھی گئی تھی، آئین

کی اس شق پر عملدر آمد کی بھٹو خاندان کو مہلت نہ مل سکی، جس فوجی جنرل ضیاء الحق نے آئین کی خلاف ورزی کی اس کا کچھ نہیں بگڑا ان کے محسن کو سزائے موت ہوگئی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم تھے ان کے مخالفین یہ شکایت کرتے تھے کہ بھٹو نے اپنے صدر کو ایوان صدر میں قید کر رکھا ہے۔

اس لحاظ سے سیاستدانوں اور عوام کی یہ شکایت صحیح معلوم ہوتی تھی کہ صدر بالکل بے بس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو خاطر خواہ اختیارات حاصل ہونا چاہئیں۔ صدر جنرل ضیاء الحق تھے آل پاور فل، انہوں نے کہا میں سیٹی بجاؤں گا سیاستدان میرے پیچھے دم ہلاتے ہوئے آئیں گے۔

بیشتر سیاستدانوں نے یہی کیا، ان کی خوشنودی کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی میں پھوٹ ڈال دی گئی، جتوئی جونیجو جمالی سومرو سب کے نام پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے لیے جا رہے تھے۔ قرعہ فال محمد خان جونیجو کے نام نکلا جن کو ملک کا وزیر اعظم سلیکٹ کر لیا گیا۔ سندھڑی کے جونیجو نے جب حلف اٹھایا تو بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ضیاء کے وزیر اعظم نے حلف اٹھا لیا ہے۔ یہ 1985ء کی بات ہے اب سولہ سال بعد تاریخ پھر خود کو دہرا رہی ہے۔ آرمی چیف جنرل پرویز مشرف پاکستان کے صدر ہیں منتخب نہیں ہیں خود صدر بن گئے ہیں۔ سندھ کے شریف سیاستدان محمد خان جونیجو نے آٹھویں ترمیم کی کڑوی گولی جمہوریت کے مفاد میں نگل لی، فوج کے سربراہ اس کے بغیر مارشل لاء اٹھانے اور ٹرانسفر آف پاور کو تیار نہ تھے۔ اس ٹرانسفر آف پاور کو شیئرنگ قرار دیا گیا۔ سیاستدان خوش تھے کہ کم از کم فوج کچھ تو دے رہی ہے۔ پیر پگاڑو نے کہا فوج نے ہماری چیز لے لی ہے ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں جب ہماری چیز فوج کے ہاتھ سے گرے گی ہم اسے اٹھا لیں گے۔ فوج کو اختیارات گرانے کی ضرورت نہیں پڑی، جو کچھ فوج نے دیا منتخب اور غیر منتخب سیاستدانوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ یہ سب مبینہ طور پر فوج کی شرائط پر نوکری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پاور ایسی ظالم چیز ہے کہ ان میں سے کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ فوج جس شرط پر

لانا چاہے گی سیاستدان آجائیں گے۔قوم سے یہی کہیں گے کہ صدارتی اختیارات کی کڑوی گولی نگلنا پڑے گی۔جس طرح بے نظیر بھٹو نے 1988ء میں وزیر اعظم بننے کے لیے غلام اسحاق خان کو صدر بنا کر اسٹیبلشمنٹ کی کڑوی گولی برداشت کی تھی۔

اب پھر یہی مرحلہ آ گیا ہے، فوجی لیڈر شپ نے آئینی اور قانونی ماہرین کو سترہویں آئینی ترمیم کے پیکج کی تیاری کی ہدایت کی ہے۔جس پر آئینی دماغ دن رات کام کر رہے ہیں۔صورتحال ایسی ہے جیسی لوڈو کے کھیل میں ہوتی ہے کہ فتح کے قریب پہنچ کر کھلاڑی سانپ کے منہ میں پہنچ جاتا ہے اس طرح اس کا سفر پھر زیرو پوائنٹ سے شروع ہوتا ہے۔پاکستان کی سیاست میں اب یہی ہو رہا ہے۔جس ماضی کے بارے میں کہا گیا کہ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن نہیں تھا۔قوم کو اسی ماضی میں لے جایا جا رہا ہے۔اس طرح ایک نئے انداز کا صدارتی نظام ملک پر مسلط ہو جائے گا۔جس میں منتخب پارلیمنٹ صدر کے رحم و کرم پر ہوگی، اگر پارلیمنٹ کسی حکم کو ماننے سے انکار کرے گی تو اس کا حشر محمد خان جونیجو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی پارلیمنٹ کی طرح ہوگا، جس پر آج آنسو تک بہانے والا کوئی نہیں ہے۔حکومت اب ایک نیا آئینی پیکج قوم کو دے گی جس کے تحت کئی طے شدہ معاملات کو از سر نو زندہ کر دیا جائے گا۔جس میں پارلیمانی نظام اور وزیر اعظم کے اختیارات کے معاملات شامل ہیں۔نیشنل سیکورٹی کونسل کا مسئلہ ان میں سے ایک ہے۔

نیو یارک میں دہشت گردی کے بعد
لندن کے پاکستانیوں پر کیا گزری؟

برطانیہ کے طول و عرض میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ لسانی اور نسلی اقلیتوں کو پورے معاشرہ میں سمونا پڑے گا۔ نسلی ہم آہنگی کا تصور اجاگر کرنے کی غرض سے مختلف اسکیموں پر کام ہو رہا ہے۔ جن کا مقصد مختلف نوعیت کے امتیازات کو ختم کرنا ہے۔ نسلی امتیاز کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ جوناتھن نلین ریس لیجی سلیشن یونٹ کے سربراہ ہیں، انہوں نے بتایا کہ نسلی فسادات کا کمیشن غیر سرکاری ادارہ ہے جو ریس ریلیشنز ایکٹ 1976ء کے تحت قائم کیا گیا ہے اس ادارہ کا مقصد نسلی امتیازات کے مسئلے سے نمٹنا ہے اور نسلی مفاہمت کو فروغ دینا ہے۔ یہ سرکاری اور نجی دونوں شعبوں کے لیے کام کرتا ہے۔ ریس ریلیشنز یونٹ کے مائیک بوائیل کے مطابق نسلی ہنگاموں کی باقاعدہ انکوائری کرائی گئی جس میں ایشیائی باشندوں کو شریک کیا گیا۔ برطانیہ میں رہائش اختیار کرنے والے پاکستانیوں بھارتیوں چینی اور افریقی باشندوں کو پولیس کے رویہ کی عام شکایت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پولیس زیادہ تر گوروں پر مشتمل ہے۔ سیاہ فام اور ایشیائی باشندے اپنی آبادی کے لحاظ سے بہت ہیں ان کی نمائندگی اتنی نہیں ہے جس سے کسی گڑبڑ کی صورت میں مدد مل سکے۔ نیو اسکاٹ لینڈ یارڈ میں نسلی اور تشدد کے جرائم پر ٹاسک فورس میٹرو پولیٹن پولیس اتھارٹی میں قائم ہے۔ ٹاسک فورس اگست 1998ء میں قائم ہوئی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے حکام اس

بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی پولیس فورس کو دنیا میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ تشدد کے واقعات کے بعد اس کے ارکان متاثرہ خاندانوں سے رابطہ کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں زبان کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ ایشیائی باشندوں کی عورتوں کو انگریزی کی اتنی مہارت برسوں تک رہنے کے بعد بھی نہیں ہوتی۔ پولیس حکام کو اس بات پر تشویش ہے کہ فسادات آن واحد میں بڑی تیزی سے کس طرح پھیل جاتے ہیں۔ حکام نے تسلیم کیا کہ نیویارک اور واشنگٹن کے واقعات کے بعد سخت کشیدگی پھیل گئی تھی۔ ایشیائی باشندوں پر حملے ہوئے اسکولوں میں ایشیائی باشندوں پر فقرے کسے گئے۔ جہاں جس کا بس چلا اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

سفید فام باشندوں کو شکایت ہے کہ یہ ایشیائی لوگ ہمارے ملک کا کھاتے ہیں، اپنے ملکوں کے اقتصادی مسائل کی وجہ سے برطانیہ آتے ہیں مگر پھر ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں، ہمارے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ ایشیائی باشندے اپنے دفاع میں کہتے ہیں ہم نے گوروں کی معیشت کو بہتر بنایا، چھٹی کے دنوں میں اور کرسمس میں کام کیا۔ اس محنت کا جس کی بدولت گوروں نے ترقی کی یہ ہمیں کیا صلہ دے رہے ہیں، کوئی واقعہ ہوجائے تو تشدد پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ حکام کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھے تو پھیلنے نہ پائے۔ تشدد پسند نوجوان دونوں طرف ہیں گورے پاکستانیوں کو ''پاکی'' کہہ کر حقارت سے پکارتے ہیں، تو کمزور پاکستانی یہ سن کر خاموشی سے کھسک لیتے ہیں مگر جو تگڑے ہیں مقابلہ کرتے ہیں بعض کیسوں میں تشدد پر آمادہ گوروں کی پٹائی تک کردیتے ہیں۔ پولیس حکام چاہتے ہیں کہ ایشیائی باشندے پولیس میں آئیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کمیونٹی کے لوگ پولیس میں نوکری کرنے والے کو غدار سمجھتے ہیں، بعض ان سے نسلی وفاداریوں کی توقع کرتے ہیں۔

پولیس فورس میں ایشیائی باشندوں کی نمائندگی پانچ فیصد ہے۔ ٹارگٹ پچیس فیصد ہے جو پورا کرنے میں وقت لگے گا۔ حکام کہتے ہیں کہ ہمارا کام ایکشن لینا ہے کوئی آدمی مسجد کے پاس جاکر نعرے لگائے گا تو اسے گرفتار کرکے انکوائری کریں گے۔ مذہبی جذبات

جلدی بھڑک اٹھتے ہیں اس لیے پولیس اس کا خاص خیال رکھتی ہے۔ اس قسم کے حفاظتی انتظامات کے باوجود کئی مساجد پر نیویارک کے دہشت گردی کے واقعات کے بعد حملے کیے گئے کئی مساجد کو انتہا پسندوں نے نفرت بھرے دھمکی آمیز خطوط لکھے پولیس نے ایسے خطوط کی انکوائری کی بعض نوجوانوں کو پوچھ گچھ کے لیے پکڑا گیا۔ مگر ان واقعات سے مسلمانوں میں عام طور پر خوف و ہراس تہیں پھیلا وہ اپنی مساجد کی حفاظت کے لیے منظم ہو گئے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان میں کسی چرچ پر حملہ ہو جائے تو پورا مغربی میڈیا حرکت میں آ جاتا ہے۔ برطانیہ میں مساجد پر حملہ ہوا تو اسے اتنا اجاگر کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ برطانوی معاشرہ میں اس طرح کے مسائل ہیں جن کا مسلمانوں کو سامنا ہے مگر جوں جوں 11 ستمبر 2001ء کے واقعات پر ردعمل میں کمی آتی گئی عام زندگی نارمل ہوتی گئی۔

11 ستمبر کا سانحہ

ایک ارب پتی پاکستانی تاجر پر کیا گزری؟

ایک پاکستانی ارب پتی تاجر لگژری کروز میں سمندر پار سیر کر رہے تھے۔ اس سفر کے دوران خیال آیا کہ اپنے بھتیجے کو ساتھ لے لیں جو امریکہ کی ایک ریاست میں زیر تعلیم تھا۔ دونوں کی ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی، پروگرام طے ہو گیا۔ بھتیجا چچا سے کروز پر ملا۔ دونوں ساتھ اس تفریحی سفر پر چل پڑے۔ جہاز پر ڈھائی ہزار مسافر اور بھی تھے۔ دنیا کے مسائل سے بے پرواہ لائف کو انجوائے کر رہے تھے۔ کوئی فکر نہ فاقہ، پاکستان سے ہر سال سینکڑوں تاجر، صنعتکار، سیاستدان بیوروکریٹس کروز پر جاتے ہیں۔ نہ میٹنگ کا جھنجھٹ نہ امن و امان کا مسئلہ، کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ یہی کروز کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے دنیا کو سمندر میں جا کر بھلانے کا مشن ہوتا ہے۔ اس میں کروز پر جانے والوں کے شب و روز گزرتے ہیں۔ مگر 11 ستمبر کی صبح جب پاکستانی تاجر معمول کے مطابق ناشتہ کے لیے اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ ریسٹورینٹ میں بیشتر مہمان ٹی وی کے آگے بیٹھے ہیں، کچھ کھڑے ہیں۔ سب پریشان لگ رہے تھے۔ کسی نے اس تاجر کے پوچھنے پر بتایا کہ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور میں آگ لگ گئی ہے۔ ایک ٹاور کی آگ کے شعلے لوگ ٹی وی پر دیکھ رہے تھے کہ دوسرے ٹاور سے ایک طیارہ کہیں سے آ کر ٹکرایا اور ٹاور زمین بوس ہو گیا۔ اس واقعہ سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، کئی ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔ یہ بڑا ٹریجک

ماحول تھا۔ واقعہ ہی کچھ ایسا تھا۔ امریکہ کی پاور کی علامت ٹریڈ ٹاور آن واحد میں ملبہ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ ہر شخص اس سانحہ پر افسوس کر رہا تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ یہ پاکستانی اپنے کیبن میں واپس گیا۔ بھتیجا ساتھ ہی تھا۔ رات کو کسی وقت اچانک اس کی آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے سینے پر بیٹھا ہے۔ اس نے دیکھا تو اندھیرے میں کئی سائے لہرا رہے تھے۔ یہ ایف بی آئی کے ایجنٹ تھے جو اس پاکستانی تاجر کو قابو کر چکے تھے۔ اس کا قصور کیا تھا؟ اس کو کئی روز کے ٹارچر کے بعد بتایا گیا کہ اس کی نقل و حرکت غیر معمولی قرار دی گئی تھی۔ کروز لائنر پر موجود سیکریٹ ایجنٹوں نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ یہ پاکستانی نہ شراب پیتے تھے نہ خواتین سے گھلتے ملتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ کس مقصد کے لیے کروز پر آئے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا کہ انتہا پسند ہیں یا بنیاد پرست جو کسی مشن پر ہیں۔ تاجر کو پہلے بری طرح زدو کوب کیا گیا۔ کپڑے تک پہننے کی مہلت نہ دی گئی۔ اس کو نیم برہنہ حالت میں ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اس کی چیخ و پکار پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ایجنٹ کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ اسے ایک ایسے تنگ کمرے میں بند کر دیا گیا جس کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ اسے بھوکا پیاسا اس کمرے میں رکھا گیا۔ نہ پانی دیا گیا نہ کھانا۔ بڑی مشکل سے ضرورت کے لیے باہر نکالا گیا۔ اس تاجر کا برا حال تھا۔ اس نے لاکھ دہائی دی کہ اس کا قصور کیا ہے؟ اس کا جرم کیا ہے؟ لیکن کوئی بتانے کو تیار نہ تھا۔ سیکورٹی حکام نے صرف اتنا بتایا کہ آپ کی سرگرمیاں مشکوک پائی گئی تھیں۔ سارے معاملے کی انکوائری کی جائے گی۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے واقعہ سے اس تاجر کا کوئی واسطہ نہیں تھا مگر اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسلم اور پاکستانی تھا۔ تفتیش کے دوران اس تاجر سے سینکڑوں سوالات کیے گئے۔ پیدائش سے لے کر میٹرک، انٹر، ایم بی اے ساری تعلیم کے بارے میں پوچھا گیا۔ شادی بیاہ، بچوں، خاندان سب کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو امریکیوں کی اسکروٹنی سے رہ گیا ہو۔ یہی حشر بھتیجے کا ہو رہا تھا۔ دونوں اس گھڑی کو کوس رہے تھے جب کروز پر آنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تفریح بہت مہنگی پڑی تھی۔ یہ تو عذاب بن گئی تھی۔

کسی مقام پر کروز لائنر سے دونوں پاکستانیوں کو باہر نکال کر پھر ایف بی آئی کے حوالے کر دیا گیا۔ انکوائری اور اسکروٹنی کا نیا عذاب شروع ہو گیا تھا۔ تاجر کی قسمت اچھی تھی کہ اس کے پاس کریڈٹ کارڈ تھے۔ ان کریڈٹ کارڈوں سے اس کے دوروں سے لے کر خریداری تک ایک ایک چیز کا ریکارڈ نکال لیا گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی جان چھوٹی۔ رہائی پاتے ہی اس تاجر نے پاکستان کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ کٹوایا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بھتیجے کو اس کی یونیورسٹی واپس بھجوا دیا۔ طیارہ روانہ ہونے سے پہلے ہر گھڑی عذاب لگ رہی تھی۔ کئی بار مسافروں اور جہاز کی تلاشی لی گئی۔ طیارہ میں واش روم تک میں جانے پر پابندی تھی۔ یہ مختلف قسم کی مصیبت تھی۔ اس تاجر کے مطابق کراچی کا ساحل اسے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا جتنا اس دوپہر کو لگا جب وہ دبئی سے کراچی پہنچا۔ سمندر پار تفریح کا سفر اس کے لیے اذیت ناک سفر بن گیا تھا۔

شیر خوار بچوں کے سوداگر

پاکستان میں شیر خوار بچے بیرون ملک اسمگل ہو رہے ہیں۔ معصوم بچوں کی منظم طریقہ سے فروخت کی جا رہی ہے۔ کوئی اور معاشرہ ہوتا تو اس واقعہ سے ہل جاتا جو کراچی میں 15 مارچ 2002ء کو ہوا جب ایسے شیر خوار بچے برآمد ہوئے جو مالٹا بھیجے جا رہے تھے پولیس نے اس برآمدگی کو بڑا کارنامہ قرار دیا ہے مگر نہ جانے کتنے ایسے بچے ہوں گے جو ماؤں کی گودوں سے چھین کر کہیں پادری بنائے جا رہے ہوں گے۔ کہیں ان کو معذور کر کے بھیک منگوائی جا رہی ہوگی۔ روشن پاکستان کے اجالے تاریک راہوں کی نذر کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ المیہ کب ختم ہوگا۔ پولیس ایف آئی اے سمیت قانون نافذ کرنے والے درجنوں ادارے کب تک خاموش مجرم کا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ حکومت اور سیاستداں خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔ بچوں کی اسمگلنگ کے واقعہ کے منظر عام پر آنے کے باوجود نہ بے نظیر بھٹو جیسی ماں کا دل پسیجا نہ حال ہی میں باپ بننے والے الطاف حسین کو رحم آیا ہے، نہ روز واپسی کا اعلان کرنے والے نانا نواز شریف نے کسی دکھ کا اظہار کیا ہے۔ اگر یہ واقعہ کسی کم ترقی یافتہ ملک میں بھی ہوتا تو پورا معاشرہ سراپا احتجاج بن جاتا۔ ہمارے ہاں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی ہے۔ کراچی میں بچوں کو اسمگل کرنے والا گروہ پکڑا گیا ہے جو عرصہ سے اس کاروبار میں ملوث تھا۔ قانون کی رسی بدقسمتی سے مجرموں کے لیے اتنی ڈھیلی رکھی جاتی ہے کہ جب چاہتے ہیں جان چھڑا کر فرار ہو جاتے ہیں۔ جس جرم کے کرنے پر

پکڑے جاتے ہیں اس کا ارتکاب دلیری سے دوبارہ شروع کردیتے ہیں۔ کراچی میں بچوں کی اسمگلنگ میں ملوث جو گروہ اب پکڑا گیا ہے چار سال قبل ایف آئی اے کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا جس پر اس وقت چھ شیر خوار بچوں کی اسمگلنگ کا الزام تھا جن کو بیرون ملک منتقل کیا جارہا تھا مگر اس وقت اس کیس کے بڑے ملزم نے خود کو بچوں کا باپ ظاہر کردیا۔ عدالت نے اسے یہ ثابت کرنے کی ہدایت کی اس کے بعد نہ عدالت نے پوچھا کہ ثبوت کا کیا بنا نہ پولیس کو کوئی فکر لاحق ہوئی۔

ملزمان کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد دوبارہ سرگرم ہوگئے۔ ایک اندازہ کے مطابق 58 بچے صرف مالٹا منتقل کیے گئے ہیں۔ ملزمان کا اصرار ہے کہ یہ بچے زبردستی نہیں بھیجے گئے۔ سرغنہ کی اہلیہ کے مطابق ہم نے بچے بیگ یا بریف کیس میں رکھ کر اسمگل نہیں کیے اپنے بچوں کی طرح لے کر گئے ہیں۔ قانونی ماہرین اس دعویٰ کو چیلنج کرتے ہیں۔

شیر خوار بچوں کی تجارت میں ملوث گروہ کے آٹھ ملزمان کو گرفتار کرلیا گیا ملزمان کے قبضہ سے گیارہ شیر خوار بچے برآمد کرلیے گئے۔ ملزمان میں پانچ عورتیں شامل تھیں۔ یہ بچے 15 روز سے 150 روز تک کے تھے۔ بچوں کو بازیابی کے بعد ایدھی ٹرسٹ کے حوالے کردیا گیا۔ اس ڈرامہ کا آغاز گلشن اقبال کے بلاک 13 ڈی ون میں بنگلہ نمبر A-29 میں مشکوک سرگرمیوں سے ہوا۔ آمد و رفت مشکوک افراد کی صبح سے شام تک جاری رہتی تھی۔ پولیس کے ایس ایچ او سہیل فیض مقرر ہوئے تو انہوں نے نگرانی شروع کرائی جس کے بعد بنگلہ پر چھاپہ مارا گیا تو 11 شیر خوار بچے برآمد کیے گئے جو سارے کرسچن تھے۔ پولیس نے ملزمان ڈینس ڈیرک جوز کی عزیز اور ان کی ساتھی عورتوں جوائس مارشل، زینت نسرین، پروین اور شازیہ کو گرفتار کرلیا۔ ملزمان کا سرغنہ ڈینس ہے جس کی بیوی کو نچیا مالٹا میں ہے۔ یہ گروہ اسپتالوں سے شیر خوار بچے چوری کرتا تھا بچوں کی خریدار کرکے بیرون ملک فروخت کرتے تھے بچہ 20 ہزار میں فروخت کیا جاتا تھا۔ بچوں کو مالٹا اسمگل کیا جاتا تھا جہاں ان کو کرسچن ظاہر کرکے ملزمان ان کی فروخت کرتے تھے۔ مالٹا میں ایسے بچوں کی منڈی قائم

ہے۔ جہاں ایسے بچوں کو پرورش کے لیے خریدا جاتا ہے۔ اس طرح ملزمان بچوں کی فروخت سے بڑی رقم حاصل کر لیتے تھے۔ کسی کو پادری بنانے کا جھانسہ دیا جاتا تھا کسی کو بہتر مستقبل کا خواب دکھایا جاتا تھا۔ بچوں کے سوداگروں کا یہ گروہ 1998ء میں پکڑا گیا جن کے قبضہ سے 6 بچے برآمد ہوئے تھے ملزمان عدالت سے ضمانت پر رہا ہو گئے تھے۔ بڑا ملزم فرار ہو گیا تھا۔ اس سے قانون کے اداروں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ جن کی ناک کے نیچے یہ سارے واقعات ہو رہے تھے مگر قانون حرکت میں نہیں آ رہا تھا۔ پولیس سماجی کارکن سب اس کھیل میں ملوث تھے۔

گورنر سندھ محمد میاں سومرو نے بچوں کی اسمگلنگ کے کیس کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔ جنہوں نے ہدایت کی ہے کہ منظم گروہ کے ارکان کو پکڑا جائے اس معاملہ کی پوری تفتیش کی جائے تاکہ ملزمان سزا سے نہ بچ سکیں مگر گورنر نے یہ صحیح بات کہی ہے کہ اس طرح کی وارداتوں کے قلع قمع کے لیے پولیس عوام اور فلاحی اداروں میں تعاون ضروری ہے۔ یہ تعاون مستقل بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ورنہ ایسے واقعات ہوتے رہیں گے کچھ دنوں اخبارات کی زینت بنیں گے پھر فراموش کر دیئے جائیں گے۔

شیرخوار بچوں کے والدین پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ خود والدین کر سکتے ہیں۔ مگر غربت پسماندگی، جہالت اور لاچارگی ایسے مجرموں کی مدد کر رہی ہے جو غریبوں کے بچوں کی فروخت سے ڈالر اور پاؤنڈ کمانے کے در پے ہیں۔ بعض بچوں کا ان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی سودا کر لیا جاتا ہے۔ کراچی میں اغوا ہونے والے تین بچوں کے والد سجاد مسیح نے بتایا کہ اس نے اپنے تین سالہ بیٹے شازل 11 ماہ کے بچہ جانسن کو جوکھیو ولیج ملیر میں ایک شخص ملک تاج کے حوالے کیا اس نے وعدہ کیا تھا کہ ان بچوں کو امریکہ بھیج دے گا جہاں ان کو بڑا ہونے پہ تربیت دے کر پادری بنا دیا جائے گا یہ بچے 18 سے 20 سال تک وہیں رہیں گے امریکن گرین کارڈ اور شہریت حاصل کریں گے اس طرح ہمارے غریب خاندان کے دن پھر جائیں گے۔ ساجد مسیح نے کہا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا کہ بچوں کو

خود جا کر امریکہ میں دیکھ سکتا ہوں آنے جانے کے اخراجات مجھے ادا کیے جائیں گے۔ ساجد مسیح نے روتے ہوئے کہا جب میں نے بچے حوالے کرنے کے دو ماہ بعد ملک تاج سے پوچھا کہ کیا بچوں کو دیکھ سکتا ہوں تو اس نے کہا کہ بچوں کو امریکہ بھیج دیا گیا ہے۔ سجاد مسیح سے وعدہ کیا گیا تھا کہ پہلے بچے ایک سال تک کراچی میں رہیں گے پھر ان کو امریکہ بھیج دیا جائے گا۔ مگر جب سجاد مسیح کو معلوم ہوا کہ بچے گروہ کے نرغہ سے برآمد کر کے ایدھی ٹرسٹ کے حوالے کر دیئے گئے ہیں تو ان کی شناخت کرنے کے لیے ایدھی ہوم پہنچ گیا۔ سجاد نے اپنی تین سالہ بھتیجی ارم کو جو اس کے مرحوم بھائی ستار کی یتیم بیٹی ہے اس گروہ کے حوالے کیا تھا۔ غریب بچوں پر قسمت کیا ظلم ڈھاتی ہے یہ بدنصیب ایک گود سے دوسری گود منتقل ہوتے رہتے ہیں کبھی والدین کی غربت کے ہاتھوں کبھی بہتر مستقبل کی آس میں ان کو تاریکی کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ شیریں جناح کالونی کے جاوید مسیح نے اپنی آٹھ دن کی بچی کو ایک جوڑے شوکت اور اس کی بیوی کے حوالے کر دیا تھا جب اس کی بیوی حاملہ تھی اس کی بچی کی ڈیل کر دی گئی تھی۔ دونوں نے جاوید سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بچی کو اولاد سے محروم والدین کو دے دیں گے، بچی کی قسمت سنور جائے گی تمہارے بھی دن پھر جائیں گے۔ جاوید مسیح نے جو چار بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ ہے، بتایا کہ اسے بچی کی فروخت کے عوض 20 ہزار روپے دیئے گئے۔ اسی طرح پاکستان کے کمرشل کیپٹل روشنیوں کے شہر کراچی میں ایک اور بچی کا سودا ہو گیا تھا۔ اس بچی نے اٹھارہ اگست 2001ء کو جنم لیا۔ جب کراچی کے شیر خوار بچے ایدھی ہوم پہنچائے گئے عبدالستار ایدھی اور ان کی اہلیہ کی گود میں تھے۔ انہوں نے کہا ایسے والدین کا تانتا بندھ گیا ہے جن کے بچے گود سے چھینے گئے ہیں مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ صحیح تصدیق اور میڈیکل ٹیسٹ کے بغیر کسی کا بچہ کسی دوسرے کے حوالے کر دوں۔ یہ اس سے بڑی زیادتی ہوگی ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر کوئی بچہ کسی کے حوالے نہیں کروں گا یہ اس بے رحم معاشرہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں عبدالستار ایدھی جیسے فرشتہ رحم دل انسان کی شکل میں موجود ہیں۔

ایدھی ٹرسٹ کے عبدالستار ایدھی نے بتایا کہ صرف کراچی کے ایدھی ہوم میں 17 سو بچے ایسے ہیں جن کے والدین کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان بچوں کو ایدھی ہوم میں خوراک اور رہائش فراہم کی جا رہی ہے۔ لاوارث بچوں کی دیکھ بھال میں ایدھی ٹرسٹ بنیادی نوعیت کی ذمہ داریاں انجام دے رہا ہے۔ صرف کراچی میں لاوارث بچوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو ریلوے اسٹیشنوں گیراجوں تفریح گاہوں پارکوں ورکشاپوں میں سوتے ہیں جن کے سر پر کوئی چھت نہیں ہے۔

شیر خوار بچوں کو گود لینے کا رجحان انٹرنیٹ کی بدولت بہت بڑھ گیا ہے اس طرح اس کیس میں ہائی ٹیکنالوجی آ گئی ہے۔ یونیسیف کے مطابق لاطینی امریکہ میں کمسن بچوں کی بڑی مانگ ہے بچوں کی فروخت کا کاروبار اس مانگ کی وجہ سے چمک گیا ہے۔ اس کے لیے بچوں کی خریداری اسمگلنگ سپلائی سب ہو رہی ہے۔ یہ ایک کاروبار ہے۔ مغرب کی نظریں تیسری دنیا کے غریب والدین اور ان کے غریب بچوں پر ہیں۔ پاکستان بھارت بنگلہ دیش سے بچے لیے جا رہے ہیں اب مغرب کی توجہ افغان یتیموں پر ہے جن کے والدین جنگ میں ہلاک ہو گئے۔ مگر یہ شیر خوار بچے مالٹا کیوں اسمگل ہو رہے ہیں؟ مالٹا ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی معیشت میں سیاحت کے ساتھ ساتھ بچوں کو گود لینے کی صنعت کا بڑا کردار ہے۔ مالٹا کے جو جوڑے اولاد سے محروم ہیں ان کو پاکستانی بچے بہت پسند ہیں۔ عیسائی ہونے کی وجہ سے ان کو عیسائی بچے بھیجے جاتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کاروبار کو سوشل ورک کا لیبل لگایا جا رہا ہے۔ ایک پاکستانی ڈینس چارلس جس نے پاکستانی شہریت ترک کر کے مالٹا کی شہریت لے لی ہے اس کا اصرار ہے کہ یہ سوشل ورک ہے اسے جو غریب اور لاوارث بچہ ملے گا اسے مالٹا بھیج دے گا۔

پاکستان کے معصوم بچوں پر کیا بیت رہی ہے، یہ صورتحال صرف بچوں کی اسمگلنگ تک محدود نہیں ہے 30 ستمبر 1997ء کو سائٹ کے ایک اسپتال میں ایک خاتون مسز حبیب الرحمٰن نے دو بچوں کو جنم دیا اسپتال نے صرف ایک بچہ ان کے حوالے کیا۔ ماں

دوسرے بچہ کا پتہ کرتی رہی اسپتال کی انتظامیہ بہانے کر کے ٹالتی رہی والدین سخت پریشان تھے، وہ کسی صورت مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ اسپتال کی انتظامیہ کبھی کہتی تھی بچہ بیمار ہے کبھی کہتی تھی کہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ چار ماہ بعد حبیب الرحمٰن نے انسداد دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا اور اسپتال کے اسٹاف پر نومولود بچہ کے اغوا کا کیس قائم کردیا۔ مگر اسپتال کے وکیل نے چیلنج کردیا کہ یہ مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ جج نے 1999ء میں کیس کو سیشن عدالت میں منتقل کردیا جہاں اب تک متاثرہ والدین پیشی بھگت رہے ہیں ان کے ایک بچہ کا کیا بنا؟ اسپتال نے عدالتوں کی قدیم راہداریوں میں پناہ لے لی جہاں ایسے ہزاروں مقدمات التوا میں پڑے ہوئے ہیں یہ انصاف کی صورتحال ہے۔

پولیس کے مطابق ملزمان کا گروہ جن بچوں کو فروخت کرتا تھا ان میں دو قسم کے بچے تھے ایک تو لاوارث بچے ہیں ایسے بچے جو ناجائز ہیں جن کے گناہگار والدین ان کو تاریک راہوں میں چھوڑ جاتے ہیں اس طرح گناہگار والدین کی کہانی ختم ہوتی ہے اور ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے۔ بچوں کی پردیس میں نئی زندگی کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ بچوں کو نیا ماحول نیا گھر نئے سرپرست مل جاتے ہیں۔ دوسیر کیٹگری ایسے بچوں کی ہے جن کے والدین غریب ہیں اپنے بچے پال نہیں سکتے ان کی خوراک کی ضروریات پوری نہیں کرسکتے نہ پرورش کرسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسے والدین حالات سے مجبور ہو کر اپنے بچوں کو ایسے لوگوں کے حوالے کردیتے ہیں جو ان کی پرورش کرسکتے ہیں ان کو خوراک اور رہائش فراہم کرسکتے ہیں۔

بچوں کے استحصال کی کہانی بچوں کی اسمگلنگ اور تجارت تک محدود نہیں ہے۔ کچی آبادیوں میں رہنے والے بھکاری خاندان یومیہ کرایہ پر شیرخوار بچے حاصل کرلیتے ہیں۔ جن کو نشہ آور دوا کھلا کر بے ہوش کردیا جاتا ہے ان کو نوجوان بھکارنیں گود میں اٹھا کر ان کی بدولت بھیک مانگتی ہیں۔ معصوم کم عمر بچوں کو دبئی میں اونٹوں کی دوڑ میں استعمال کیا

جاتا ہے جس میں زیادہ تر سرائیکی بیلٹ کے غریب بچے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ڈالر ریال اور درہم کے لالچ میں یہ بچے خاک اور خون میں رنگ دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کے لاوارث بچوں کا کیا بنے گا؟

پاکستانی حکمرانوں کے ملبوسات

صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکی جریدے ویکلی نیوز ویک کے نمائندوں کو انٹرویو دیا تو صدر ارمانی کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھے۔ ارمانی کے سوٹ ہر طبقہ میں مقبول ہیں ارمانی کی قمیض پانچ سو ڈالر سے پانچ ہزار ڈالر تک کی ہوتی ہے۔ اسی طرح سوٹ کی قیمتیں ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں دولتمند افراد بڑے شوق سے ارمانی کے ملبوسات خریدتے ہیں جن میں نوجوان ادھیڑ عمر اور بوڑھے شامل ہوتے ہیں، ارمانی کو فیشن کی دنیا کا ٹاپ ڈیزائنر قرار دیا جاتا ہے، نئی دہلی کی سفید شیروانی سے اسلام آباد کے ارمانی سوٹ تک صدر جنرل پرویز مشرف نے لباس کے معاملہ میں خاطر خواہ سفر طے کیا ہے۔ نئی دہلی میں ان کی اڑتی ہوئی شیروانی بھارتیوں کی یونیفارم کے سامنے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ بھارتیوں نے جان بوجھ کر گارڈ آف آنر کے لیے ایک لمبے قد کے بھارتی فوجی افسر کا انتخاب کیا تھا تاکہ پاکستانی صدر اس کے ساتھ چلتے ہوئے چھوٹے نظر آئیں۔ جنرل پرویز مشرف نے یہ اسکیم تیز تیز چل کر ناکام بنادی مگر ہوا میں ان کی اڑتی ہوئی شیروانی کسی کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کئی پاکستانیوں نے ای میل کے ذریعہ اس پر ناخوشی کا اظہار کیا کہ پاکستانی صدر کے ڈریس ڈیزائنر نے زیادتی کردی تھی۔ ناکام آگرہ مذاکرات کے بعد صدر کے اسٹاف کو احساس ہوا یا خود ان کی امریکہ میں مقیم فیملی کی طرف سے توجہ دلائی گئی۔ اس کے بعد سے صدر زیادہ تر سوٹ یا یونیفارم میں نظر آنے لگے۔ صرف افغان بحران کے ابتدائی دنوں میں صدر قدرے غیر رسمی لباس میں نظر آئے۔ سیاستدانوں سے صلاح و مشوروں کے

دوران صدر نے سوٹ پہننے سے گریز کیا۔ تاہم افغان جنگ کے دوران عالمی سربراہوں سے ملاقاتوں میں جنرل پرویز مشرف جدید ترین سوٹ میں نظر آئے بلکہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور امریکی وزیر خارجہ کولن پاول سے ملاقاتوں میں وہ ان سے بہتر جدید سوٹ میں نظر آ رہے تھے۔ ڈریس وار پاکستانی صدر جیت چکے تھے۔ جنرل پرویز مشرف کو ویسٹرن ڈریس کے معاملہ میں ''بھٹو ان یونیفارم'' کہا جاسکتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو مغربی ملبوسات کے رسیا تھے، ویل ڈریس تھے مگر پاکستان میں قمیض شلوار کا سوٹ رائج کرنے میں ان کا بنیادی ہاتھ تھا۔ ان ہی کی بدولت قمیض شلوار واسکٹ پہن کر عام پاکستانی فائیو اسٹار ہوٹلوں اور کلبوں میں آسانی سے جاسکتا ہے کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ بھٹو کو اپنی خوش لباس پر ناز تھا جب نصرت اصفہانی نے جو بعد میں بیگم نصرت بھٹو بنیں کراچی میں ان کے لیے یہ استفسار کیا کہ ''بھٹو کون ہے'' تو ذوالفقار علی بھٹو نے خوش لباس نصرت اصفہانی کا چیلنج قبول کرلیا اور ان کو بیگم نصرت بھٹو بنا کر دم لیا۔ دونوں کو کراچی کی محفلوں میں ویل ڈریس جوڑا کہا جاتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹنے والے جنرل ضیاء الحق فوجی وردی میں آئے انہوں نے کم عرصہ میں شیروانی پہن لی مگر سیاستدانوں کو دھمکی دیتے وقت یہ ضرور کہتے تھے کہ آپ مجھے خواہ کچھ کہیں اس وردی کا آپ کو احترام کرنا پڑے گا۔ جنرل ضیاء الحق کے مخالفین مسلسل مطالبہ کرتے رہے کہ وہ وردی اتار کر سیاست کے میدان میں آئیں۔ یہ مطابہ انہوں نے کبھی قبول نہیں کیا بلکہ یونیفارم ہی میں موت کو گلے لگایا۔ ان کو وردی کے بغیر دیکھنے کی ان کے مخالفین کو حسرت ہی رہی۔

جنرل ضیاء الحق تقریبات میں شیروانی میں جاتے تھے سوٹ شاید ہی کبھی پہنا ہو ایک بار ان کو ڈھیلی سی شرٹ اور پینٹ میں گالف کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ سائیکل کی سواری تک یونیفارم میں کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے وزیراعظم کے لیے سندھڑی کے محمد خان جونیجو کا انتخاب کیا جو کسی لحاظ سے ویل ڈریس نہیں تھے مگر شریف آدمی تھے، اپنی شرافت کے باوجود اپنی حکومت کی معیاد مکمل نہیں کر سکے۔ ان کو جنرل ضیاء الحق نے گھر بھیج

دیا۔ جونیجو عوام کی عدالت میں انصاف کے لیے نہیں جا سکے۔ انہی کے دور میں بے نظیر بھٹو
ضیاء جاوے جاوے کا نعرہ لگا کر آئیں تو سوسی کے سوٹ میں ملبوس تھیں۔ سارے پاکستانی
ان کی طرف لپک پڑے۔ بے نظیر بھٹو کو عینک لگانی پڑی تا کہ قدرے معمر نظر آئیں۔ پرائم
منسٹر کے عہدہ کے لیے ان کو کم عمر سمجھا جا رہا تھا، بے نظیر بھٹو اس دور میں تیز تیز چلا کرتی
تھیں، کارکن اور لیڈر ہانپتے ہوئے ان کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ جو مداح ان کا دور سے
نظارہ کرتے تھے ان میں آصف علی زرداری شامل تھے جو بعد میں ان کے شوہر بنے۔
آصف علی زرداری کو کبھی ویل ڈریس نہیں سمجھا گیا کنوارے دنوں میں ان کو محبوب لباس
سفید قمیض شلوار سیاہ پشاوری سینڈل کے ساتھ تھا۔ عام طور پر اس ڈریس میں بلڈر کی
حیثیت سے کے ڈی اے کے دفتروں میں دیکھے جاتے تھے۔ جب ان کی بے نظیر بھٹو کے
ساتھ منگنی ہوئی تو پاکستان کے عوام کی مقبول لیڈر کے ساتھ سوٹ میں نظر آئے۔ زرداری
بالکل نئے لگ رہے تھے۔ اس شادی سے ان کے مرد اول بننے کی راہ ہموار ہوگئی تھی تاہم
وزیراعظم کے شوہر کی حیثیت سے جس پروٹوکول کی ان سے توقع کی جا رہی تھی پورا نہیں
کر سکے۔ ایک اسلامی حکمران کے سامنے پشاوری چپلیں پہنے بیٹھے تھے جس کو ان کے
مداحوں تک نے پسند نہیں کیا۔ آصف زرداری اس عوامی اسٹائل کو برقرار رکھنے کا تہیہ کر چکے
تھے۔ ان کو اس کی پروا نہ تھی کہ عوام ان کے اس انداز سے ان کے بارے میں کیا رائے
قائم کر رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوئی تو انہوں نے قمیض شلوار کا
ڈریس دوبارہ اکثر و بیشتر پہننا شروع کر دیا۔ بے نظیر بھٹو نے یہ جدت کی کہ روایتی قمیض
شلوار پر بے ہنگم سا کوٹ پہننے لگیں، اس لباس کو عام طور پر تھیچر ڈریس کہا جاتا تھا تھیچر سے
خود بے نظیر بھٹو بہت متاثر تھیں۔ سیاست میں ان کے مشورہ پر پوری طرح عمل کرتی تھیں۔
بے نظیر بھٹو کے دیرینہ مخالف (موجودہ اتحادی) نواز شریف کو لباس کے معاملہ
میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ قمیض شلوار پہنتے اور پسند کرتے تھے۔ لائٹ بلیو قمیض
شلوار پر ڈارک بلیو واسکٹ ان کا سب سے پسندیدہ ڈریس تھا۔ ایک مسلم لیگی رہنما کے

مطابق کوئی ان کے کسی ڈریس کی تعریف کردے تو سارے دوستوں کو وہی ڈریس بنوا کر دیتے تھے۔ دوستوں کو ہر لحاظ سے نوازنے کے قائل تھے۔ ان کے بھائی شہباز شریف کا ڈریس ان سے کسی طور پر مختلف نہ تھا سوائے اس کے کہ شہباز شریف کبھی کبھار ویسٹرن سوٹ پہن لیتے تھے۔ مگر نواز شریف ہوں یا شہباز شریف دونوں مغربی لباس پہننے کے باوجود خود کو فخر سے میڈ ان پاکستان کہتے ہیں۔ جو سیاستدان روایتی لباس زیب تن کرتے ہیں ان میں پیر صاحب پگاڑو، مولانا شاہ احمد نورانی، قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن نمایاں ہیں۔ پیر صاحب پگاڑو ماضی میں مغربی لباس شوق سے پہنتے تھے اب بڑے عرصہ سے سفید قمیض شلوار پر سفید واسکٹ استعمال کرتے ہیں۔ ہوانا کے سگار کے بدستور شوقین ہیں۔ ان کے ساتھی نوابزادہ نصر اللہ کو بھی سگار پسند ہیں مگر ان کا حقہ بازی لے گیا ہے نوابزادہ نصر اللہ سیاہ اور کریم اچکن پہنتے ہیں اس پر ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ بزرگ سیاستدان سردار شیر باز مزاری سفید کرتا شلوار واسکٹ استعمال کرتے ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی دن میں سفید قمیض شلوار رات میں پارٹیوں میں ڈنر جیکٹ پہنتے ہیں۔ جتوئی کے پاس سینکڑوں خوبصورت ٹائیاں ہیں جو سوٹ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ولی خان کا خاندان انگریزوں کے خلاف رہا ہے۔ ولی خان ان کے صاحبزادہ اسفند یار ولی سفید قمیض شلوار پہنتے ہیں۔ اجمل خٹک قمیض شلوار پر براؤن چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ بلوچ سردار نواب اکبر بگٹی اور عطاء اللہ مینگل دونوں مغربی اور پاکستانی لباس پہنتے ہیں۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے اپنی سیاست کی ابتداء میں مہاجر لباس متعارف کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کے کئی حامیوں تک نے کرتا پاجامہ اور سلیم شاہی جوتا پہننے سے انکار کر دیا۔ 1988ء کی قومی اسمبلی میں جب متحدہ قومی موومنٹ کے منتخب ارکان داخل ہوئے تو وزیٹر گیلری سے تبصرہ کیا گیا کہ یہ نیپالی ارکان کہاں سے آ گئے۔ 1988ء سے 2002ء تک دریائے سندھ اور دریائے ٹیمز کے پلوں تلے بہت پانی بہہ گیا اب الطاف حسین تھری پیس سوٹ پہنتے ہیں، کرتا پاجامہ شاید بھول چکے ہیں۔

سیاستدان کیا کھاتے ہیں؟

ڈیفنس کے ایک بنگلہ میں رونق دور سے نظر آ رہی تھی۔ اے این پی کے صدر اسفند یار ولی خان پیپلز پارٹی کراچی کے صدر مظفر شجرہ کے مہمان تھے۔ جب مخدوم امین فہیم کی آمد میں تاخیر ہوئی تو میزبان مہمانوں کو کھانے کی میز پر لے گئے۔ انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ میزبان کے ملازم دوڑ دوڑ کر گرم گرم مچھلی لا رہے تھے۔ اسفند یار ولی کو سندھی اسٹائل میں پکی ہوئی مچھلی بہت پسند آئی۔ سندھ میں پلہ مچھلی بہت مقبول ہے جس کو مختلف انداز میں پکایا جاتا ہے۔ سارے سیاستدان اس مچھلی کے رسیا ہیں جس کو سندھ میں ایک اعلیٰ ڈش کی حیثیت حاصل ہے۔ اسفند یار ولی نے کہا ''میں جب کراچی آتا ہوں میرے دوست میرے لیے کھانے کا انتظام کرتے ہیں، میں لازمی طور پر ان کے لنچ اور ڈنر میں شرکت کرتا ہوں''۔

سندھ کی مہمان نوازی کی روایت کے سب قائل ہیں۔ مچھلی اور مرغی ان سیاستدانوں کی پسندیدہ خوراک ہے۔ ہر انداز سے مچھلی اور مرغی کو بنایا جاتا ہے۔ اپنا وزن کم کرنے کے شوقین بھی وائٹ میٹ رغبت سے کھاتے ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کی دعوت میں مچھلی کے قیمہ کی ڈش بہت پسند کی جاتی ہے۔ یہ مچھلی خاص طور پر کیٹی جتوئی کی جھیل میں پکڑی جاتی ہے۔ جتوئی بہت مہمان نواز ہیں۔ ایک ایک مہمان کو خود پلیٹ دیتے ہیں۔ جب تک سارے مہمان کھانا نہ لے لیں خود کبھی کھانا شروع نہیں کرتے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی

روایتی قسم کے انسان ہیں۔ کوئی ملنے کے لیے پروگرام کے بغیر چلا جائے تو بھی حیدر آباد کی مشہور بمبئی بیکری کے کیک سے تواضع کرتے ہیں۔ سموسے خود جتوئی ہاؤس میں تیار کرائے جاتے ہیں۔ حیدر آباد کا کیک سندھ کے سیاستدانوں میں بہت پاپولر ہے۔ اس کے بغیر ان کی چائے نامکمل رہتی ہے۔ کیک کا کوئی وقت نہیں ہے۔ صبح دوپہر شام ہر وقت کھایا جاتا ہے۔ جتوئی سادہ مزاج انسان ہیں۔ ڈنر اور لنچ میں روایتی انداز میں کھانا کھاتے ہیں۔ چاول ہاتھوں سے کھانا پسند کرتے ہیں۔ آم ہوں تو چاولوں سے ملا کر کھاتے ہیں۔ سندھ میں اسے بڑی پسندیدہ ڈش سمجھا جاتا ہے۔

سندھ کے دارالحکومت کراچی میں آم سے روٹی کھانے کا بعض گھرانوں میں رواج رہا ہے۔ آم پھلوں کا بادشاہ ہے، اسے کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری دونوں کو آم پسند ہیں مگر آم روٹی اور چاول کے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کو چکن کے آئٹم پسند ہیں مگر آلو چھولے، دہی بڑے دیکھ لیں تو ان کا ہاتھ نہیں رکتا۔ آلو چھولے بڑے شوق سے کھاتی ہیں، میٹھا کھانے میں احتیاط سے کام لیتی ہیں۔ آئس کریم ان کو بہت پسند ہے۔ طویل جلاوطنی کے دوران بے نظیر بھٹو کو دبئی، لندن، نیویارک کی آئس کریم کھانے کا موقع ملا ہے مگر جب پاکستان میں ہوں اور آزاد ہوں تو بلوچ کی آئس کریم کھانے ضرور جاتی ہیں۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی آئس کریم ان کو پسند ہے۔ کیک پیسٹری شوق سے کھاتی ہیں، ڈاکٹروں اور سہیلیوں کے منع کرنے کے باوجود چاکلیٹ کیک پر ہاتھ مار دیتی ہیں۔ کراچی میں سندھ کلب کا سنڈے برنچ ان کو پسند ہے، فرصت سے ہوں تو قریبی سہیلیوں اور مشیروں کو مدعو کرتی ہیں۔ جس کو مدعو کریں خواہ دولت مند ہوں یا اوسط طبقہ کا یا غریب، اس کے لیے آملیٹ بنوا کر لاتی ہیں۔ اپنے آملیٹ کو بھاری بھر کم بنواتی ہیں۔ حلوہ پوری، چھولے اور ترکاری کا ناشتہ بھی پسند کرتی ہیں۔ آلو کی ترکاری ان کو بہت پسند ہے، عام طور پر پان سے شوق نہیں کرتیں، اس کو مہاجر کلچر کا حصہ

سمجھتی ہیں۔ کراچی میں پی آئی ڈی سی کا پان شوق سے منگواتی ہیں۔ دبئی اور لندن میں پان آسانی سے دستیاب ہیں اس لیے مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ بے نظیر بھٹو اپنے دانتوں کی وجہ سے خوراک کے معاملہ میں احتیاط سے کام لیتی ہیں۔ اپنے نجی پروگراموں کی پبلسٹی قطعی پسند نہیں کرتیں۔ ایک بار ان کے لنچ میں کئی رپورٹرز اور فوٹو گرافرز دعوت کے بغیر پہنچ گئے۔ بے نظیر بھٹو سخت ناراض نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جس کو مدعو نہیں کیا میں اس کی میزبان نہیں ہوں۔ اس طرح ایک بار بے نظیر بھٹو اپنی سالگرہ پر چند سہیلیوں کو لے کر آئس کریم کھانے گئیں۔ ایک اخبار میں اس کی رپورٹ شائع ہونے پر وہ سخت برہم ہوئیں۔ بے نظیر بھٹو اپنی میزبانی کا موقع چند قریبی لوگوں کو دیتی ہیں مگر میزبان کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ کوئی ناپسندیدہ مہمان تقریب میں نہ پھٹکنے پائے۔ ان کے معاونین اس امر کو یقینی بناتے ہیں۔

آصف علی زرداری جب اقتدار میں تھے ان کے مہمانوں کا یہ حال تھا کہ قلاش آ کر لکھ پتی کروڑ پتی بن کر نکلتے تھے۔ آصف زرداری سندھ کے سیاستدانوں کی طرح مچھلی کے رسیا ہیں۔ بلوچی نژاد ہونے کی وجہ سے بلوچی سجی ان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ سیاستدانوں کے بچوں کو نہ مچھلی سے رغبت ہوتی ہے نہ مرغی سے، ان کی اکثریت برگر اور کوک پسند کرتی ہے، پیزا بھی بچوں کو پسند ہے، امن و امان کی صورتحال بہتر ہو تو سیاستدان اور ان کے بچے باہر کھانے جاتے ہیں ورنہ گھر پر منگوا لیتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو بچوں کی طرح برگر بھی شوق سے کھاتی ہیں۔

مذہبی رہنما مغربی کھانوں کو پسند نہیں کرتے جو بیمار ہیں ڈاکٹروں کے مشوروں پر ابلے ہوئے کھانے کھانے پر مجبور ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر غفور احمد پرہیزی کھانے کھاتے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی دعوت کو ''ماحضر'' کا نام دیا جاتا ہے جس میں ہر قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ مولانا خود ''اسپاگھیٹی'' پسند کرتے ہیں۔ اپنے خاص دوستوں کو پیش کرتے ہیں، ہلکے مصالحہ کا چکن اور شوربہ ان کے لیے الگ بنوایا جاتا ہے، مولانا کو

تیز مرچ پسند نہیں ہے اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا معاملہ پیر صاحب پگاڑو کے برعکس ہے جو کھانے میں ہری مرچ شوق سے کھاتے ہیں کبھی ان کا لقمہ ہری مرچ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ پیر صاحب پگاڑو چکن بروسٹ اور باربی کیو کو عام ڈشوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب کنگری ہاؤس میں مہمانوں کو مدعو کرتے ہیں چکن مچھلی اور بیف کے علاوہ سبزیاں خاص طور پر بنواتے ہیں۔ ان کے باورچی کے بنائے ہوئے کریلے مہمان بہت پسند کرتے ہیں۔ خود پیر صاحب کو بھی کریلے بہت پسند ہیں۔ پیر صاحب پگاڑو حلیم کے رسیا ہیں۔ پی ڈی پی سندھ کے صدر مشتاق مرزا اپنے گھر پر حلیم ہر سال بنواتے ہیں جس میں سارے سیاستدان مدعو ہوتے ہیں۔ مرزا ہاؤس سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس گھر میں ایم آر ڈی کی بنیاد پڑی۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف تحریک اور 1985ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ نوابزادہ نصر اللہ جب کراچی آئیں مرزا ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں جہاں ان کے لیے مختلف قسم کی مچھلیاں اور سبزیاں بنوائی جاتی ہیں۔ نوابزادہ فجر کی نماز اور واک کے بعد فریش جوس، چائے بسکٹ کا ناشتہ کرتے ہیں۔ دوپہر کو معمول کا رات کو ہلکا کھانا لیتے ہیں۔

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین جب خود ساختہ جلاوطنی پر نہیں گئے تھے۔ کڑھی چاول رغبت سے کھاتے تھے ولیمہ کی تقریب میں جو لندن میں ہوئی ہر قسم کے کھانے رکھے گئے جو سارے کے سارے مشرقی تھے۔ بریانی، قورمہ، شیرمال، تافتان، زردہ پلاؤ، گاجر کا حلوہ غرض ہر چیز موجود تھی۔ سندھ کے قوم پرست سیاستدان کھانوں کے بہت زیادہ شوقین نہیں ہیں مگر سندھی بریانی سندھی غیر سندھی تمام سیاستدانوں میں مقبول ہے۔ بلوچ سیاستدان جو قبائلی سردار ہیں شکار کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں۔ نواب اکبر بگٹی پہاڑی بکرے، ہرن اور بارہ سینگھے کا شکار کرتے ہیں۔ مہمانوں کی اسی شکار کے گوشت سے تواضع کرتے ہیں۔

سیاسی گدیاں

پاکستان میں سیاست بھی وراثت میں ملتی ہے

دو بیگمات نے اپنے شوہروں کی رہائی کا مشن لے کر سیاست میں آنے کا اعلان کیا۔ ایک نے شوہر کو رہا کرایا اور جیل سے جلا وطنی میں بھیجنے کے بعد پھر خاموشی سے سیاست چھوڑ دی بمشکل چند ماہ کی سیاست کی یہ تھیں بیگم کلثوم نواز۔ دوسری نے مردوں کے ساتھ مل کر مردانہ وار تحریک چلائی اپنے وقت کے ڈکٹیٹر کو فوج کی مدد سے شکست دی۔ شوہر رہا ہو گئے رہائی کو کئی سال گزر گئے یہ آج تک سیاست میں ہیں یہ ہیں بیگم نسیم ولی خان۔ جیسے مردوں کی سیاست میں فرق ہے عورتوں کی سیاست میں بھی فرق ہے۔ دونوں سرکردہ محترم خواتین مجبوری کے تحت سیاست میں آئی تھیں۔ شوہر جیل میں تھے سیاست میں آنا پڑا دونوں نے اپنے کارڈ چالاکی سے کھیلے ایک نے تحریک چلا کر دوسری نے تحریک چلائے بغیر اپنا مقصد حاصل کیا مگر ایک کو سیاست اتنی پسند آئی کہ اسے پھر چھوڑنا گوارا نہ کیا اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

بیگم نسیم ولی کے شوہر عبدالولی خان نے اپنے دیرینہ مخالف ذوالفقار علی بھٹو پر ہمیشہ یہ تنقید کی کہ خاندانی سیاست کے علمبردار ہیں۔ جب بھٹو کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ سنبھالی تو ولی خان نے سب سے زیادہ اعتراض کیا اور کہا ہم خاندانی سیاست کے خلاف ہیں جی حضور۔ بیگم نصرت بھٹو کو شوہر کی معزولی اور قید کے

بعد سیاست میں آنا پڑا وہ ذوالفقار علی بھٹو کی جان نہیں بچا سکیں فوج کا ہیلی کاپٹر ان کی نظروں کے سامنے سے گزرا جس میں بھٹو کی میت تھی۔

بیگم نصرت بھٹو کو یہ سانحہ سیاست میں کھینچ لایا جنرل ضیاء الحق کے خلاف ایم آر ڈی بنائی۔ پھر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا جب بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئی شوہر کے بعد ایک بیٹے شاہنواز کو کھو چکی تھیں جب مرتضٰی بھٹو جلاوطنی سے واپس آئے تو ماں نے بیٹی کے مقابلہ پر بیٹے کا ساتھ دیا بیٹی نے ماں کو پاکستان پیپلز پارٹی کی تاحیات چیئر پرسن شپ سے ہٹا دیا اور خود چیئر پرسن بن گئیں ماں نے کہا کہ یہ بیٹی سیاست کے لیے سب کچھ کرسکتی ہے ماں بیٹی کے راستے جدا ہو گئے۔ المرتضٰی لاڑکانہ میں فائرنگ ہوئی جانی نقصان ہوا بے نظیر کی حکومت میں بھٹو فیملی کا آبائی گھر محفوظ نہ تھا اسی حکومت میں مرتضٰی بھٹو کی جان گئی جس پولیس کو کراچی میں ایکسٹرا جوڈیشل کلنگز پر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے بہادر کہہ کر خراج تحسین پیش کیا وہی پولیس وزیر اعظم کے بھائی کو انتہائی زخمی حالت میں ہسپتال کے گیٹ پر پھینک کر چلی گئی جو زیادہ خون بہنے کے باعث جانبر نہ ہوسکے۔ فاطمہ بھٹو نے 70 کلفٹن کے باہر فائرنگ کی آواز سن کر دہشت زدہ ہو کر اسلام آباد فون کیا تو فون اٹھانے والے تھے آصف علی زرداری جن کو مرتضٰی نے اپنی زندگی میں کبھی پسند نہیں کیا بیگم نصرت بھٹو اپنے ہواس کھو بیٹھیں اپنی ایک بھانجی سے صرف اتنا کہا میں دنیا کی سب سے بدنصیب عورت ہوں۔ ایک شوہر کی پھانسی دو بیٹوں کی موت۔ دو دامادوں پر قتل کے مقدمات اس سے زیادہ کیا المیہ ہوگا۔ مگر کبھی ایسے نسل در نسل چلتے ہیں کبھی بے نظیر بھٹو کہتی تھیں انتقام لوں گی اب فاطمہ کا یہی مشن ہے مرتضٰی کا بیٹا ذوالفقار علی بھٹو جونیئر اب یہ سمجھ گیا ہے کہ باپ نہیں آئے گا عرصہ تک اس کو یہی بتایا گیا کہ باپ شکار پر گیا ہے ذوالفقار علی بھٹو سے ذوالفقار علی بھٹو جونیئر تک ایک داستان کے بعد دوسری داستان شروع ہو رہی ہے۔ مرتضٰی کی بیوہ غنویٰ کہتی ہیں بچوں کو سیاست میں آنے سے نہیں روکوں گی یہ بھٹو کا ورثہ ہے حاکم علی زرداری کے صاحبزادہ آصف علی زرداری کہتے ہیں ہماری سیاست بلاول آگے بڑھائے گا

جہاں 70 کلفٹن میں فاطمہ بہت سیریس ہے وہاں بلاول ہاؤس میں بلاول سنجیدگی میں کسی سے کم نہیں ہے۔ایک نئی داستان رقم ہو رہی ہے ایک بات طے ہے نہ ذوالفقار علی بھٹو کمپرومائز کرنے والے تھے نہ ان کے بیٹے تھے نہ شاید داماد تھے۔ بھٹو خاندان کی واحد غیر سیاسی فرد صنم بھٹو کی اپنے شوہر ناصر حسین سے عرصہ ہوا علیحدگی ہوگئی ہے صنم اپنے بچے پال رہی ہیں سب سے بڑی بیٹی کا نام آزادی ہے بھٹو خاندان کے نام تک سیاسی ہوتے ہیں سندھ کے خاندانوں کے نام روٹین میں چلتے ہیں ذوالفقار علی بھٹو کے والد تھے سر شاہنواز بھٹو اپنے بیٹے کا نام شاہنواز رکھا مرتضیٰ کے بیٹے کا نام ذوالفقار ہے یہ خاندانی سیاست کبھی ختم نہیں ہوگی۔

غلام مصطفیٰ جتوئی ذوالفقار علی بھٹو کے انتہائی قریبی دوست تھے ان کے والد بھی سیاست میں تھے جتوئی کے بیٹے مرتضیٰ جتوئی سیاست میں ہیں۔ سندھ میں وفاق میں وزیر رہ چکے ہیں کم گو ہیں مگر سیاست پر گہری نظر ہے والد نے پی پی پی کی سیاست کو آگے بڑھایا بیٹے کو سندھ میں پی پی پی کے مقابلہ کا مشن سونپا گیا ہے بڑے جتوئی کے بھائی مجتبیٰ جتوئی ڈاکٹر غفار جتوئی سیاست میں ہیں۔ مجتبیٰ کے بیٹے عاقب جتوئی وزیر رہ چکے ہیں۔ جتوئی خاندان طارق جتوئی کی موت کے صدمہ سے سنبھل نہیں سکا ہے نوجوان تھے شکار اور پیرا کی کے شوقین۔ ملازموں کے منع کرنے کے باوجود چڑھے ہوئے دریا میں کود گئے لاش بہت دیر بعد ملی غلام مصطفیٰ جتوئی اس سانحہ پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے طارق کی شادی کو ایک سال نہیں ہوا تھا۔ تعزیت کرنے والوں سے یہی کہتے تھے اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی، جوان اولاد کا غم سہنا یہ ان کی ہمت ہے۔

جہاں جتوئی نے بیٹوں کو سیاست سے دور نہیں رکھا وہاں سردار شیر باز مزاری یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے بیٹے سیاست کریں ”معاف کیجئے سیاست میں اتنی گندگی ہے کہ میں خود کو سیاستدان کہلوانا پسند نہیں کرتا اپنے بچوں کو کیوں لاؤں گا“۔ سردار مزاری کے بیٹوں نے کارپوریٹ ورلڈ کو ترجیح دی جس میں بڑے کامیاب ہیں قبائلی سردار کے خاندان

نے شہری انداز اختیار کرلیا بلوچستان کے سردار مینگل اور بگٹی کے لیے سیاست بڑے امتحان لائی۔ اکبر بگٹی نے جوان بیٹوں کے جنازے اٹھا کے اپنے کاندھے تو جھکا لیے مگر سر کبھی نہیں جھکایا اسے ہمیشہ اونچا رکھتے ہیں۔ نہ اپنی اولاد کو سیاست سے منع کرتے ہیں۔ عطا اللہ مینگل کے ایک بیٹے کو بیدردی سے قتل کردیا گیا دوسرے بیٹے اختر مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے سیاست میں باپ بیٹا دونوں سرگرم ہیں۔

غوث بخش بزنجو جب تک زندہ رہے خاندانی سیاست کے خلاف تھے مگر ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے حاصل بزنجو نے پارٹی کی قیادت سنبھالی وراثت کی سیاست صحیح نہیں مگر اسے مجبوری کی سیاست کہا جاسکتا ہے جب بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو سرمایہ کاری کا وزیر بنایا تو نواز شریف نے اپوزیشن کے لیڈر کی حیثیت سے بڑی نکتہ چینی کی جب خود وزیر اعظم بنے تو اپنے بھائی شہباز شریف کو وزیر اعلیٰ پنجاب بنایا گجرات کا چوہدری خاندان ہاتھ ملتا رہ گیا چودھری شجاعت نے نواز شریف کی برطرفی کے بعد سیاسی انتقام لیا پنجاب میں نواز شریف کے سب سے بڑے حریف چودھری ہیں۔

چودھری شجاعت حسین نے اپنے والد چودھری ظہور الٰہی کے قتل کے بعد ان کی گدی سنبھالی۔ متنازعہ سیاستدان تھے مگر وضع داری کے قائل تھے۔ جنرل ضیاء الحق سے وہ قلم تحفہ کے طور پر قبول کرنا جس سے جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی پھانسی کے پروانہ پر دستخط کیے تھے ان کو اتنا مہنگا پڑا کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ الذوالفقار نے ان کو معاف نہیں کیا ویسے بھی اس طرح کا ہولناک تحفہ قبول کرنا خطرات سے پر تھا۔

یہ المیہ ہے کہ سیاسی اختلافات دشمنی بن جاتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جب تک زندہ رہے پیر پگاڑو ان کے سندھ میں سب سے بڑے بلکہ واحد طاقتور حریف تھے جام صادق کے حکم پر ڈاکو قرار دے کر حروں کا قتل کیا گیا پیر پگاڑو پر قاتلانہ حملے کیے گئے پیر پگاڑو نے وقت آنے پر رعایت نہیں کی۔ اپنے حریف کی پھانسی کی اعلانیہ حمایت کی پھر بیس سال بعد اس کے بیٹے مرتضیٰ بھٹو سے تعزیت کی۔ مرتضیٰ کی پیر پگاڑو کے صاحبزادہ پیر

صبغت اللہ سے بڑی دوستی تھی۔ پیر پگاڑو نے ہمیشہ یہ کہا ''جھاڑو پھرنے والی ہے'' ان کی سابقہ اہلیہ کے مطابق خود ان کے گھر میں جھاڑو پھر گئی 45 سال کی رفاقت ختم ہوگئی بیٹے ماں باپ میں تقسیم ہوگئے۔

بھٹو کو تختہ دار پر لے جانے والے تھے جنرل ضیاء۔ان کے بیٹے اعجاز الحق کی وزیراعظم بننے کی دیرینہ خواہش ہے نواز شریف کے ساتھ رہے کیونکہ وہ جنرل ضیاء کے مشن کی تکمیل کو اپنی سیاست قرار دیتے تھے اعجاز الحق کو نواز شریف کی معزولی کے ابتدائی دنوں میں یقین تھا کہ فوج ان کو نہیں چھوڑیگی ایک محفل میں انہوں نے فوج کی نفسیات کا انکشاف کرتے ہوئے کہا جب میرے والد صدر بنے تو میں نے ڈرائیور سے اس کے تاثرات پوچھے۔اس نے کہا ''پہلے میرے صاحب کی گاڑی 35 ویں نمبر پر کھڑی ہوتی تھی اب پہلے نمبر پر ہے''۔اعجاز الحق کا جنرل ضیاء الحق کے بیٹے ہونے کے ناطے برسراقتدار جنرل خیال رکھتے ہیں مگر ان کے لیے ٹاپ پر پوزیشن نکالنے سے شاید معذور ہیں۔نواز دور میں اعجاز الحق نے اس پوزیشن کی توقع میں وفاقی وزارت قبول نہیں کی تھی سابق صدر سردار فاروق لغاری وزیراعظم کے عہدہ کے سنجیدہ امیدوار ہیں بے نظیر بھٹو نے ان کو صدر بنایا انہوں نے بے نظیر کو ڈسمس کر کے گھر بھیج دیا جن کو وہ بہن کہتی ہیں مگر نواز شریف نے فاروق لغاری کو اتنی مہلت نہیں دی ان کے پر کاٹ دیئے وزیراعظم کی برطرفی کا اختیار ختم کردیا۔ یہ اب فوجی حکومت بحال کررہی ہے جس کے تحت اختیارات کی تقسیم کی اسکیم کے پرزور حامی فاروق لغاری ہیں جن کے بیٹے ضلعی سیاست کررہے ہیں ضلع سے صوبہ،صوبہ سے وفاق میں آجائیں گے۔سردار فاروق لغاری کے رشتہ دار آفتاب شیر پاؤ کچھ ملنے کی امید پر جلاوطنی ختم کر کے وطن واپس آگئے مگر پھر پراسرار طور پر اچانک فرار ہوگئے تھے۔آفتاب شیر پاؤ کے صاحبزادے بھی بہت فعال ہیں یہ لوگ غفار خان کے بیٹے ولی خان اور ان کے بیٹے اسفند یار ولی کی سیاست کو صوبہ سرحد میں چیلنج کرنے کی کوشش کریں گے۔صوبہ سرحد میں بے نظیر بھٹو کے وفادار اے این پی سے مل کر بے نظیر بھٹو کے

غداروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اجمل خٹک جن کو ورکرز بابا کہتے ہیں فاروق لغاری اور عمران خان کے ساتھ مل کر کوئی الائنس بنانا چاہتے ہیں۔ اجمل خٹک پہلے سیاستدان ہیں جو جنرل پرویز مشرف سے ملے۔ اس کی پاداش میں اے این پی سے نکال دیئے گئے اس سفر میں اب تک بھٹک رہے تھے اب واپس آ گئے ہیں۔

سیاست کے اس سفر میں بعض خاندانی خواتین نے آسان راستہ اختیار کیا جن میں آصف زرداری کی بہن فریال تالپور نوابشاہ سے ضلع ناظم بنیں قائم علی شاہ کی بیٹی نفیسہ شاہ خیر پور کی ناظم منتخب ہوئیں یہ خواتین جو پی پی پی سے وابستہ ہیں دو اضلاع چلا رہی ہیں۔ پنجاب میں فخر امام اور عابدہ حسین اپنی بیٹی صغریٰ کے لیے خاطر خواہ کامیابی کو یقینی نہیں بنا سکے۔ ماں باپ نے ضلع کی سیاست نہیں چھوڑی اس میں نقصان ہے۔ ضلع گیا تو سیاست گئی۔ سندھ کے طاقتور مخدوم خاندان کو یہ احساس ہے مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ کے صاحبزادہ مخدوم امین فہیم اپنے قابل فخر والد کے گدی نشین ہیں مگر شاید وفاقی اقتدار ان کی قسمت میں نہیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے ان کو پرائم منسٹر کے طور پر پسند کیا مگر یہ پسندیدگی بے نظیر بھٹو نے ویٹو کر دی۔ کیا مخدوم خاندان ضلع حیدر آباد کے ضلعی اقتدار پر اکتفا کرے گا جو مخدوم رفیق الزماں کے ناظم ضلع ہونے کی شکل میں ملا ہے۔ خود مخدوم امین فہیم کے صاحبزادے جمیل الزماں سندھ اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں۔ دوسرے صاحبزادہ بیوروکریسی میں ہیں۔ پاور اینڈ پالیٹکس گھر میں ہے۔ مخدوم خلیق الزماں جو کبھی پی پی پی سندھ کے صدر تھے بدستور سیاسی باغی ہیں اب این جی او اور ڈپلومیٹک تقریبات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جس طرح مخدوم امین فہیم کا پرائم منسٹر سے کم کے عہدہ کے لیے نام نہیں آتا اسی طرح سندھ کے الٰہی بخش سومرو پرائم منسٹر کے مستقل امیدوار ہیں۔ ایک جنرل (ضیاء الحق) نے ان سے وفا نہ کی اب ایک اور جنرل (مشرف) کی آزمائش ہے۔ الٰہی بخش سومرو ہیوی مینڈیٹ والی قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے جسے جنرل مشرف نے برطرف کر دیا۔ سومرو صدائے احتجاج تک بلند نہ کر سکے نہ کسی عدالت میں گئے جب الٰہی بخش

سومرو وفاقی کابینہ میں جونیئر منسٹر تھے انکے بھائی افتخار سومرو سندھ کابینہ میں سینئر منسٹر تھے جنرل ضیاء نے سومرو پر محمد خان جونیجو کو فوقیت دی جن کی برطرفی پر پیر پگاڑو نے کہا تھا شکر ہے سندھ کا یہ وزیر اعظم زندہ واپس آ گیا۔ محمد خان جونیجو کی صاحبزادی فضہ سینیٹر کی حیثیت سے متاثر نہ کرسکیں اب صاحبزادے اسد جونیجو کی آزمائش ہے۔

کراچی کے سیاستدان اپنی اولادوں کو سیاست میں لانے کی فکروں سے آزاد ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، شاہ فرید الحق، این ڈی خان، معراج محمد خان، اقبال حیدر، سید ضیاء عباس کوئی اپنی اولاد کو سیاست میں نہیں لایا صرف پی ڈی پی کے مشتاق مرزا اپنے بیٹوں ارشد مرزا اور بشارت مرزا کو سیاست میں لائے ہیں جو بچپن سے جوانی تک اپنے گھر میں نوابزادہ نصر اللہ، غوث بخش بزنجو اور پیر پگاڑو کو مذاکرات کرتے دیکھتے رہے ہیں کراچی کے سارے سیاستدان متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کے خلاف ہیں۔ الطاف حسین اعلان کر چکے ہیں بیٹا ہوا تو مجاہد بیٹی ہوئی تو مجاہدہ بنے گی۔ الطاف حسین، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف تینوں تقریباً ہم عمر ہیں تینوں جلا وطنی میں ہیں بے نظیر بھٹو کی یہ دوسری جلا وطنی ہے الطاف حسین اور نواز شریف کی پہلی۔ مگر ایک فرق ہے الطاف حسین برطانوی شہری ہیں ان کی اولاد بائی برتھ برٹش ہوگی۔ نواز شریف کو کبھی سعودی شہریت نہیں ملے گی بے نظیر بھٹو کو کبھی امریکی شہریت نہیں ملے گی۔ فیملی پالیٹکس اس قوم کا شاید مقدر ہے اس سے نجات نہیں ملے گی۔

سیاست دان خواتین کا مستقبل کیا ہوگا؟

وفاقی وزیر ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ سیاسی طور پر سب سے زیادہ سروائیو کرنے والی خاتون قرار دی جاسکتی ہیں جو جنرل ضیاء الحق سے جنرل پرویز مشرف تک خود کو وفاقی سطح پر قائم رکھنے میں قائم رہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس طویل عرصہ میں انہوں نے صحت اور بہبود آبادی کے محاذوں پر بڑی دلجمعی سے کام کیا۔ خود کو کسی واضح سیاسی وابستگی کے بغیر خواتین کی بہبود کے لیے وقف رکھا ہے۔ ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ تو عرصہ سے جانی پہچانی تھیں زبیدہ جلال اچانک منظر عام پر آگئیں، ان کے وفاقی وزیر تعلیم بننے سے پہلے صرف بلوچستان کے لوگوں کو علم تھا کہ زبیدہ جلال نے تعلیم کے فروغ کے لیے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے والد سعودی عرب میں تھے۔ انہوں نے سرمایہ لگا کر بلوچستان کی لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی ابتدا کی۔ یہ کتنا مشکل کام تھا صرف پسماندہ بلوچستان کے عوام اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ زبیدہ جلال اس لحاظ سے بنیادی طور پر میرٹ پر آئی ہیں۔ انہوں نے تعلیم کے شعبہ میں رضا کارانہ خدمات انجام دیں جن کا اعتراف کیا گیا۔ اس وزارت کے دنوں میں ہی زبیدہ جلال کی ایک بلوچ سردار کے ساتھ کراچی میں خاموشی سے شادی ہوئی جس کی سرے سے کوئی پبلسٹی نہیں کی گئی تھی۔ اس طرح وفاقی وزیر نے ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ مشرف دور میں جس خاتون نے صوبائی سطح سے وفاقی سطح تک ترقی کی سندھ کی بیرسٹر شاہدہ جمیل تھیں۔ شاہدہ جمیل نے جنرل ضیاء الحق کی

آمریت کے خلاف ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے تحریک چلائی سیاسی خاندان سے تعلق ہے۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کی نواسی ہیں۔ بیرسٹر شاہدہ جمیل اپنے نانا کے سیاسی نظریات کا آج تک دفاع کرتی ہیں اور اس بات پر برہم ہوجاتی ہیں کہ کوئی سہروردی کو ''بنگالی قوم پرست'' قرار دے وہ کہتی ہیں میرے نانا سچے پاکستانی تھے وہ تو پاکستان میں دفن ہوئے یہ بدقسمتی ہے کہ وہ پاکستان اب بنگلہ دیش بن گیا ہے۔ بیرسٹر شاہدہ جمیل قانون اور انصاف کی وفاقی وزیر کی حیثیت سے صدر جنرل پرویز مشرف کا پیغام لے کر بنگلہ دیش کی نومنتخب وزیر اعظم خالدہ ضیاء کے پاس گئی تھیں۔ اس دور میں انہوں نے اپنے نانا کے مزار پر حاضری دی۔ بیرسٹر شاہدہ جمیل سندھ میں قانون کی وزیر تھیں ان کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ خواتین کے مسائل سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ پھر ان کی خدمات کے اعتراف میں وفاقی وزارت میں شامل کرلیا گیا۔ بیرسٹر شاہدہ جمیل خواتین کے لیے ہر محاذ پر لڑتی رہی ہیں خواہ یہ ان کے حقوق کا مسئلہ ہو یا خواتین کی کھیلوں میں شرکت کا، نواز شریف کے دور میں خواتین کی ہاکی پر پابندی لگی تو بیرسٹر شاہدہ جمیل نے سخت احتجاج کیا تھا۔ اس طرح خواتین پر کرکٹ کے دروازے کھلوانے میں ان کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خواتین کی نمائندگی میں ہر سطح پر اضافہ میں خاتون وزیر کا بڑا ہاتھ ہے۔

جنرل پرویز مشرف کی وفاقی کابینہ کے اجلاسوں میں ایک خاتون پہلی صف میں بیٹھی نظر آتی تھیں۔ یہ سیکریٹری کیبنٹ ڈویژن ڈاکٹر معصومہ حسن تھیں جو پاکستانی کی پہلی فیڈرل سیکریٹری بننے کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ بے نظیر بھٹو کے دور میں ان کو سفیر بنا کر ویانا بھیجا گیا۔ ڈاکٹر معصومہ حسن نہ صرف خود بیورو کریٹ رہی ہیں بلکہ بیوروکریٹس کی تربیت بھی کرتی رہی ہیں۔ کراچی میں نیپا (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن) کی ڈائریکٹر رہی ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کی چیئرپرسن رہی ہیں۔ اب اسی عہدہ پر ان کے شوہر فتحیاب علی خان ہیں۔ فتحیاب علی خان سیاستدان بھی

ہیں یہ مزدور کسان پارٹی کے سربراہ ہیں جو جی ڈی اے میں شامل ہیں ان کے مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ فتحیاب کی پارٹی میں نہ کوئی مزدور ہے نہ کوئی کسان۔ جب فتحیاب علی خان کسی حکومت کے خلاف تحریک چلاتے ہیں لوگ کہتے ہیں بیگم حکومت کی افسر ہیں شوہر حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر معصومہ حسن نے خود کو حکومت کے خلاف اپنے شوہر کے احتجاج کے دنوں میں سیاسی طور پر الگ تھلگ رکھا خود میزبان تو ہوتی تھیں مگر سیاسی اجتماع میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ ان کے کھانوں کے مداحوں میں پیر پگاڑو، نوابزادہ نصر اللہ، بے نظیر بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی اور سردار شیر باز مزاری سبھی شامل ہیں۔ جب فتحیاب علی خان کی رہائش گاہ پر سیاسی اجلاس ہوں تو بیگم فتحیاب کھانے کے وقت نمودار ہوتی ہیں اور سارے انتظامات کرتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر معصومہ حسن اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر کبھی کبھار مضامین لکھتی ہیں۔ وفاقی حکومت کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب وہ اسلام آباد میں اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔ فتحیاب علی خان نے چیئرمین پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کی حیثیت سے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو مدعو کیا تو اصل میزبان خود ڈاکٹر معصومہ حسن تھیں۔ فتحیاب علی خان نے جن کا سارا سیاسی کیریئر فوجی آمریت کے خلاف بظاہر جدوجہد کرتے گذرا ہے فوجی سربراہ کی آمد پر خود کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اس کا اس طرح جواب دیا کہ اپنی تقریر میں فتحیاب علی خان کو "اسفند یار ولی" قرار دے دیا۔ ظاہر ہے فوجی سربراہ کا واسطہ شوہر سے زیادہ بیوی سے تھا وہ ان کا نام بھول گئے۔

جنرل پرویز مشرف کیبنٹ ڈویژن کی سیکریٹری کے شوہر کا نام بھول سکتے ہیں مگر نہ بیگم کلثوم نواز کو بھول سکتے ہیں نہ ان کے شوہر نواز شریف کو۔ یہ نواز شریف تھے جنہوں نے جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آرمی اسٹاف بنایا پھر خود ہی ہٹانے کی کوشش کی اس کوشش میں خود اپنے عہدہ سے ہٹا دیئے گئے نواز شریف جیل میں ڈال دیئے گئے۔ کلثوم نواز اپنے شوہر کی رہائی اور جمہوریت کی بحالی کا دو نکاتی مشن لے کر سیاست میں آئیں

انہوں نے اپنے کارڈ اس مہارت سے کھیلے کہ حامیوں مخالفوں سب کو حیران کر دیا۔ مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رہنما کے مطابق بیگم صاحبہ نے طیارہ میں سوار ہونے تک یہ تاثر نہیں دیا کہ ملک سے جا رہی ہیں۔ آخری بار رابطہ ہوا تو یہی کہا کہ آپ سے کسی نے غلط کہا ہے ہم کبھی پاکستان نہیں چھوڑیں گے۔ آپ کو یاد نہیں نواز شریف نے ہمیشہ کہا ہے میں میڈ ان پاکستان ہوں۔ اس رہنما کو جدہ سے دوست کا فون آیا کہ شریف فیملی کی آمد کے انتظامات ہو رہے ہیں مگر وہ بیگم کلثوم نواز کی بات پر بھروسہ نہ کرنے کو تیار نہ تھے۔

بیگم کلثوم نواز نے اپنے مشن کا ایک حصہ کامیابی سے مکمل کر لیا۔ یعنی نواز شریف کی آزادی۔ جمہوریت کی بحالی کا مشن ادھورا چھوڑ کر سعودی عرب چلی گئیں۔ جہاں شاہی خاندان کی میزبانی سے پورا شریف خاندان لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کبھی کبھار نواز شریف کا یہ اعلان جاری کر دیا جاتا ہے کہ ''میں واپس آؤں گا، ضرور آؤں گا'' خود بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ تک یہ اعتراف کرتے ہیں کہ آخری وقت تک ہمیں اندازہ نہ تھا کہ شریف فیملی جا رہی ہے۔ اے آر ڈی کے اجلاس میں جو ان کی روانگی سے ایک روز پہلے ہوا بیگم کلثوم نواز نے یہی کہا کہ ہم تحریک چلائیں گے کوئی ڈیل نہیں کریں گے۔ ڈیل ہوئی یا نہیں یہ آج تک طے نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ نواز شریف کلثوم نواز، میاں شریف ان کی اہلیہ اور دیگر شریف سارے جدہ میں ہیں۔ مسلم لیگ کے رہنما یہ دعویٰ بڑے اعتماد سے کرتے ہیں کہ نواز شریف کے بیشتر صحیح اور غلط فیصلوں میں ان کے والد میاں شریف بلاوجہ بدنام ہیں سارے اہم فیصلے بیگم کلثوم نواز کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سسرال میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں اسی لحاظ سے مغربی نامہ نگاروں کا یہ دعویٰ کہ شریف فیملی کی واحد پسندیدہ کتاب ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے۔ پاکستانی نامہ نگاروں کا دعویٰ کہ شریف فیملی کی لائبریری میں بہشتی زیور، کے سوا کچھ نہیں ملے گا غلط نظر آتا ہے بیگم کلثوم نواز مشکل حالات میں منظر عام پر آئیں کچن چھوڑ کر پالیٹکس جوائن کرنے پر مجبور ہوئیں، فوجی حکومت کو اتنے موثر انداز میں چیلنج کیا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ پاکستان میں

مزاحمت کی واحد علامت بن گئی تھیں۔ پھر شریف فیملی کو شاید احساس ہوا کہ ان کا اصل کام سیاست نہیں تجارت ہے۔ واشنگٹن، جدہ کارڈ استعمال کر کے ساری فیملی جلا وطنی میں چلی گئی۔

بیگم کلثوم نواز سے مسلم لیگی رہنما کیپٹن حلیم صدیقی کی رہائش گاہ پر اخبار نویسوں کی ملاقات کرائی گئی وہ اپنے شوہر کے لیے فکرمند ضرور تھیں مگر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ ویسے بھی شریف فیملی کے چہرے حکومت اپوزیشن ہر دور میں مجموعی طور پر سپاٹ ہی رہتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق کو فکر تھی کہ نواز شریف کی جان بچائی جائے ان کی جان خطرہ میں ہے۔ بیگم کلثوم نواز اس تجویز پر خاموش بیٹھی تھیں شاید ان کو ڈیل کا احساس تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بیگم کلثوم نواز کے ساتھ تہمینہ دولتانہ نے عملی جدوجہد کی جوان کے ساتھ ہر وقت رہتی تھیں۔ کراچی جب آتی تھیں سفید کپڑوں میں، سیاہ چشمے لگائے بھاری بھرکم خواتین ان کو گھیرے رہتی تھیں ان میں سے ایک مسلم لیگی رہنما طوبیٰ درانی تھیں جن کو پولیس نے کبھی لاٹھی چارج کا نشانہ بنایا کبھی پولیس کی موبائل میں پھینکا، نواز شریف کے جانے کے بعد طوبیٰ درانی بھی بہت سے مسلم لیگیوں کی طرح بددل ہوگئیں جو اب ایک مسروقہ کار کے کیس کے بعد امریکہ جا چکی ہیں۔ مسلم لیگ کی بے شمار خواتین ہیں ان میں رہنما بھی ہیں ورکر بھی ہیں ان کو دکھ ہے جس طرح شریف فیملی ان کو خاموشی سے چھوڑ کر چلی گئی۔ سندھ میں ڈاکٹر سلطانہ ابراہیم، بیگم ممتاز قریشی، بیگم راحت جاوید، ہما میر سب سرگرم رہتی تھیں۔ بیگم راحت جاوید نے بیگم کلثوم نواز کے ان ریمارکس پر اعتراض کیا جو اردو اسپیکنگ کمیونٹی کے خلاف سمجھے گئے۔ بیگم ممتاز قریشی جو نواز شریف کی عدالت میں پیشی پر گرفتار ہوئیں ایک بار ٹرین روکنے کے لیے ریلوے لائن پر لیٹ گئی تھیں۔ اب دل برداشتہ ہو کر گھر بیٹھ گئی ہیں۔

سندھ میں سیاسی خواتین نے ہر آمریت کے خلاف خواہ ملٹری ہو یا سویلین جدوجہد کی ہے مگر بیشتر کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کو قربانیوں کا صلہ نہیں ملا، صلہ کس کس کو

ملے اب خواتین کی نشستیں بڑھنے سے زیادہ کو اکاموڈیٹ کیا جا سکے گا۔ منتخب امیدواروں کی شکل بدل کر رہ جائے گی۔ ایوانوں میں ہڑ بونگ میں اضافہ ہو جائے گا۔ سندھ کی جو خواتین جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں نمایاں ہوئیں ان میں بیگم محمود سلطانہ، بیگم سلمٰی احمد، بیگم گلزار انہڑ، خانم گوہر اعجاز، زاہدہ زیدی، بیگم قمر النساء قمر، ڈاکٹر فریدہ احمد نمایاں تھیں۔ بیگم محمودہ سلطانہ مجلس شوریٰ میں تھیں مگر فوجی حکومت کے بجٹ کو چیلنج کر دیا تھا" چیئرمین صاحب بجٹ ہمارے سامنے پیش ہو رہا ہے یا ہم بجٹ کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں"۔ بیگم محمودہ سلطانہ کے شوہر شیخ لیاقت حسین مسلم لیگ کے صدر تھے وہ متحدہ قومی موومنٹ میں چلے گئے۔ پہلے میاں بیوی دونوں مسلم لیگ میں تھے۔ بیگم سلمٰی احمد کو شروع میں پاکستان کی پہلی خاتون شپ بریکر کے طور پر شہرت حاصل ہوئی وہ ہمیشہ مسلم لیگ میں رہی ہیں۔ مشرف حکومت کے ابتدائی دنوں میں بیگم سلمٰی احمد نے ایک یکجہتی فورم بنایا جس میں وزیر داخلہ معین الدین حیدر کو بلایا گیا تھا۔ بیگم سلمٰی احمد کے پیر پگاڑو اور محمد خان جونیجو کے خاندانوں سے مراسم ہیں۔ بیگم گلزار انہڑ نے ایک بار سندھ کے فوجی حکمرانوں کو چیلنج کیا کہ سندھ پر حکومت کرنا ہے تو آپ سندھی سیکھ کر آئیں۔ وہ نامزد کونسل میں سندھی میں تقریر کرتی تھیں جو جنرلوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بیگم انہڑ اچانک فیڈ آؤٹ ہوگئیں اب عید الاضحیٰ پر پیر جو گوٹھ میں پیر پگاڑو سے ملنے والوں کی فہرست میں ان کا نام شامل تھا۔

ڈاکٹر فریدہ احمد اسلامی اسکالر ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی ہمشیرہ ہیں خواتین کے وفاقی کمیشن کی رکن ہیں ان کی سرگرمیوں کی کوریج ان کے شوہر محمد احمد صدیقی کرتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر فریدہ پردہ دار خاتون ہیں۔ بیگم قمر النساء قمر قومی اسمبلی کی ممبر تھیں کراچی میں ان کی سیاست قوم پرستی کی لہر کی پوری طرح نذر ہونے سے بچ گئی۔ ان دنوں بھارتی حکومت کے خلاف اور مشرف حکومت کی حمایت میں مظاہرے کراتی ہیں۔ مہاجر قوم پرستی کے محاذ پر بیگم نسرین جلیل بہت نمایاں ہیں۔ سینیٹر رہی ہیں۔ سیاستدانوں، جنرلوں اور سفارت کاروں سب سے ملاقات کرتی ہیں۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کے

بہت قریب ہیں۔ متحدہ کے ووٹ بنک میں اکثریتی ووٹ خواتین کے ہیں۔ اس لحاظ سے متحدہ نے خواتین سے اپنا رابطہ کبھی ختم نہیں کیا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے بائیکاٹ سے متحدہ کو نقصان ہوا ہے۔ متحدہ کے ڈاکٹر فاروق ستار کی اہلیہ بیگم شاہدہ فاروق نے ماحول کی بہتری کا بیڑہ اپنے ویلفیئر ٹرسٹ کے ذریعہ اٹھا رکھا ہے بہت سرگرم خاتون ہیں۔ کراچی کے کئی پارکوں کو کمرشل پلازہ بننے سے بچانے میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔

جو سیاستدان خواتین قوم پرستی کی سیاست کے خلاف ہیں ان میں پاکستان پیپلز پارٹی کی رقیہ سومرو، ڈاکٹر یاسمین شاہ، شگفتہ جمانی اور فوزیہ وہاب نمایاں ہیں۔ فوزیہ وہاب کو جماعتی اختلافات کی وجہ سے ہیومن رائٹس سیل میں بھیج دیا گیا جن کو صرف یہی اطمینان ہے کہ ان کا محترمہ بے نظیر بھٹو سے براہ راست رابطہ ہے۔ پی پی پی میں سندھ شعبہ خواتین کی صدارت پر نئی لیڈرشپ لائی گئی ہے۔ پیپلز پارٹی کے مرد ہوں یا خواتین سب کو ایک خاتون بے نظیر بھٹو کا انتظار ہے۔ بے نظیر بھٹو نے سیاسی جدوجہد کی ہر دور میں نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اسی جدوجہد میں ان کے شانہ بہ شانہ ناہید خان رہی ہیں جو ڈاکٹر صفدر عباسی کی اہلیہ اور بیگم اشرف عباسی کی بہو ہیں۔ لاڑکانہ کا عباسی خاندان بھٹو خاندان کا ہمیشہ وفادار رہا ہے جس نے آمریت جمہوریت ہر دور میں ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا ساتھ دیا ہے۔ سندھ خاتون وزیر سے طویل عرصہ تک محروم رہا بھٹو دور میں بیگم اشرف عباسی تھیں مشرف دور میں شاہدہ جمیل وزیر بنیں جو پھر سندھ سے اسلام آباد چلی گئیں۔

ڈیانا

مر کے بھی چین نہ پایا

شاعر نے یہ بات یونہی نہیں کہی کہ ”مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے“
لیڈی ڈیانا کو جن کی موت پر پوری دنیا نے سوگ منایا شاید مرنے کے بعد بھی سکون نہیں ملا۔ شوہر شہزادہ چارلس سے زندگی میں ہی علیحدگی ہو گئی تھی دو بیٹے ہیری اور ولیم چھوڑ گئی تھیں۔ پرنس ہیری نے منشیات استعمال کرنے کا اعتراف کرلیا ہے ان کا بحالی کے ایک مرکز میں علاج ہو رہا ہے۔ ہیری اور ولیم شاہی محل میں رہنے کے باوجود غیر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ دونوں کے باپ شہزادہ چارلس کی اپنے سابق برادر نسبتی اور ہیری اور ولیم کے ماموں شہزادہ چارلس اسپنسر سے دیرینہ کشمکش عروج پر ہے۔ ماموں کے خیال میں بچوں کا صحیح خیال نہیں رکھا جا رہا ہے جس سے ان کے بگڑنے کا خدشہ ہے۔ ماموں نے اپنی بہن کی ہولناک حادثاتی موت پر اپنے بھانجوں کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔

ڈیانا اور چارلس کی ازدواجی زندگی میں کبھی پامیلا نے زہر گھولا کبھی چارلس کی کسی اور گرل فرینڈ نے، ڈیانا کو بھی محبت کی تلاش رہی جو آخر میں اسے ڈوڈی الفائیڈ کی بانہوں میں ملی۔ یہی محبت دونوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ڈیانا ایک پرسکون جھیل کے وسط میں بنی قبر میں ابدی نیند سو رہی ہے مگر اس کے لیے سکون شاید موت کے بعد بھی نہیں ہے۔ شہزادہ چارلس کا ایک قابل اعتماد دوست مارک بولینڈ اب اس کے بیٹوں کی زندگی میں زہر گھولنے پر تلا ہوا ہے۔ شہزادوں کا خواہ ماضی کے ہوں یا حال کے اپنا طریق کار ہوتا ہے کہ

ان کا کوئی قریبی ساتھی دوست معتمد ضرور ہوتا ہے جو اپنے خیال میں ان کی زندگی جنت بنا رہا ہوتا ہے مگر ہوتا اصل میں اس کے برعکس ہے۔ چارلس کے اسٹاف میں شامل ان کے ڈپٹی پرائیویٹ سیکریٹری مارک بولینڈ کا معاملہ ان دنوں انتہائی متنازعہ بنا ہوا ہے۔ شاہی خاندان کی روایت ہے کہ شاہی گھرانہ میں پاور سنیارٹی ٹائٹل یا پروٹوکول سے نہیں اعتماد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت اعتماد کے معاملہ میں مارک بولینڈ سب پر بازی لے گیا ہے۔ اس سے اس کے حاسدوں کی تعداد بڑھی ہے دشمنوں کی کمی نہیں ہوئی ہے۔ بولینڈ نے ملکہ کے آس پاس موجود روایتی ہستیوں کو ناراض کردیا ہے۔ مگر ان ہستیوں سے زیادہ تکلیف دہ صورتحال ولیم اور ہیری کے ماموں چارلس اسپنسر کے لیے پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ چارلس کی بے اعتنائی پر افسردہ رہتے تھے اب ان کے بچوں کے لیے رنجیدہ ہیں۔

ماموں کے خیال میں پرنس ہیری نے منشیات کا استعمال راتوں رات شروع نہیں کردیا اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ اسپنسر کو یہ وجہ بولینڈ میں نظر آرہی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بولینڈ کی چارلس سے قربت شاہی خاندان کے لیے مسائل پیدا کرے گی۔ بولینڈ پرنس چارلس کا اعتماد حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوا برطانوی اخبارات کے مطابق بولینڈ نے یہ اعتماد ایٹی کیٹ یا آفس مینجمنٹ کے ذریعہ حاصل نہیں کیا بلکہ میڈیا کے جدید ترین طریقہ کو استعمال کر کے حاصل کیا ہے۔ بولینڈ پریس کمپلینٹ کمیشن کا سربراہ رہا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میڈیا کیسے کام آتا ہے کیسے ری ایکٹ کرتا ہے۔ کس طرح اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ برطانیہ کا شاہی خاندان جانتا ہے کہ ایسی بادشاہت کے باوجود جسے کوئی خطرہ نہیں ہے پبلک امیج صحیح ہونا کتنا ضروری ہے۔ پرنس چارلس کے حامی سمجھتے ہیں کہ پرنس کے ساتھ ڈیانا کی زندگی میں میڈیا نے انصاف نہیں کیا ڈیانا کو ہمیشہ ان پر ترجیح دی گئی وہ ایک مظلوم شوہر تھے جن کی ''میرج آف دی سنچری'' دس سال بھی نہیں چلی۔ جب ڈیانا کا پیرس میں کار کے حادثہ میں بوائے فرینڈ ڈوڈی الفائیڈ کے ساتھ انتقال ہوا تو پوری دنیا اس سانحہ پر رو پڑی مگر بکنگھم پیلس میں بڑی تاخیر سے پرچم سرنگوں کیا گیا۔ اب تک ڈیانا کی موت میں

کبھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کبھی ایم آئی 6 (برٹش سیکریٹ سروس) کا نام لیا جاتا ہے خود لندن میں عام شہری یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ ڈیانا حمل سے تھی اسے اسکیم کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ ڈیانا کی دل آویز شخصیت تھی کہ (مشرقی لحاظ سے) ایک غیر مرد کے ساتھ مرجانے کے باوجود ان کے لیے مشرق و مغرب میں لوگ یکساں غمزدہ تھے۔

مارک بولینڈ نے کیا کیا ہے؟ اس نے پرنس چارلس کا میڈیا امیج بہتر بنایا ہے میڈیا میں چارلس کو دو بیٹوں کے ذمہ دار باپ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چارلس کو رحم دل اور شفیق باپ ظاہر کیا جا رہا ہے جو اپنی بیوی ڈیانا کے معاملہ میں بے رحم اور پتھر دل تھا۔ چارلس کو بچوں کے ساتھ اسکول جاتے پکنک مناتے شکار کھیلتے دکھایا گیا اس انداز میں جیسے بچے ماں کا غم بھلا کر باپ کو سب کچھ سمجھ رہے ہوں مگر اس دوران پرنس ہیری کے منشیات کے استعمال کے واقعہ نے سارے محل کو ہلا کر رکھ دیا شاہی خاندان دہل گیا۔ نقصان ہو چکا تھا یہ مستقبل کے بادشاہ ہیں؟ جن کے نشہ کا علاج ہو رہا ہے۔ اس سے چارلس کا اپنا امیج متاثر ہوا۔ یہ کیسا باپ ہے جس کے بچے نشہ کر رہے ہیں ان کو کیا محرومی ہے؟ کیا ماں کی یاد اتنی ستا رہی ہے کہ منشیات کا سہارا لے لیا ہے۔ اس مشکل صورتحال میں بولینڈ نے چارلس کی مدد کی جس کے نتیجہ میں پرنس چارلس ماں سے محروم بچوں کے لیے بس حس سمجھے جانے والے ایک باپ کے بجائے ایک ایسے ولی عہد کے طور پر پیش کیے گئے جسے منشیات کے مسئلہ پر تشویش ہے جو اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے ان کی تربیت پر یقین رکھتا ہے۔ اس پالیسی کے تحت چارلس کو میڈیا میں دکھایا گیا کہ ہیری کو منشیات کے عادی بچوں کی بحالی کے مرکز پر خود لے کر جا رہے ہیں۔ یہ منظر جب ٹی وی پر لاکھوں والدین اور ان کے بچوں نے دیکھا تو چارلس کا عام لوگوں کی نظروں میں امیج اجاگر ہوا مگر اس طرح جب ولیم کی نجی زندگی ایک ٹی وی نے نمایاں کرنے کی کوشش کی تو چارلس نے ایک حساس باپ کے طور پر اس پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔

اس منظر نامہ میں ڈیانا کے بھائی چارلس اسپنسر کا چہرہ ابھرتا ہے جس نے ڈیانا کے

جنازہ میں اپنے بھانجوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کے عہد کیا تھا اسپنسر کے خیال میں ولیم اور ہیری کے لیے پرنس چارلس کا دست راست مارک بولینڈ مستقل خطرہ بنا ہوا ہے اسپنسر جس کی اپنی ازدواجی زندگی اتنی قابل رشک نہیں نجی محفلوں میں نہ صرف اپنے بھانجوں بلکہ بادشاہت تک کے لیے خطرات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ اسپنسر کو یہ فکر لاحق ہے کہ پرنس چارلس اپنے بیٹوں ولیم اور ہیری کے ذمہ دار باپ کی حیثیت سے اپنا امیج بہتر بنا رہے ہیں۔ ان کو اپنے امیج کی فکر نہیں ہے اپنے بچوں کی نہیں ہے اسپنسر نے ڈیانا کے جنازہ پر کہا تھا کہ بچوں کی حفاظت اس کے سگے رشتہ دار (ماموں) کریں گے اس کا مقصد سوگوار دنیا کو یہ تاثر دینا تھا کہ چارلس کے پاس بچے اتنے محفوظ نہیں ہوں گے۔ اسپنسر کی چارلس سے مخاصمت نئی نہیں ہے اپنی بہن کی موت پر ان کو بہت دکھ تھا وہ اس وقت طیش میں نظر آئے جب چارلس کو کامیلا پارکر کے ساتھ خوش دیکھا۔ پھر اس کے بعد جب دونوں بچے ولیم اور ہیری ماں کی قبر پر ایک پروگرام کے تحت جانے لگے تو ماموں نے منع کر دیا۔ اس پر بڑا ردعمل ہوا معلوم ہوا کہ ماموں چاہتا تھا کہ بچے جب اپنی ماں اور اس کی قبر پر کھڑے ہوں تو وہ ان کے ساتھ ہو آخر یہی ہوا چارلس اور اسپنسر کی سرد جنگ ختم کرنے کے لیے ایک میٹنگ تجویز کی گئی جو نہ ہوسکی۔ چارلس نے تجویز مسترد کر دی جب اسپنسر نے گذشتہ ماہ دوسری شادی کی تو اس میں اپنے بھانجوں ولیم اور ہیری کو نہیں پایا۔ دونوں کو ماموں نے مدعو کیا تھا مگر شاہی محل سے یہ عذر پیش کیا گیا کہ ڈیانا کے دونوں بیٹے شکار پر گئے ہوئے تھے۔ اسپنسر نے چارلس کو مدعو نہیں کیا تھا اس لیے چارلس کے بیٹوں کی شرکت کا سوال نہیں تھا۔ اس صورتحال میں بچوں کے ماموں کی اپنے سابق بہنوئی کے ساتھ جنگ بڑھتی جا رہی ہے جس میں صلح کا امکان نہیں ہے یہ جنگ ولیم اور ہیری پر اثرانداز ہو رہی ہے ایک طرف وہ باپ ہے جس کے ساتھ ماں کبھی خوش نہیں تھی۔ ایک طرف ماموں ہے جس سے باپ خوش نہیں ہے اس جنگ کے شعلے چارلس کا مددگار بولینڈ بھڑکا رہا ہے۔ ان شعلوں کی تپش ونڈسر کی جھیل میں ابدی نیند سونے والی ڈیانا کو ضرور محسوس ہو رہی ہوگی۔ ڈیانا کی زندگی بے چین رہی موت کے بعد سکون نہیں ملا یہی زندگی ہے۔

پاکستان پر امریکی کھانوں کی یلغار

پاکستان کے ساحلی شہر کراچی پر امریکی کھانوں کی یلغار ہو چکی ہے اور امریکہ کی اپر کلاس کا پسندیدہ فوڈ پاکستان کی اپر کلاس کے لیے ''اسٹیٹس سمبل'' بن کر رہ گیا ہے۔ پیزا ہٹ کے بعد کنٹکی فرائڈ چکن کی فوڈ شاپس کھل گئی ہیں۔ میکسیکن ٹاکو شیل کی دکانوں کے لیے جگہیں دیکھی جا رہی ہیں۔ ٹاکو شیل پاپڑ کے درمیان قیمہ اور سبزی کی ڈش کو کہتے ہیں جو امریکہ میں بچوں نوجوانوں اور بوڑھوں میں یکساں مقبول ہے۔ اسی طرح برگر میکڈانلڈ کے اسٹال کھولے گئے ہیں۔ امریکی فوڈز جس طرح اٹلانٹک کے ساحل سے بحیرہ عرب کے ساحل تک پھیل رہے ہیں اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ چند سالوں کے اندر غیر ملکی کھانے مقامی منڈی پر چھا جائیں گے۔ پھر لوگوں کی کھانے کی عادتیں بدل رہی ہیں۔ چائنیز کھانوں کا رواج کم ہو رہا ہے کیونکہ خواتین نے بہت سے چائنیز کھانے گھروں پر بنانے سیکھ لیے ہیں۔ بہت سے خوش خوراک پاکستانیوں کو یہ شکایت بھی ہے کہ چائنیز کھانے سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ان کو گھر واپس جا کر باقاعدہ خوراک لینا پڑتی ہے۔

پاکستانی میں چینی ریسٹورنٹس کا سیلاب 1970ء کی دہائی میں آیا جب ہر دوسرا آدمی اپنے دوستوں کو چائنیز کھلانے کی خواہش کرتا تھا۔ چائنیز چکن کارن سوپ، فرائیڈ رائس اور سی فوڈ بڑے مقبول تھے۔ چائنیز فوڈز مہنگے تھے جس کی وجہ سے اپر کلاس کے محبوب کھانے بن گئے۔ سیاستداں، بیوروکریٹس اور سفارت کار چائنیز ریسٹورنٹس میں دیکھے

جاتے تھے۔ صدر میں اے بی سی ریسٹورنٹ لاور مزار قائد اعظم کے بالمقابل ''حکہ'' ریسٹورنٹ کی کسی دور میں بڑی مانگ تھی۔ اب بھی اچھے کھانے کے شوقین لنچ اور ڈنر کے وقت دیکھے جاتے ہیں۔

چائنیز کے ساتھ ساتھ کراچی میں نہاری، پائے، کباب، مچھلی کے پکوان پاپولر رہے۔ ایم اے جناح روڈ پر ''قیصر'' کی روسٹ ران اب تک مشہور ہے۔ برنس روڈ چٹپٹے کھانوں کا بدستور سب سے بڑا مرکز ہے۔ جہاں رات سے علی الصبح تک شوقین شہریون کے ہجوم نظر آتے ہیں۔ برنس روڈ پر نہاری کباب پائے حلیم ربڑی آئس کریم قلفی سب دستیاب ہے۔ برنس روڈ پر فیملی کے ساتھ جانے والے گاڑیوں کے اندر بیٹھ کر کھانے کو ترجیح دیتے ہیں جن کو دودھ کی ٹھنڈی بوتل اور کولڈ ڈرنک کار کے اندر فراہم کی جاتی ہے۔ برنس روڈ پر روایتی کھانوں میں صابری کی نہاری مشہور ہے۔ ملا کے کٹا کٹ کا جواب نہیں ہے۔ صدر میں زاہد کی نہاری اور گھسیٹا خان کی حلیم شہریوں میں بہت مقبول ہے۔ صدر میں غریب مزدور بھنی ہوئی کلیجی شوق سے کھاتے ہیں جو سستی مل جاتی ہے۔

کراچی کی یہی خوبی ہے کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا اور غریب کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ تندوری روٹی سے کلیجی اور حلیم کھا کر غریب مزدور پیٹ کی آگ بجھا لیتے ہیں۔ صدر میں بلوچ کی آئس کریم کی خاطر خواہ مانگ ہے۔ صدر میں رہائش پذیر سرکردہ سیاستدان مولانا شاہ احمد نورانی اپنے ملنے والوں کی بلوچ کی پستہ آئس کریم سے تواضع کرتے ہیں۔

صدر سے آگے ٹاور پر جہاں سے کراچی کی بسیں واپسی کے لیے مڑ جاتی ہیں پائے کے ہوٹل ہیں۔ ایک ہوٹل میں پراٹھے پائے کے شوربہ میں بھگو کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں صدیق حلوائی کی مٹھائی کراچی کے شہریوں میں بڑی مقبول ہے۔ تازہ مٹھائی اصلی گھی میں تیار کی جاتی ہے۔ رنچھوڑ لائن میں ساری رات رونق رہتی ہے۔ اس علاقے کے مکین رات میں حلیم، مچھلی اور پشاوری آئس کریم سے شوق کرتے ہیں۔ گڈلک کی حلیم پر خریداروں کو کوپن کے ذریعہ انعامات دیے جاتے ہیں۔ بچوں کے جھولے اور اونٹ

کی سواری تک دستیاب ہوتی ہے۔ اس علاقہ میں رات کو دن کا سماں نظر آتا ہے۔ رنچھوڑ لائن کی مچھلی بہت مشہور ہے جس کے لیے لوگ دور دراز سے سفر کر کے آتے ہیں۔ پامفریٹ روہو جھینگے ہری فوڈ خریدار کے سامنے تیار کیے جاتے ہیں۔ دکانیں فٹ پاتھ پر ہیں جن کے ساتھ گٹر کی لائنیں ابلتی رہتی ہیں مگر شوقین شہری لذت کام ودہن کی خاطر تعفن کو برداشت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہیروئن کے عادی افراد اور بھکاریوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے جو گاہکوں کا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔ بہت سے بھکاری بچا کھچا صاف کر دیتے ہیں جس سے آس پاس اور میزوں کے نیچے نقل وحرکت کرتی بلیوں کے ساتھ زیادتی ہو جاتی ہے۔

مچھلی اور کبابوں کے لیے پی آئی بی کالونی کی دکانیں طویل عرصہ سے مشہور ہیں۔ کلفٹن اور ڈیفنس کے باشندے تک پی آئی بی کے گولہ کباب گھروں میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ لذیذ کھانے ٹھیلوں پر تیار ہوتے ہیں۔ عام طور پر گاہک کے بیٹھنے کے لیے کرسی تک نہیں ہوتی مگر اس سے خریداروں کے رش میں کبھی کمی نہیں ہوئی ہے۔ شاہراہ قائدین کا نورانی گولہ کباب اور طارق روڈ کے کباب پراٹھا رول کا بڑا چرچا ہے۔ پراٹھا رول طارق روڈ پر شاپنگ کرنے والی خواتین اور بچوں کی پسندیدہ خوراک ہے۔ نورانی گولہ کباب پر رات گئے تک گاڑیوں کا رش رہتا ہے۔ امن وامان کی صورتحال کی وجہ سے اس علاقہ میں رینجرز اور پولیس دستے مستقل گشت پر رہتے ہیں۔

طارق روڈ کا لاہوری چرغہ مقبولیت میں سب سے آگے ہے۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی میں سلور اسپون ابھی تک روایتی کھانے کے شوقین شہریوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ محمد علی سوسائٹی کے میرٹھ کے کباب بدستور مقبول ہیں جو زیادہ تر خریدار پیک کرا کے لے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں ٹو سواسنیک بار پر کسی زمانہ میں شہریون کے رش کی وجہ سے جگہ نہیں ملتی تھی۔ کراچی کی بدامنی کی وجہ سے اس علاقہ کی رونق کم ہوتی گئی۔ آئس کریم محمد علی سوسائٹی کی اب تک اچھی بکی جا رہی ہے۔

شاہراہ فیصل پر پہلا اوپن ائر فاسٹ فورڈ ریسٹورنٹ تاجر محمد اقبال نے کھولا۔

چاندنی رات کو یہاں رونق دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ تاجر اقبال اپنے خریداروں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مرغ پرندے خرگوش پنجروں میں بند ہوتے تھے۔ جن کو کھانے کا سلیکشن خریدار دیکھ کر کرتے تھے۔ تاجر اقبال جو پیر پگاڑا کے قریبی دوستوں میں سے تھے پراسرار حالات میں قتل کر دیئے گئے۔ ان کے قتل کے بعد سے شاہراہ فیصل کی اس جگہ کی رونق اجڑ گئی۔ یونیورسٹی روڈ پر واقعہ حسن اسکوائر کھانے پینے کے شائقین کی دلچسپی کا نیا مرکز بن گیا ہے جہاں ٹنڈو آدم کی سجی، کوئٹہ کی سجی، چکن تکہ کباب بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ حسن سکوائر سے آگے عثمانیہ ریسٹورنٹ میں روایتی کھانے باوردی سروس کے ساتھ دستیاب ہیں۔ اس ریسٹورنٹ میں فیملیز کی پارٹیوں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ رات کو گاڑیوں کی قطاریں عثمانیہ کے باہر کھڑی نظر آتی ہیں۔

روایتی کھانوں کے لیے بڑا چیلنج یونیورسٹی روڈ پر ''پیزا ہٹ'' اور کنٹکی فرائیڈ چکن کے ریسٹورنٹس نے کھڑا کر دیا ہے۔ پیزا ہٹ اور کنٹکی فرائیڈ چکن دونوں بچوں اور بڑوں میں مقبول ہیں مگر مڈل کلاس کے لیے دونوں میں بے دھڑک داخل ہونا آسان نہیں ہے۔ ایک فیملی کا کھانے کا بل ایک ہزار روپے تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے لوگ بجٹ بنا کر امریکی فوڈز کے ان ریسٹورنٹس کا رخ کرتے ہیں جہاں امریکی ماحول پیدا کرنے کی دانستہ کوششیں کی گئی ہیں جگ گلاس ٹرے سب امریکی ہیں۔ دیواروں پر امریکی پینٹنگز ہیں۔ اسٹاف انگریزی اور اردو پر عبور رکھتا ہے۔ پیزا اور چکن کی چینز مختلف علاقوں میں قائم کی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میکڈانلڈ کا برگر اور ٹاکو شیل میدان میں آ گئے ہیں۔

ان فارن فوڈز کی آمد سے کراچی کے شہریوں کے لیے کھانے پینے میں چوائس بڑھ گیا ہے۔ امریکن فوڈ، فاسٹ فوڈ، روایتی فوڈ سب کچھ دستیاب ہے۔ رات میں بندو خان کے کباب ہیں تو دن میں اسٹوڈنٹ کی بریانی شہریوں کے لیے تفریح کی سہولتیں تو کم ہیں کھانے پینے کی کم نہیں ہیں۔

کراچی کی واحد تفریح گاہ کلفٹن کے ساحل سے سی ویو تک ساحل سمندر کے ساتھ

ریسٹورنٹس میں وی آئی پی حضرات کے ہجوم نظر آتے ہیں جن میں پی پی پی مسلم لیگ اور ایم کیو ایم کے بڑے ایک ساتھ ڈنر کرتے ہیں۔ مگر بھتہ خوری کے کلچر سے کراچی میں فوڈ کا کاروبار کرنے والے لوگوں کو شکایات ہیں۔ بندو خان کے بڑے صاحبزادہ عباس خان نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا کہ سیاسی جماعتوں اور لسانی تنظیموں کے کارکن اپنے دس سے پندرہ ساتھیوں کے ہمراہ مفت کھانے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔

کباب خوری سے بلڈ خوری کراچی نے ایک طویل سفر بہر حال طے کر لیا ہے۔ کیا امریکی فوڈز چکن تکہ اور کباب کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے؟ عباسی خاں نے پر اعتماد لہجہ میں کہا۔''امریکی کھانے لذت میں پاکستانی کھانوں کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

بلاشبہ یہ ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پاکستانی کھانے ہماری تہذیب وثقافت کی علامت ہیں۔ اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ملک کے کھانوں کو کبھی زوال نہیں آنا چاہیے۔

سکون کی متلاشی ڈیانا
قبر میں جاسوئی

شہزادی ڈیانا نے اپنی بے وقت موت سے برطانیہ کی دم توڑتی ہوئی بادشاہت کو زندہ کردیا۔ شاہی خاندان ایک بار پھر عالمی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پیرس میں حادثہ کا شکار ہونے والی بے چین روح کی التھروپ میں تدفین سے گلاب کو قبر مل گئی مگر ایک ماں مٹی میں مل کر اپنے بچوں ولیم اور ہیری کو زندگی بھر کے لیے بے چین چھوڑ گئی۔ ڈیانا اس لحاظ سے بدقسمت تھی کہ بیٹی اور بیوی کے طور پر اس کو کبھی سکون نہیں ملا پھر جب دو شہزادوں کی ماں بنی تو اس کی شاہی ازدواجی زندگی اجڑ گئی۔ ڈیانا اور چارلس جن کی شادی کو دنیا کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا گیا تھا۔ جب ایک تصویر میں ایک دوسرے کے مخالف سمتوں میں دیکھتے پائے گئے تو دنیا کو اندازہ ہوگیا تھا کہ دونوں کی راہیں جدا ہونے والی ہیں۔ پہلے چارلس نے بے وفائی کا اعتراف کیا پھر ڈیانا نے۔ دونوں پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ گئے۔

ڈیانا محل سے رخصت ہوگئی مگر اس عورت کے طور پر جس کی دنیا میں سب سے زیادہ تصویریں اتاری گئیں۔ ڈیانا کبھی پس منظر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ فوٹو گرافروں کے کیمروں کے لینز اس کے ہمیشہ تعاقب میں رہتے تھے۔ خواہ سمندر کا کوئی کنارہ ہو یا جھیل۔ اسی تعاقب نے ولیم اور ہیری کی ماں اور چارلس اسپنسر کی بڑی بہن کی جان لے لی۔ ڈیانا نے ایک دھندلی تصویر سے بچنے کے لیے پیرس کی سڑک پر موت کو گلے لگا لیا۔ ایک باب

ختم ہوا اور ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ دنیا میں کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ڈیانا اتنی مقبول ہوگی۔ ایک برطانوی اخبار کے الفاظ میں ڈیانا کو موت کے بعد روحانی شخصیت کا درجہ حاصل ہوگیا۔ کروڑوں افراد نے ٹی وی اسکرین پر ڈیانا کا آخری سفر دیکھا۔ پھولوں کی شہزادی پر اتنے پھول پھینکے گئے کہ سڑکوں پر ڈھیر لگ گئے۔ افغانستان سے زمبابوے تک پوری دنیا نے ڈیانا کا سوگ منایا۔ انٹرنیٹ کے ایک جائزہ کے مطابق ڈیانا کی موت دنیا کی ہر اخبار کی لیڈ اسٹوری تھی۔ بیجنگ کے ''پیپلز ڈیلی'' تک نے یہ خبر لیڈ کے طور پر دی۔ یہ اعزاز جان ایف کینیڈی کو بھی نہیں ملا۔ ڈیانا کی موت ایک ہفتہ کے سوگ جنازہ کے جلوس اور تدفین نے ایک بات ثابت کردی کہ دنیا سمٹ چکی ہے۔ گلوبل ولیج ٹی وی سیٹ میں محدود ہو چکا ہے۔ دنیا وہ منظر شاید ہی بھولے گی جس میں پرنس ولیم اور پرنس ہیری نپے تلے قدموں سے اپنے باپ چارلس اور ماموں اسپنسر کے ساتھ ڈیانا کے جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے۔ جنازہ پر سفید پھولوں کے ایک گلدستہ پر لگے سفید کارڈ پر صرف ایک لفظ ہاتھ سے لکھا ہوا تھا ''ممی''۔

دنیا کے لیے ڈیانا خواہ کچھ بھی ہو۔ ہیری اور ولیم کے لیے وہ صرف ماں تھی۔ ڈیانا کی موت نے ہر فرد کو متاثر کیا۔ عورتیں اور بچے پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ ملکہ برطانیہ تک کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بکنگھم پیلس نے ڈیانا کا ''رائل ہائی نس'' کا اعزاز اس کی موت کے بعد بحال کر دیا تھا۔ بادشاہت ہار گئی ڈیانا جیت گئی جس کے ایک مداح نے پھولوں کے ڈھیر میں کوئن آف ہارٹ کا تاش کا پتہ رکھ کر اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی کی تھی۔ ورلڈ کوریج سے یہ بالکل واضح ہے کہ ملکہ الزبتھ اور پرنس چارلس اکٹھے بھی کسی حادثہ میں ہلاک ہو جاتے تو کسی کو اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا ڈیانا کے مرنے سے ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈیانا جوان مری۔ جوان موت کا کسے دکھ نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت ہے کہ چارلس سے علیحدگی کے بعد قدامت پسند حلقوں میں ڈیانا کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ جب اس نے خود ایک ٹی وی انٹرویو میں اپنی بے

وفائی کا اعتراف کیا تو وہ بہت سے لوگوں کی نظروں میں یک لخت گر گئی۔ ڈیانا کی سماجی بحالی اس وقت ہوئی جب لوگوں نے اس کو افریقہ میں بھوک سے بلبلاتے اور ایشیا میں ایڈز اور کینسر کے بچوں کو گلے سے لگاتے دیکھا۔ ڈیانا کا روپ بدل چکا تھا اس کے لیے ناپسندیدہ نظریں محبت کی نظروں میں بدل چکی تھیں۔ امریکہ سے افریقہ تک ڈیانا کے مداح بڑھ گئے تھے۔ عالمی شہرت یافتہ گلوکار ایلٹن جان نے ڈیانا کے لیے اپنا نغمہ CANDLE IN THE WIND کچھ الفاظ بدل کر اس کی آخری رسم میں گایا کیونکہ شمع بجھ چکی تھی گیت کے ابتدائی بول تھے Good bye-England's rose ایلٹن جان کے آنسو ٹپکے اس کا گیت تھا تو ایک ساعت کی خاموشی کے بعد ویسٹ منسٹر ایبے کے باہر سے تالیوں کی گونج اندر تک پہنچ گئی۔

صدیوں بعد پہلی بار ویسٹ منسٹر ایبے میں کسی آخری رسم میں تالیاں بجائی گئیں۔ یہ فوری جذبات تھے جن کو کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ انہی عوامی جذبات نے ڈیانا کے جنازہ کی رخصتی کے وقت ملکہ برطانیہ کا سر جھکا دیا۔ شاہی خاندان جس نے ڈیانا کو رائل فیملی سے نکالا، ٹائٹل سے محروم کیا، طلاق دی اور اس پر غم و غصہ کا اظہار کیا مگر اب ڈیانا کے جنازہ پر سر جھکائے شرمندہ اور نادم کھڑا تھا۔

چارلس سے عوام ناراض ہیں۔ وہ ولیم کو ولی عہد بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ چارلس کی کومیلا پارکر سے شادی اب نہیں ہو سکے گی۔ چارلس کی خاموشی اس کے دل میں اٹھنے والے طوفان کا یقینی طور پر پتہ دے رہی ہے۔ اس کو احساس ہوگا کہ جس کو شاہی خاندان ملکہ کے حکم پر ڈیانا کو اعزازات سے محروم کر کے اپنی دانست میں کمزور کرتا رہا وہ اتنی ہی مضبوط ہوتی گئی۔ اس نے لازمی طور پر تنی ہوئی گردن اور دبے ہوئے ہونٹ کے حامل شاہی خاندان کے خلاف ہر معرکہ جیتا۔ آخری معرکہ میں واحد فاتح ڈیانا تھی، اس کے بچے تھے شہزادوں کی ماں نے شاہی خاندان کو جھکا کر ٹوٹنے سے بچا لیا۔ اس کی مختصر زندگی اور موت کے طویل سفر سے یہ پیغام ملتا ہے کہ ڈیانا ایک عام انسان کی طرح اس دنیا میں

رہنا چاہتی تھی۔ دنیا نے اسے عام زندگی نہیں گزارنے دی۔

ڈوڈی الفائیڈ کے ساتھ اس کو شاید پہلی بار سکون ملا۔ مگر دولت کے متلاشی حریص کیمروں نے ڈیانا اور ڈوڈی دونوں کو چھین لیا۔ ڈیانا کی بے چین روح شاید اب پرسکون ہوگی۔ ڈیانا کے بھائی چارلس اسپنسر نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ میں فوٹو گرافروں کو اپنی بہن کے بچوں کا تعاقب نہیں کرنے دوں گا۔ بھائی کو اندازہ ہے کہ جن بچوں کے والدین میں علیحدگی ہو جائے ان پر کیا گزرتی ہے۔ ڈیانا اور چارلس دونوں نے اپنے والدین کی طلاق کے باعث بڑا غیر محفوظ بچپن گزارا۔ ایک گھریلو ملازم مورٹن کے مطابق دونوں رات کو بہت ڈرتے تھے۔ التھروپ کے گھر کی کھڑکیاں ہوا سے بہت آوازیں نکالتی تھیں۔ دونوں کو اندھیرے سے بڑا خوف آتا تھا۔ دونوں ضد کرتے تھے کہ لائٹ آن رکھی جائے۔ ڈیانا اپنے کھلونوں میں گھری سونے کی کوشش کرتی تھی تو اس کو اپنے بھائی کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں جو ماں کو پکارتا تھا۔ دونوں بہن بھائی ایٹون کے اسکول میں ساتھ جاتے تھے (جواب پرنس ولیم کا اسکول ہے)۔

چارلس اسپنسر کو یقینی طور پر اپنی بہن کی برطانیہ کے ولی عہد کے ساتھ منگنی پر خوشی تھی کہ اس کو زندگی میں خوشی نصیب ہوئی۔ ڈیانا کے اسکول کے دنوں کا آئیڈیل پرنس چارلس تھا۔

اسپنسر کو اسکینڈلز چھاپ کر دولت کمانے والے سستے اخبارات سے چڑ تھی جو اب شاید نفرت میں بدل چکی ہوگی۔ ارل اسپنسر چارلس نے اپنی بہن پرنس آف ویلز کو اپنے خراج عقیدت میں کہا کہ زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری کمی محسوس ہوگی۔ تم جہاں اپنی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک لے کر گئیں۔ تم نے زندگی کی خوشیاں بکھیر دیں۔ مجھے اپنی بہن کو غیر معمولی اور لاثانی کہتے ہوئے فخر ہو رہا ہے۔ اس کا ظاہری اور باطنی حسن ہمارے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوگا۔

ارل اسپنسر نے کہا کہ ڈیانا دنیا بھر میں بے لوث انسانیت کے جذبہ کی مثال تھی

جس کی کوئی کلاس نہیں تھی۔ جس نے گزشتہ سال ثابت کر دیا کہ اپنا جادو جگانے کے لیے اس کو ملکی شاہی اعزاز کی ضرورت نہیں ہے۔

چارلس اسپنسر کی اپنی بہن سے آخری ملاقات یکم جولائی کو ڈیانا کی سالگرہ پر لندن میں ہوئی۔ مگر وہ اپنی سالگرہ دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ منانے کے بجائے غریبوں کے لیے فنڈ جمع کرنے کی تقریب میں مصروف تھی۔

اپنے خراج عقیدت میں ارل اسپنسر نے مارچ 1997ء کو ڈیانا کے جنوبی افریقہ کے دورہ کا ذکر کیا جہاں وہ بھائی سے ملنے گئی تھی ''یہی وہ لمحات ہیں جو میں ہمیشہ عزیز رکھوں گا ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہمارا بچپن لوٹ آیا ہو جب ہم سارا وقت ساتھ گزارتے تھے۔ وہ میری بڑی بہن تھی جس نے مجھے بچہ کی طرح پالا اسکول میں میرے ساتھ لڑتی تھی مگر زیادہ وقت ہم خوش رہتے تھے۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ کیپ ٹاؤن میں ڈیانا کی موجودگی کے دوران ہم فوٹو گرافروں کو اس سے دور رکھنے میں کامیاب تھے۔ ڈیانا کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ میرے خیال میں ڈیانا کبھی یہ بات سمجھ نہیں سکی کہ اس کے نیک ارادوں پر میڈیا کیوں ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ وہ اس کو نیچا دکھانے کی تاک میں کیوں رہتے تھے۔

میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ اچھائیوں سے ان لوگوں کو خطرہ لاحق رہتا ہے جو خود برے ہیں۔ ارل اسپنسر نے کہا ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ اس کے بچوں ولیم اور ہیری کا یہ حشر نہیں ہونے دیں گے یہی ڈیانا کی خواہش ہوگی۔ میں ڈیانا تمہاری طرف سے یہ عہد کرتا ہوں''۔

مبصرین نے یہی سوال اٹھایا ہے کہ کیا ارل اسپنسر اپنے اس عہد کو پورا کر سکیں گے۔ ایک ایسے دور میں جہاں ہر غیر معمولی تصویر کے اپنے دام ہوں۔ فوٹو گرافرز ڈیانا کی موت کے بعد سے عالمی نکتہ چینی کا ٹارگٹ بن گئے ہیں۔ ایلزبتھ ٹیلر نے کہا ''پاپا رازی (پاپولر ہستیوں کے فوٹو کھینچ کر فروخت کرنے والے فوٹو گرافرز) بڑے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک شہزادی کو ہم سے چھین لیا۔ ڈیانا عالمی شہزادی تھی۔ فوٹو گرافرز اس کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ بڑے بے رحم لوگ ہیں۔

کیا پاکستانی سیاستدان خوش لباس ہیں؟

زیادہ تر سیاستدان اپنی شناخت کے لیے قومی لباس کو ترجیح دیتے ہیں

لباس شخصیت کا آئینہ دار اور قوموں کی شناخت ہوتے ہیں۔ ہر خطہ کے لوگ اپنے علاقائی لباس کو جہاں ترجیح دیتے ہیں وہاں اپنے قومی اور بین الاقوامی لباس کو بھی زیب تن کرتے رہتے ہیں۔ سیاستدان تو اس حوالے سے بڑے سرگرم ہوتے ہیں۔ خود کو عوام سے قریب لانے کے لیے عموماً قومی لباس کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اپنے خوش لباسی کے ذوق کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ پاکستانی سیاستدان اپنے لباس کے بارے میں خاصے حساس ہیں۔ وہ علاقائی لباس کی نسبت قومی لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ خاص طور پر سیاسی سرگرمیوں کے دوران اور عوامی اجتماعات کے دوران بدیسی لباس نہیں پہنتے۔ لیکن نجی اور سفارتی تقریبات کے موقع پر ان کی خوش لباسی منظر عام پر آ جاتی ہے۔

پاکستانی سیاستدان خوش لباس ہیں۔ اپنے کلچر کے لحاظ سے لباس زیب تن کرتے ہیں۔ پاکستان کے دو سرکردہ سیاستدان میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو اپنے لباس سے پاکستانی کلچر کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ میاں نواز شریف کا پسندیدہ لباس قمیض شلوار اور واسکٹ ہے جسے وہ سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ قومی کانفرنسوں میں وہ سیاہ شیروانی پہنتے ہیں۔ بیرون ملک دوروں میں شیروانی ہی استعمال کرتے ہیں۔ نواز شریف ڈنر سوٹ میں اچھے لگتے ہیں مگر سوٹ میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی تقلید میں ان کی پارٹی

پاکستان مسلم لیگ کے بیشتر قائدین قمیض شلوار واسکٹ پہنتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ کے زیادہ تر لیڈر فربہ ہیں۔ واسکٹ ان کے بڑھتے ہوئے پیٹ کو نمایاں ہونے سے بچاتی ہے۔ اسی طرح شہباز شریف، چودھری شجاعت حسین، چودھری نثار علی خان، سرتاج عزیز، لیاقت جتوئی، طویل قامت سلیم ضیا، پیر صبغت اللہ شاہ قمیض شلوار اور واسکٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ سندھ میں پنجاب کی طرح سفید قمیض شلوار پر سیاہ واسکٹ کا رواج کم ہے۔ سرحد اور بلوچستان کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ اور صوبائی وزراء بھی قمیض شلوار استعمال کرتے ہیں۔ قمیض شلوار واسکٹ قومی لباس ہے اس کو فروغ ملنا چاہیے مگر قمیض پتلون کبھی کبھار پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک تو اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ عام آدمی کے کپڑے پہن رہے ہیں دوسرے پتلون قمیض سے آدمی کو اپنی ویسٹ لائن کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ علی محمد مہر سفارتی تقریبات میں سوٹ پہن کر جاتے ہیں قمیض پتلون کم پہنتے ہیں۔

ماضی میں مسلم لیگ کی سب سے بڑی مخالف بے نظیر بھٹو زیادہ تر قمیض شلوار پہنتی ہیں۔ اوپر مارگریٹ تھیچر کے اسٹائل میں میچنگ کوٹ پہنتی ہیں۔ خواتین کی رائے میں یہ کوٹ بے نظیر بھٹو کو اسمارٹ نظر آنے نہیں دیتا مگر یہ بے نظیر بھٹو کی مجبوری ہے۔ پاکستانی معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جس میں ان کا واسطہ مردوں کے ساتھ رہتا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی ائرپورٹ پر آمد و رفت کے وقت جیالوں کی دھکم پیل خواتین کو پریشان کرنے کے لیے کافی ہے۔ خود بے نظیر بھٹو کو کئی بار اپنی طرف بڑھنے والے جیالوں کو ایک آدھ تھپڑ رسید کرنا پڑ جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو جب جنرل ضیاء الحق کے خلاف تحریک چلا رہی تھیں عام طور پر سوتی کی قمیض شلوار پہنتی تھیں۔ اس پر میچنگ سینڈل لیتی تھیں۔ بے نظیر نے ہمیشہ سینڈل اور شو استعمال کئے۔ پی آئی اے کی ائرہوسٹسوں کے اسٹائل والا شوان کا پسندیدہ ہے۔ چپل شاید ہی کبھی استعمال کی ہوگی۔ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد جب 24 سالہ بے نظیر بھٹو پہلی بار 70 کلفٹن میں منظر عام پر آئیں تو سیاہ دوپٹہ اور سیاہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔

اس وقت بے نظیر بھٹو نے جو "پنکی" تھیں اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا "میرے پاپا عوام کے دلوں میں ابھی تک زندہ ہیں"۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو کی زندگی میں خوشیاں کم تھیں اور غم زیادہ۔ آصف علی زرداری کے ساتھ شادی ان کی زندگی کی غالباً پہلی خوشی تھی۔ شادی پر بے نظیر بھٹو نے نہایت خوبصورت جوڑا پہنا تھا بیگم حاکم علی زرداری روایتی ساس کی طرح ان کو مہمانوں سے ملا رہی تھیں۔ آصف زرداری کی بہنوں فوزیہ عذرا اور فریال سے شروع میں بے نظیر کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ ولیمہ پر بے نظیر نے سفید لباس پر قیمتی کام کا سیٹ پہنا تھا۔ آصف علی زرداری سفید قمیض شلوار پر سفید پگڑی باندھے ہوئے تھے۔

بے نظیر کو 70 کلفٹن ہی میں 17 اگست 1988ء کو وہ خبر ملی جس نے پاکستانی میں جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دور کر دی۔ جنرل ضیاء الحق کا طیارہ فضا میں پھٹ کر تباہ ہو گیا۔ 70 کلفٹن کے گیٹ پر ناہید خان نے کارکنوں میں مٹھائی تقسیم کی۔ بے نظیر نے کہا زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس واقعہ کے بعد بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔ ان کے مخالف جنرل ضیاء الحق نے مرتے دم تک وردی نہیں اتاری جس وردی کو اتارنے کا پاکستانی سیاستدان ان سے مطالبہ کرتے رہے اس میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق کا شمار پاکستان کے "ویل ڈریس" حکمرانوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شیروانی استعمال کرتے تھے اور اور بڑے منکسر المزاج تھے۔ کراچی میں 1980ء کے اوائل میں سوزوکی کار کی ایک تقریب میں جب جنرل ضیاء الحق کے گلاس کی کوک چھلک کر سیٹھ عابد کے سفید کرتے پر جا گری تو پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر نے اپنی شیروانی کی جیب سے رومال نکال کر سیٹھ عابد کا کرتا صاف کیا یہ ان کی انکساری کی مثال تھی۔

بیگم بھٹو کا شمار پی پی پی کی پہلی حکومت میں خوش لباس خواتین میں کیا جاتا تھا بھٹو کی پھانسی اور شاہنواز کی موت کے بعد بیگم بھٹو زیادہ تر سفید اور سیاہ لباس میں رہتی تھیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد ان کو صحیح معنوں میں خوشی نصیب ہوئی۔ وہ دوبارہ رنگین

ساڑھیاں زیب تن کرنے لگی تھیں۔

سانحہ کلفٹن کے بعد جس نے مرتضیٰ بھٹو کو ان سے چھین لیا، بیگم بھٹو ایک بار پھر ماتمی لباس میں آ گئی ہیں۔ وہ ایک بدنصیب ماں ہیں جس کے دو بیٹے غیر فطری موت کا شکار ہوئے اور دونوں دامادوں پر قتل کے مقدمات قائم ہوئے۔ صنم بھٹو لباس کے معاملہ میں لاپرواہ نظر آتی ہیں۔ شادی سے پہلے اور بعد وہ زیادہ تر جینز پر قمیض پہنتی تھیں۔ بھائی کی موت کے بعد صنم بھٹو سادہ لباس زیب کرتی ہیں لیکن ان کی بیٹی آزادی پروقار ڈریسنگ کرتی ہے۔

سابق مرد اول آصف علی زرداری قید میں ہیں۔ مگر بدستور ویل ڈریس ہیں۔ ان کے خلاف مقدمہ کی سماعت جیل میں ہو رہی ہے۔ آصف زرداری کبھی سوٹ کبھی قمیض شلوار میں ہوتے ہیں۔ گردن پر اسکارف باندھنے لگے ہیں۔

سندھ کے سیاستدانوں میں غلام مصطفیٰ جتوئی، پیر صاحب پگارو، مخدوم امین فہیم، الٰہی بخش سومرو، ممتاز علی بھٹو، مخدوم خلیق الزمان، آفتاب شعبان میرانی، سید خادم علی شاہ، میاں رضا ربانی، این ڈی خان، اے ڈبلیو عبدالحفیظ پیرزادہ خوش لباس ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی موقع کی مناسبت سے ڈریسنگ کرتے ہیں۔ سفارتی تقریبات میں بلیک سوٹ میں جانا پسند کرتے ہیں۔ کرتا شلوار گھر میں پہنتے ہیں۔ بوشرٹ پتلون پسندیدہ لباسوں میں شامل ہے۔ بوشرٹ تیز رنگوں کی اور ٹائیاں دھاری داری اور پھولدار لیتے ہیں۔ پاکستان کے کئی سیاستدانوں کی طرح امریکہ اور یورپ سے کپڑوں کی خریداری کرتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو نیویارک کے سیک ففتھ ایوینیو سے خریداری کرتی ہیں۔ جتوئی کو لندن پسند ہے۔ پیر صاحب پگارو ہوانا کے سگاروں کے علاوہ رنگ برنگی ٹائیوں کے شوقین ہیں۔ کرتا شلوار پر سفید واسکٹ ان کو بہت پسند ہے۔ کم وبیش یہی ڈریس حاکم علی زرداری کا ہے۔ جواب زیادہ تر اپنے بیٹے آصف زرداری کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔

مخدوم امین فہیم سوٹ پسند کرتے ہیں۔ لندن میں ان کا اپنا فلیٹ ہے۔ الیکشن کے بعد کافی عرصہ لندن میں رہے۔ ان کے بھائی مخدوم خلیق الزمان ویل ڈریس ہیں۔ وہ

تیاری کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے۔ مسٹر اینڈ مسز خلیق الزمان سفارتی تقریبات کی جان ہیں۔

آفتاب شعبان میرانی سندھ کے اسمارٹ سیاستدانوں میں سے ہیں۔ باقاعدگی سے جوگنگ کرتے ہیں۔ بلاول ہاؤس میں جہاں سرکردہ جیالے قمیض شلوار میں نظر آئیں گے۔ آفتاب شعبان میرانی بوشرٹ پتلون اور واکنگ شوز میں نظر آئیں گے۔ بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں ان کے ساتھی این ڈی خان اور رضا ربانی سوٹ قمیض پتلون اور قمیض شلوار تینوں پسند کرتے ہیں۔ رضا ربانی گریبان کے بٹن کھلے رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں سید قائم علی شاہ کبھی گریبان کھولنے کے قائل نہیں۔ ان کے صاحبزادہ سید اسد علی شاہ سمارٹ اور ویل ڈریس کہلوائیں گے۔

سندھ کے وزراء میں ایم کیو ایم کے ڈاکٹر فاروق ستار وزن کے اعتبار سے بھی نہایت اسمارٹ ہیں۔ ایم کیو ایم نے 1988ء کے انتخابات کے بعد اپنے وزراء اور ارکان اسمبلی کے لیے سفید کرتا واسکٹ اور تنگ پاجامہ پہننے کی پابندی عائد کی تھی جس کو ''مہاجر ڈریس'' قرار دیا گیا جس پر ایم کیو ایم کے ارکان کو اسلام آباد میں بہت جلد احساس ہو گیا کہ لباس کے معاملہ میں قومی دھارہ سے الگ رہنا سودمند نہیں ہے۔ اب منتخب اور غیر منتخب حق پرست سوٹ قمیض پتلون سفاری سوٹ قمیض شلوار سب پہنتے ہیں۔ ''مہاجر لباس'' پر اصرار کا فیصلہ غلط تھا۔ اردو اسپیکنگ پاکستانیوں کے آباؤ اجداد قمیض پاجامہ پہنتے تھے۔ ان کی تیسری نسل قمیض شلوار پہن رہی ہے۔ جو خالصتاً پاکستانی لباس ہے۔ اہل کراچی اور حیدر آباد کو لکھنو کا لباس پہننے پر مجبور کرنا صحیح نہیں تھا۔ خود ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین ویل ڈریسڈ ہیں جو لباس کے معاملہ میں صحیح تراش خراش اور کپڑے کا اعلیٰ معیار دیکھ کر کپڑا پہننے کا قائل ہیں۔ تاہم الطاف حسین نے کرتا پاجامہ لندن میں بھی نہیں چھوڑا ہے۔ جو سیاستدان الطاف حسین سے پہلے کرتا پاجامہ پہن رہے ہیں مزدور کسان پارٹی کے صدر فتح یاب علی خان ہیں۔ پیر پگاڑو کے پڑوسی ہونے کے ناطے فتح یاب علی خان ان کی سالگرہ میں باقاعدگی سے مدعو کیے جاتے ہیں۔ جہاں وہ کبھی سوٹ میں کبھی کھدر کے کرتے اور

سفید تنگ پاجامہ میں جاتے ہیں۔ فتح یاب علی خان کی اہلیہ ڈاکٹر معصومہ حسن گریڈ 22 میں پاکستان کی پہلی خاتون بیوروکریٹ ہیں جو ویانا میں تین سال کا سفارتی اسائنمنٹ پورا کر کے وطن واپس آ گئی ہیں۔ ڈاکٹر معصومہ حسن کے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کے بیٹے بیرون ملک تعلیم پا رہے ہیں۔ فتح یاب علی خان کی سیاست کا گھرانہ پر اثر نہیں پڑتا ہے۔ ممتاز سیاستدان، قانون دان اور شہری آزادیوں کے علمبردار نفیس صدیقی منتخب پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ نفیس صدیقی ان گنے چنے سیاستدانوں میں سے ہیں جو بالوں کی سفیدی کو سیاہی سے چھپانے کے قائل نہیں ہیں۔ نفیس صدیقی کے گھر سیاستدانوں اور سفارت کاروں کے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ نفیس صدیقی قمیض پتلون کو ترجیح دیتے ہیں جسے آرام دہ لباس قرار دیتے ہیں۔ جنرل ضیاالحق سے لے کر نواز شریف کے دور جمہوریت تک نفیس صدیقی بہت سرگرم رہے۔ وہ پہلے غلام مصطفیٰ جتوئی کی نیشنل پیپلز پارٹی میں پیر آفتاب شاہ جیلانی کے ساتھ رہے۔ نفیس مسلم لیگ میں اور پیر آفتاب پیپلز پارٹی میں ہیں۔ دراز قد پیر آفتاب فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل چکے ہیں۔ اسپورٹس کی ٹی شرٹ نجی تقریبات میں پہنتے ہیں۔ سیاست سے تقریباً سبکدوش سرکردہ فنکار خلیل احمد نینی تال والا فرانس کی پرفیوم کے رسیا ہیں۔ پی ڈی پی سندھ کے صدر مشتاق مرزا کی حلیم کی دعوت میں وہ سرخ سوٹ ہری ٹائی اور زرد قمیض پہن کر آتے۔ جس کی سب سے زیادہ آصف علی زرداری نے تعریف کی تھی۔ ان کی اہلیہ بینظیر بھٹو ان کے ساتھ تھیں۔ سیاستدان خواتین میں عابدہ حسین، بیگم شمیم این ڈی خان، ڈاکٹر محمودہ سلطانہ، بیگم ممتاز قریشی، فریال تالپور، ناہید خان، نسرین جلیل خوش لباس خواتین میں شمار ہوتی ہیں مگر بیگم اشرف عباسی کے صاحبزادے منور علی عباسی نے جنرل ضیاالحق کو مارشل لا کے دور میں سندھی اجرک پہنانے کی جو غلطی کی اس کی سزا اب تک بھگت رہے ہیں۔ لاڑکانہ کی دیواروں پر ان کے خلاف اب بھی نعرے درج ہیں۔ سیاستدان عوام کو بھول سکتے ہیں مگر عوام سیاستدانوں کی ہر بات یاد رکھتے ہیں خاص طور پر ان کے لباس کو کبھی نہیں بھولتے۔

پاکستانی معاشرہ سے کتاب غائب ہو رہی ہے

آپ کے شہر میں کوئی کتاب پڑھنا نظر نہیں آتا؟

ایک بھارتی صحافی نے کراچی پریس کلب کے صدر صلاح الدین حیدر کو یہ سوال کر کے حیران نہیں کیا ان کو اندازہ تھا کہ معاشرہ سے جس طرح کتاب غائب ہوئی ہے کبھی یہ سوال ضرور ہوگا۔ نوجوان صحافی فرحت شیر خان کی تصنیف ''کتاب سے کلاشنکوف تک'' کی تقریب رونمائی میں تقریر کرتے ہوئے صلاح الدین حیدر نے کہا میرے لیے عام شہریوں سے زیادہ صحافیوں کو ڈیفنڈ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جو اخبار تک ڈیوٹی کے طور پر پڑھتے ہیں۔ کراچی لاہور پشاور یا کوئٹہ کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ لیکن پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ طلبا صرف امتحانات کے لیے پڑھتے ہیں۔ کتابوں کی دکانیں ختم ہو رہی ہیں۔ صرف کراچی میں گذشتہ دس سال میں کتابوں کی 28 بڑی دکانیں فروخت کردی گئیں۔ ان کی جگہ الیکٹرونک کی مصنوعات ریڈی میڈ ملبوسات بوتیک اور بیوٹی پارلر کھل گئے ہیں جہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ معاشرہ میں پڑھنے کی عادت ختم ہو رہی ہے۔ اور شاید دیکھنے کی عادت بڑھ رہی ہے۔ ٹیلی وژن، ڈش انٹینا، وی سی آر سب اسی کیٹگری میں آجاتے ہیں۔ اگر کتاب سے دوری کی وجہ الیکٹرانک میڈیا ہے تو اس کا اثر ترقی یافتہ ملکوں میں کیوں نہیں پڑا۔ جہاں صبح سے رات تک لائبریریوں میں ہجوم لگے رہتے ہیں۔ اس سوال پر سرسید یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کہا کہ لوگ پیپر بیک تک خریدنے کی

استطاعت نہیں رکھتے۔ کتابیں مہنگی بہت ہیں پھر بحیثیت قوم ہم پڑھنے لکھنے والے لوگ نہیں رہے محلے کی آنہ لائبریری عرصہ پہلے اجاڑ ہو کر بند ہو گئی اب اس کی جگہ وڈیو کی دکان نے لے لی ہے۔ وڈیو سوسائٹی وجود میں آ گئی ہے۔ پورا معاشرہ وڈیو کی لپیٹ میں ہے۔ بیس سال پہلے جب لاہور میں ٹیلی وژن پر بھارتی فلمیں دوز درشن کی بدولت نظر آنا شروع ہوئیں تو پورے ملک میں کہرام مچ گیا تھا بھارت کی ثقافتی یلغار کو روکا جائے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ کوئی سیاستدان، بیوروکریٹ، تاجر، صنعتکار، ڈاکٹر، پروفیسر، شاید ہی ایسا ہو گا جو زی ٹی وی نہ دیکھتا ہو۔ ہوٹلوں میں 24 گھنٹے دیکھا جاتا ہے۔ کراچی سے لاہور تک گھروں میں چلتا ہے۔ ثقافتی حملہ کو پہلے برداشت کرنا محال تھا اب خوش دلی سے قبول کر لیا گیا ہے پاکستانی گھروں میں پاکستانی بچے نئی زبان سیکھ رہے ہیں۔ جن میں رام، بھگوان، کرپا جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ وڈیو کی دکانوں پر انڈین فلموں کی جو مانگ ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لیے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور جنرل بخت خان اجنبی ہیں۔ ان کی واقفیت سنجے دت، چنکی پانڈے اور گوندہ سے ہے۔ یہ زہر رگ و پے میں ایسا سمایا ہے کہ نسلوں کو منتقل ہو رہا ہے۔ منگنی مہندی اور شادی بیاہ کے موقعہ پر ماں باپ فخریہ کہتے ہیں ہماری بچی کے چولی والے ڈانس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔

عام شہری کو اس صورتحال پر کیوں مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ ایک سرکردہ شاعر اور ادیب نے حال ہی میں انٹرویو میں کہا تھا کہ میں فرصت کے وقت میں انڈین فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا ہوں۔

ڈاؤ میڈیکل کالج کے ایک نوجوان طالب علم سے جب پوچھا گیا کہ وہ بھارتی فلمیں کیوں دیکھتا ہے تو اس نے کاندھے جھٹک کر کہا جنرل ضیاء الحق کی آمریت سے بے نظیر کی جمہوریت تک ہم پاکستانی ''قائداعظم'' بنا کر ''گاندھی'' کا جواب نہیں دے سکے۔ تو نوجوان نسل کے پاس کیا چوائس ہے۔ اس کی رائے میں پاکستانی ٹیلی وژن وہی لوگ دیکھ رہے ہیں جو ڈش انٹینا افورڈ نہیں کر سکتے۔ غریب اور متوسط آدمی کے لیے وڈیو سستی

تفریح ہے۔ اس کو اپنے اخلاق کی اتنی پرواہ نہیں ہے جب پاکستانی فلم ساز معیاری فلمیں بنائیں گے وہ ضرور دیکھے گا۔ اسی طرح جب کتابیں سستی ہوئیں تو اس کو خریدے میں عار نہ ہوگا۔

خود سیاستدانوں میں جو معاشرہ کے رہنما سمجھے جاتے ہیں پڑھنے کی عادت ختم ہو رہی ہے۔ بعض تو سونے کے لیے پڑھتے ہیں۔ کئی کے پاس اسٹڈی روم ہیں جن میں صرف کافی پینے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے والے سیاستدانوں کی نسل معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ کراچی کے ایک بڑے بک اسٹال کے منیجر کے مطابق چودھری محمد علی اور ذوالفقار علی بھٹو ان گنے چنے سیاستدانوں میں تھے جو ہر نئی کتاب آتے ہی منگوا لیتے تھے۔ آج کل کے سیاستدان فائیو اسٹار ہوٹل میں تو مل جائیں گے بک شاپ میں شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے۔ موجودہ سیاستدانوں میں سردار شیر باز مزاری کراچی میں شاید واحد ہیں جن کے پاس ہر موضوع پر کتابوں کا وسیع ذخیرہ ہے۔ اور ان کی گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ان کو ضرور پڑھتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر ان کی بڑی نظر ہے۔ ان کے برخلاف ایک ایسے قومی سیاستدان بھی ہیں جو ملک کے نگران وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ جب ان سے کسی نے جنرل ضیاء کے دور کی آٹھویں آئینی ترمیم کے بارے میں ان کا ردعمل پوچھا تو انہوں نے کہا ''سائیں میں نے پڑھی نہیں''۔ بہرحال اس کی جو چیزیں اچھی ہیں ان کو ویلکم کریں۔ جو خراب ہیں ان کو رد کریں اور آخر میں یہ ضرور کہیں کہ جنرل ضیاء الیکشن کرائیں اور جائیں ان کو اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

کیا سیاستدان کیا افسر کیا کلرک کیا عام شہری پاکستانی کتابیں کیوں نہیں پڑھ رہے ہیں؟

اس استفسار پر صدر کے ایک بڑے بک اسٹور کے مالک نے کہا کتابوں کے رسیا کم ہو رہے ہیں۔ لوگ کتابوں کی بجائے جوتے کپڑے پرفیوم پر رقم خرچ کر دیتے ہیں۔ نئے سوٹ کی ان کو ضرورت ہے نئی کتاب کی نہیں ہے۔ ملک میں خواندگی کی شرح کم

ہے۔ بچوں میں نے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی تعلیم کا معیار گر رہا ہے۔ نقل کر کے امتحان پاس کر لیے جاتے ہیں۔

کراچی لاہور پشاور اور کوئٹہ سب جگہ ڈگریاں فروخت ہوتی ہیں۔ طالب علم پڑھ کر کیا کریں گے۔ کتابوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں اس نے بھی مطالعہ سے دوری پیدا کر دی ہے۔

کتابیں مہنگی ہیں ایک بک سیلر کے مطابق 1971ء میں جو کتاب 5 روپے میں ملتی تھی۔ 1994ء میں وہ 5 سو روپے کی ہے۔ کاغذ کی قیمت بے تحاشہ بڑھی ہے۔ لاگت میں اسی شروع سے اضافہ ہوا ہے۔ کلفٹن کے ایک بک اسٹور میں 90 فیصد کتابیں امپورٹڈ ہیں جن کی قیمتیں ڈالر اور پاؤنڈ میں مقرر کی جاتی ہیں۔ کلفٹن جیسے پوش ایریا کی اس دکان میں اکا دکا کتاب ہی روزانہ بکتی ہے۔ کتابوں کی دکانیں کیسٹوں اور کرسمس کارڈوں سے بھری نظر آتی ہیں۔

جب دولت مند طبقہ کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو غریب اور متوسط طبقے کا علم دوست کیا کرے گا؟

سینئر صحافی عبدالقدوس فائق نے جو کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ایک ملاقات میں بتایا کہ اب کتابوں کے لنڈا بازار کھوڑی گارڈن میں بھی پرانی بوسیدہ کتابیں بہت مہنگی ملتی ہیں۔ ردی کے بھاؤ خریدی جانے والی جو آکسفورڈ ڈکشنری چند سال پہلے 10-20 روپے میں مل جاتی تھی اب اس کے 100-200 روپے مانگے جاتے ہیں۔ کباڑیوں کو کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہے۔ وہ خریدار کو غور سے کتاب کو الٹتے پلٹتے دیکھ کر اس کی قیمت بڑھا دیتا ہے۔ بے دلی سے کتاب پھینک کر قیمت پوچھی جائے تو اس کے صحیح دام لگتے ہیں ورنہ کھوڑی گارڈن میں کاریٹ طلب کر لیا جاتا ہے۔

عبدالقدوس فائق نے 50 ہزار کتابیں کباڑیوں سے خرید کر جمع کی ہیں۔ جن میں کئی نادر قلمی نسخے شامل ہیں۔ ان کے خیال میں اگر کسی کو واقعی کتابوں کا شوق ہے تو

کھوڑی گارڈن کی خاک چھان کر اچھی کتاب سستی خرید سکتا ہے۔ جن کو ڈرائنگ روم اسٹڈی میں سجانے کے لیے کتابیں چاہئیں ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صدر سے کلفٹن سے کتابیں خرید لیتے ہیں۔

- کیا ملک میں کتابیں سستی ہوسکتی ہیں؟

کراچی کی سب سے قدیم کتب شاپ کے مالک نے کہا کہ بھارت میں کتابیں اتنی مہنگی نہیں ہیں پرنٹنگ میٹریل ٹیکس فری ہیں اگر پاکستان میں یہی اصول اپنایا جائے تو کتابیں سستی بک سکتی ہیں۔ اس طرح وہ شہریوں کی قوت خرید میں ہوں گی تو وہ ضرور خریدیں گے۔

لوگ کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس سوال پر ملک کے ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس کے جنرل منیجر نے کہا کہ سیاسی کتابیں زیادہ بکتی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی تحریر کردہ کتابیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ پاکستان کے حالات پر غیر ملکی مصنفین کی کتابیں بھی لوگ شوق سے خریدتے ہیں۔ ویٹنگ فار اللہ، جناح ٹو ضیاء، ڈاٹر آف ایسٹ اور تہمینہ کھر کی مائی فیوڈل لارڈ بہت مقبول ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ چاروں صوبوں میں مطالعہ کا رجحان مختلف ہے۔ پنجاب میں سب سے زیادہ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سندھ، سرحد اور بلوچستان کا نمبر آتا ہے۔ پنجاب میں زندگی پرسکون ہے۔ اور پڑھنے کے لیے وقت مل جاتا ہے کراچی میں اتنی افراتفری ہے کہ کسی شہری کے پاس کتاب کے لیے وقت نہیں۔ اس کو گھر کی فکر رہتی ہے۔ حالات کیا ہوں گے۔ ٹرانسپورٹ مل جائے گی۔ گھر پہنچے گا تو بجلی ہوگی کہ نہیں۔ ان کے روزمرہ کے مسائل نے بھی اہل کراچی کی کتابوں سے دوری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پاکستانی معاشرہ میں کتاب کو کیسے واپس لایا جائے گا؟ کیا یہ اب ناممکن ہے؟

یہ ناممکن کسی طور نہیں ہے۔ یہ حکومت اور معاشرہ دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے اگر حکومت لگژری کاروں پجیرو، جیپوں اور سپورٹس کاروں کی جگہ کتابوں کو ترجیح دینے کا

فیصلہ کرلے تو قوم کا مستقبل سنور سکتا ہے۔

کیا سیاستدان اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنے کو تیار ہیں؟

ایک قومی سیاستدان نے جن کے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے لے کر بے نظیر بھٹو کے پورٹریٹس آویزاں ہیں، ایک سرد آہ بھر کر کہا ہم میں نہ سچ کہنے کی عادت ہے نہ سچ سننے کی۔ تو سچ پڑھنے کی کیسے ہوگی؟ پاکستان کے کئی سیاستدان اپنی خودنوشت سوانح حیات ارادے برسوں سے بنائے بیٹھے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ سچ کسی سے برداشت نہیں ہوگا۔ جس معاشرہ میں سچ برداشت نہ کیا جاسکے اس سے کتاب غائب ہی ہوگی۔

فوڈ کلچر

بے نظیر آئس کریم اور نواز شریف لسی کلچر کے علمبردار

برنس روڈ کی نہاری، کباب تکے کی دوکانوں پر اگرچہ رش رہتا ہے مگر وہ بات نہیں رہی جو کلفٹن، ڈیفنس، گلشن اقبال، نارتھ ناظم آباد، محمد علی سوسائٹی اسکیم نمبر دن میں فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس میں نظر آتی ہے۔ جہاں لوگ فیملی کے ساتھ جا کر کھا سکتے ہیں۔ کلفٹن کا بوٹ بیسن رات کو امریکہ کے کسی ٹاؤن کا منظر پیش کرتا ہے۔ "پیزا ہٹ" امریکی اسٹائل میں بنایا گیا ہے۔ جہاں اٹلی کا پیزا پاکستانی سبزیوں کے ساتھ کھایا جا سکتا ہے۔۔ ٹرے گلاس جگ تک امریکی طرز کے ہیں۔ پیزا اور برگر امریکہ میں اپر کلاس کا فوڈ نہیں ہے۔ عام طور پر اسے جنک فوڈ کہا جاتا ہے۔ جو بچوں طلباء اور غریبوں کو سستا ہونے کی وجہ سے پسند ہے پاکستان میں برگر اپر کلاس کا فوڈ ہے۔ سیاستدانوں بیوروکریٹس تاجروں صنعتکاروں کے بچے برگر کھا کر برگر کلاس، بن گئے ہیں۔ بوٹ بیسن پر ہی جو محترمہ بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کی پسندیدہ جگہ ہے، بلوچ کی آئس کریم بڑی پاپولر ہے۔ جب کہ بلوچ سرپرائز، مہنگی مگر لذیذ ہوتی ہے۔ بلاول ہاؤس کے مکین آئس کریم کے رسیا ہیں۔ وزیراعظم اور آصف زرداری اپنے من پسند کھانے کے لیے بوٹ بیسن جانے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ بے نظر بھٹو جب اپوزیشن میں تھیں تو اپنی سالگرہ پر سہیلیوں کی آئس کریم پارٹی ضرور کرتی تھیں۔ جن میں فیروزہ، پنکی، سمیہ وحید، سلمیٰ وحید نمایاں ہوتی تھیں۔ یہ وہ دور

تھا جب ناہید خان منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ ایک اخبار میں ان کے آئس کریم کھانے کی خبر چھپ گئی تو محترمہ بے نظیر بھٹو پیپلز پارٹی کے ہمدرد اخبار نویس پر خفا ہوئیں اور کہا ''خبر آپ کو انٹیلی جنس والوں نے بتائی ہوگی۔ جو میری کار کا پیچھا کر رہے تھے'' اس جیالے اخبار نویس کو بڑی مشکل سے معافی ملی۔

آصف علی زرداری کی جب پہچان صرف یہ تھی کہ حاکم علی زرداری کے صاحبزادے ہیں کراچی کی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کے دفتر میں جہاں وہ اپنے ہاؤسنگ پروجیکٹس کی منظوری کے لیے جاتے تھے بھنے ہوئے چنے شوق سے کھاتے تھے اور دفتر میں داخل ہوتے ہی کنٹرولر آف بلڈنگز احمد حسین سے کہتے ہیں ''کہاں ہے میری خوراک'' آصف زرداری سادہ خوراک کے اب تک شوقین ہیں۔

کراچی کے شہریوں کے فیورٹ فوڈ کراچی سے باہر کے ہیں۔ یعنی لاہوری چرغہ، ٹنڈو آدم کی بجی، پشاوری آئس کریم، پنجاب کی لسی وغیرہ۔ نواز شریف کو کراچی کے دورہ میں جب موقعہ ملتا برنس روڈ کی دوکان سے لسی ضرور پیتے تھے۔ ان کے بعض فربہ ساتھی تو لسی میں بھی پیڑے ضرور ڈلواتے تھے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو میں سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا فرق کلچر ہے۔ نواز شریف لسی کلچر کے علمبردار ہیں تو بے نظیر آئس کریم کلچر کی۔

پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاستدان مذاکرات کی میز پر شاید اکٹھے نہ بیٹھ سکیں مگر کراچی میں فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانے کی میز پر اکثر ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے لیڈروں کا ہینگ آؤٹ، یہی جگہیں ہیں۔ بات چیت نہ کریں لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر ہاتھ ہلا دیتے ہیں۔ شیرٹن، میریٹ، پرل کانٹی نینٹل، میں رات کو مسلم لیگ اور جیالے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی حکمت عملی مرتب کرتے پائے جاتے ہیں۔ جبکہ سی ویو میں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ کنارہ، قبلائی خان اور بلاول ہاؤس کے قریب ''باربی کیو'' میں بڑی رونق لگی رہتی

ہے۔

کسی زمانے میں بندو خان کے کباب کراچی کی پہچان تھے۔ اندرون ملک سے آنے والے سمندر پار پاکستانی کراچی آتے ہی ایم اے جناح روڈ کی طرف لپکتے ہیں۔ کراچی کے بزرگوں کے مطابق بندو خان نے ایک تختے سے کباب کا کاروبار شروع کیا اپنی محنت سے کبابوں کی ایمپائر بنالی کوئی پندرہ سال قبل بندو خان کے برابر میں ''الحمرا'' کھل گیا تو کانٹے کا مقابلہ شروع ہوگیا جو اب تک جاری ہے۔

قیصر کی تندوری ران اہل کراچی میں بدستور مقبول ہے۔ محمد علی سوسائٹی میں میرٹھ کے کباب کی دکان پر اب بھی رش رہتا ہے گولہ کباب بھی بچوں اور بڑوں میں یکساں پسند کیا جاتا ہے۔ طارق روڈ کے پراٹھہ رول کی مقبولیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ فاسٹ فوڈ کی دکانیں شام کو کھلتی ہیں۔ جو رات گئے تک شہریوں کی لذت کام و دہن کی ضروریات پوری کرتی ہیں تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکے کلفٹن، ڈیفنس، گلشن اقبال، محمد علی سوسائٹی اسکیم نمبر ون کی دکانوں پر اپنے تعلیمی اور گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے کام کرتے ہیں جن کا زیادہ تر گزارہ ٹپ پر ہوتا ہے۔ کبھی کوئی وڈیرہ خوش ہو کر اچھی ٹپ دے دیتا ہے تو کبھی کوئی منچلا گروپ کھا کر تیز رفتار کاروں میں بھاگ جاتا ہے۔

بوٹ بیسن پر ایک نوجوان بیرے نے ہمیں بتایا ''اب کسی کی گاڑی سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ آدمی شریف ہوگا۔ بڑے لوگوں کی اولادیں تفریح میں فری کھا کے بھاگ جاتی ہیں''۔

کراچی میں گھر سے باہر کھانا کھانے والوں میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں جن میں موٹر سائیکل پر آنے والے بھی، سوزوکی کیری میں بھرے ہوئے بڑے اور بچے بھی، پجیرو، ہنڈا اکارڈ، مستوبشی، لینڈ کروزر، رینج رور، مرسڈیز میں آنے والے بھی بڑی لگژری گاڑیوں میں آنے والے خوش خوراک جو ہاتھوں میں موبائل فون لیے رہتے ہیں شامل ہوتے ہیں۔ ایک امریکی سیاح جو کراچی کے تفریحی مقامات کی سیر کر رہا تھا اس سے

ہماری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا ”میں نے نیویارک کی سڑکوں پر اتنے کارفون (موبائل فون) نہیں دیکھے جتنے کراچی میں نظر آتے ہیں۔ ہر دسواں ڈرائیور ٹریفک کے شور دھویں ہارنوں کی گونج میں ٹیلی فون پر بات چیت میں مصروف نظر آتا ہے“۔

ایک بات کا اہل کراچی اور باہر سے آنے والے دونوں اعتراف کرتے ہیں کہ یہ غریب پرور شہر ہے۔ اولڈ سٹی ایریا میں رنچھوڑ لائن کھارا میٹھا در میں بھوکے آدمی کا پانچ روپے میں پیٹ بھر سکتا ہے۔ دو روپے کی قیمہ کی پلیٹ ملتی ہے۔ ایک روپے کی دو روٹیاں بھی ملتی ہیں۔ دکانوں پر شام سے علی الصبح تک ہجوم لگے رہتے ہیں۔ یہ فلیٹوں کے مکینوں کے علاقے ہیں۔ جہاں کوئی سوتا نہیں ہے، گڈلک حلیم کے اسٹال پر لکی ڈرا نکلتے ہیں جن میں بچوں کے سوٹ، کھلونے، تحائف، حلیم کھاؤ گفٹ لے جاؤ، وغیرہ ہوتے ہیں، اولڈ سٹی ایریا کے باشندے جو کاروباری اداروں، بینکوں مالیاتی اداروں میں کام کرتے ہیں بند دکانوں کے چبوتروں پر بیٹھے باتیں کرتے پائے جاتے ہیں۔ اکثریت پرامن لوگوں کی ہے۔ اس لحاظ سے کراچی کے پسماندہ علاقہ لیاری کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ ترقی میں تو کراچی کے پوش علاقوں کو کبھی ہرا نہیں سکا لیکن امن و امان میں جیت چکا ہے۔ لیاری کے ایک صحافی کی رائے میں اہل لیاری ایک دوسرے کی جان لینے میں بہت پیچھے ہیں۔ لیاری میں جمہوری تحریکیں چلی ہیں مگر کبھی کسی اردو بولنے والے نے سندھی کا یا سندھی بولنے والے نے پنجابی کا خون نہیں بہایا۔ ہمیں اس پسماندگی پر فخر ہے۔ پرامن حالات کی وجہ سے لیاری کے ہوٹل پوری رات کھلے رہتے ہیں۔ انڈین فلمیں اور پنجابی گانے اہل لیاری کی پسند ہیں۔ لیاری والے چائے سگریٹ اور پان پر زندہ ہیں۔

کراچی میں جتنے سندھی بلوچ پان کھاتے ہیں۔ اردو بولنے والے نہیں کھاتے ہوں گے۔ اردو بولنے والوں کی دوسری اور تیسری نسل کی پہچان پان کا بیڑہ نہیں ہے گھروں میں پاندان کا انسٹی ٹیوشن ختم ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کاندھے اچک کر دادی اور نانی کے پاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض خواتین پرانے پاندانوں کو نوادرات کے طور پر

ڈرائنگ روم میں سجانے لگی ہیں۔اہل کراچی نے پاندان کے ساتھ ہی اگالدان کو بھی دفن کردیا ہے۔اس کے باوجود پان تھوکنے کی عادت نہیں چھوڑی۔ کراچی کی سڑکوں، گلیوں، عمارتوں کی دیواروں، فرش کو اگالدان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ویگن کی کھڑکی سے منہ نکلتا ہے اور پیک کی پچکاری چھوڑی دی جاتی ہے۔ کار کا دروازہ کھلتا ہے اور سڑک لال کردی جاتی ہے یہ کراچی ہے جہاں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پان کے اسٹال کھل گئے ہیں۔ جہاں سے 5 روپے سے 10 روپے تک کا پان مل جائے گا۔ پی آئی ڈی سی ہاؤس کی پان کی دکان ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے لے کر بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور تک سیاست کے بڑے نشیب وفراز دیکھ چکی ہے۔ وی آئی پی شادی کی تقریبات میں پی آئی ڈی سی کے پان جاتے ہیں۔ بوٹ بیسن پر کھانے کے بعد ڈکار لینے کی مہلت نہیں ملے گی کہ ایک بچہ پوچھے گا ''سروی آئی پی پان لے آؤں'' کراچی کے سارے شہری وی آئی پی نہیں بن سکتے البتہ وی آئی پی پان تو کھا سکتے ہیں۔ ہاضمہ کے مسئلہ سے دوچار شہریوں کے لیے ماضی میں انڈین ''لمکا'' ڈرنک منظر عام پر آئی جو پاپولر نہیں ہوسکی۔ کولڈ ڈرنک بدستور پاپولر ہے۔ البتہ اپنے وزن پر نظر رکھنے والے بوتل کا پانی ''منرل واٹر'' پسند کرنے لگے ہیں۔

صبح کے وقت حلوہ پوری کا ناشتہ بھی ہر کلاس میں پسند کیا جاتا ہے۔ حلوائی کی دکانوں پر مزدور تک حلوہ پوری کھاتے نظر آتے ہیں۔ ایک انڈین جرنلسٹ نے پاکستان کے دورہ کے بعد اپنے تاثرات میں لکھا تھا ''پاکستان اور بھارت میں بڑا فرق ہے، بھارتی مزدور کے پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے پاکستانی مزدور حلوہ پوری کھاتا ہے''۔

سیاستدانوں کے اختلافات سے جو جھگڑے جنم لیتے ہیں وہ معاشرے پر دوررس اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس کے باوجود پاکستانی قوم منتشر نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے کلچر کو اپنا رہے ہیں۔ خوراک میں، لباس میں، رہن سہن میں، زبان میں ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی میں ٹھٹہ کی ربڑی، ٹنڈو آدم کی بجی، لاہوری چرغہ، پنجاب کی لسی سب کچھ دستیاب ہے۔

کراچی کے ایک دانشور نے کہا تھا کہ جس روز کراچی والوں نے پلہ مچھلی اور سندھی نے پان کھا کر ایک دوسرے کی ثقافت کو اپنا لیا تھا۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ فوڈ کلچر کی ہم آہنگی لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہے۔ لسانی فسادات کی وجہ سے دلوں میں جو کدورتیں پھوڑ رہی تھیں ان کھانوں کی وجہ سے ختم ہو رہی ہیں۔

وہ معاہدے جو کبھی منظر عام پر نہ آ سکے

پاکستان کی متلاطم سیاسی تاریخ میں جہاں ایسے معاہدے موجود ہیں جو منظر عام پر آئے وہاں ایسے معاہدے بھی ہیں جو بڑے اہم قرار دیئے گئے مگر کبھی ظاہر نہیں ہوئے۔ پاکستان کے دو بار وزیر اعظم بننے والے میاں نواز شریف کس ''معاہدہ'' کے تحت عمر قید کی سزا جلاوطنی میں تبدیل کرا کے اپنے خاندان کے ساتھ سعودی عرب گئے، یہ آج تک ایک راز ہے۔ مخالفین کہتے ہیں نواز شریف نے ڈیل کی جس کے ذریعہ اٹک قلعہ کی تاریکی سے جدہ کے اجالے میں پہنچ گئے۔ حامی کہتے ہیں کوئی ڈیل ہے تو ظاہر کی جائے۔ خود صدر جنرل پرویز مشرف نے یہ کہا کہ نواز شریف دس سال تک واپس نہیں آئیں گے، یہ معاہدے طے کر کے گئے ہیں مگر حکومت نے کبھی یہ ڈیل ظاہر نہیں کی۔ نہ سعودی حکومت نے کی جس کو اس معاملہ میں ضامن قرار دیا گیا۔ جب نواز شریف کے وطن واپسی کے اعلانات اخباروں میں نمایاں ہوتے ہیں فوجی حکومت سعودی سفیر سے رابطہ کرتی ہے تو کچھ عرصہ کے لیے معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاملہ راز ہی رہے گا۔

میاں نواز شریف 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار سے ہٹا کر قید کر دیئے گئے، جب انہوں نے پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے سری لنکا کے دورے سے واپس آنے والے اپنے مقرر کردہ آرمی چیف کو برطرف کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس حکم کے اجراء سے لے کر جنرل پرویز مشرف کا طیارہ کراچی ایئرپورٹ

پر لینڈ کرنے تک اصل میں کیا ہوا یہ بھی راز ہی ہے۔ نواز شریف کے مطابق ان سے بعض دستاویزات پر دستخط کرانے کی کوشش کی گئی جس میں ان کا ملک کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ شامل تھا۔ نواز شریف نے انکار کر دیا پھر جیل میں ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش ہوتی رہیں۔ اب تک قوم کو یہ معلوم نہیں ہے کہ نواز شریف سے فوجی حکام کن کاغذات پر دستخط کرانا چاہتے تھے اس معاملہ میں خود نواز شریف کے دیرینہ حامی تک یہ اعتراف کرتے ہیں کہ نواز شریف کو 1993ء میں جب استعفیٰ نہیں دینا چاہئے تھا تو انہوں نے دے دیا 1999ء میں استعفیٰ دے کر مسلم لیگ کی حکومت کو بچا لینا چاہیے تھا۔ تو ایسا کرنے سے گریز کیا جس سے نہ صرف مسلم لیگ کا اقتدار ختم ہوا خود بھی جلاوطنی میں گئے۔

طیارہ سازش کیس کی سماعت کے دوران جس کی پاداش میں نواز شریف کو عمر قید کی سزا ہوئی انہوں نے یہ تاثر دیا کہ کارگل کے راز پر سے پردہ اٹھائیں گے۔ جب ان کے حتمی بیان کا مرحلہ آیا تو یہ معاملہ سرے سے گول ہی کر گئے اور یہ بتانے پر اکتفا کیا کہ میرے اور جنرل مشرف کے اختلافات کارگل کے مسئلہ سے شروع ہوئے تھے۔ کارگل کا کیا مسئلہ تھا؟ وزیر اعظم کس حد تک باخبر تھا وزیر اعظم کو کیوں اندھیرے میں رکھا گیا تھا یہ اب تک قوم کو نہیں معلوم، نہ قوم مطالبہ کر سکتی ہے کہ اسے حقائق سے آگاہ کیا جائے۔ نہ اس میں اپنا یہ مطالبہ منوانے کی سکت ہے جب نواز شریف وزیر اعظم تھے جنرل پرویز مشرف نے آرمی چیف کی حیثیت سے بی بی سی ٹی وی کو یہ انٹرویو دیا کہ کارگل کے مسئلہ پر فیصلہ میں سب شریک تھے ان کے انگریزی الفاظ تھے "Every one was on board"۔

نواز شریف اور جنرل مشرف کے اختلافات واجپائی کی لاہور یاترا کے دوران ہی شروع ہو گئے تھے مسلح افواج کے سربراہ بھارتی وزیر اعظم کو سلیوٹ کرنے واہگہ نہیں گئے تھے۔ اس سارے کھیل میں کیا درحقیقت ہوا۔ یہ اب تک راز ہی ہے جس نے ایک وزیر اعظم کو جلاوطنی میں بھیج دیا ایک فوجی کو اقتدار دے دیا۔ خود جنرل پرویز مشرف اس معاملہ سے بچ نہ سکے پاکستان کے صدر بن کر وہ بھارتی وزیر اعظم سے امن مذاکرات کرنے آگرہ گئے یہ

مذاکرات آخری لمحوں میں ناکام ہوئے۔ خود اسلام آباد اور نئی دہلی کے مطابق معاہدہ تیار تھا صرف دستخط ہونا باقی تھے۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ معاہدہ کیا تھا۔ کن نکات پر اختلاف تھا۔ فریقین کی طرف سے مختلف قسم کے دعوے حسب روایت کیے گئے ہیں۔

پاکستانی سیاست کا یہ افسوس ناک پہلو ہے کہ اگر کوئی معاہدہ کر کے آجائے تو ڈیل کرنے کا الزام عائد ہوجاتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم شملہ جا کر بھارت سے پاکستانی جنگی قیدیوں اور 5 ہزار مربع میل علاقہ کی بازیابی کا معاہدہ کر کے آئے تو ان کے مخالفین نے کہا کہ شملہ میں کشمیر کا سودا کر دیا گیا۔ یہ الزام عائد کرنے والوں میں کشمیر کمیٹی کے موجودہ چیئرمین سردار عبدالقیوم پیش پیش تھے۔ آج تک یہ راز ہے کہ کشمیر کا کوئی سودا ہوا تھا یا محض بھٹو کے مخالفین کی الزام تراشی تھی۔ خود ذوالفقار علی بھٹو نے جیل سے مکمل کی گئی اپنی کتاب ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا'' میں یہ انکشاف کیا کہ جنرل مجھ سے کچھ دستاویزات پر دستخط کرانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے مخالفین کے مطابق ان میں مبینہ دستاویزات میں سے ایک سقوط مشرقی پاکستان کے بارے میں تھی۔ جس میں بھٹو نے یہ اعتراف کرنا تھا کہ میں سقوط ڈھاکہ اور پاکستان کو دولخت کرنے کا ذمہ دار ہوں۔ بھٹو نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اس وقت جنرل فیض علی چشتی کا نام لیا گیا کہ انہوں نے بھٹو پر تشدد کیا تھا۔ جنرل چشتی کو ایک بار بڑی مصیبت پڑ گئی جب وہ کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے آئے تو وکلاء نے احتجاج کیا اور کہا کہ ذوالفقار علی بھٹو پر تشدد کرنے والے کی تقریر نہیں سنیں گے۔ جنرل چشتی کو جو مرد آہن مشہور تھے مشکل سے شہدائے پنجاب ہال سے نکالا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آنے کے باوجود یہ صحیح پتہ نہیں چل سکا آخر مشرقی پاکستان جنگ کیے بغیر بھارت کے حوالے کیوں کر دیا گیا۔ اتنا عرصہ اس سانحہ کو گزر گیا قوم کیا دلچسپی لے عوام تو اس سانحہ کو فراموش کرنا چاہتے ہیں۔ خود ذوالفقار علی بھٹو جب سیاست میں آئے انہوں نے اپنے محسن ایوب خان پر الزام لگایا کہ تاشقند میں پاکستان کو بھارت کے ہاتھوں

فروخت کر دیا۔ وہ کہتے تھے تاشقند کی بلی تھیلے سے نکالوں گا، یہ بھی کبھی تھیلے سے نہیں نکلی، اس طرح سے یہ محض عوام کو بے وقوف بنانے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی اسکیم تھی۔

ایوب دور کے وزیر خزانہ تھے شعیب احمد ان کے بارے میں امریکی ڈاکومنٹس سے انکشاف ہوا کہ وہ سی آئی اے کے ایجنٹ تھے۔ جب تک پاکستان کے وزیر خزانہ رہے اور ان کے مفادات کے لیے کام کرتے رہے۔ ایم ایم احمد نے بھی یہی کیا۔ ٹاپ پاکستانی بیوروکریٹ امریکہ کی شہریت ضرور لیتے ہیں۔ یہ ایک راز ہے۔ حکومت پاکستان نے قوم کو یہ بتانے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی کہ امریکہ اور یورپ میں متعین پاکستانی ڈپلومیٹس ریٹائرمنٹ کے بعد امریکی اور برطانوی شہریت کیوں لے لیتے ہیں۔ جب یہ پاکستان کا جھنڈا اپنی گاڑیوں پر لگائے قوم کے خون پسینہ کی کمائی سے عیش کر رہے ہوتے ہیں اس وقت ان کا مقصد اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کے بجائے میزبان ملک کی شہریت حاصل کرنا ہوتا ہے۔

غیر ممالک میں پاکستانی سفیر سفارتی نمائندے کیا خدمات انجام دیتے ہیں۔ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لندن میں متعین ہائی کمشنر سفارتی تقریبات میں اپنے بھارتی ہم منصب کو مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کی دعوت دیتے ہیں جس کا تقریبات میں موجود سفارتکار مذاق اڑاتے ہیں۔ میرٹ کا جو قتل عام سفارتی تقرریوں میں ہے کسی اور شعبہ میں نہیں ہوگا۔ ایک پاکستانی بنکر جو مہران بنک اسکینڈل میں ملوث تھے ایک افریقی ملک میں سفیر بنا دیئے گئے بے نظیر بھٹو کے دور میں نواز شریف نے برقرار رکھا جنرل پرویز مشرف نے برقرار رکھا آخر کار اس آدمی کی کیا خوبی ہے جو سب کو بھائی ہے۔ کیا اسٹیبلشمنٹ سے ایسا کوئی معاہدہ طے پا گیا ہے جو بے نظیر حکومت سے مشرف حکومت تک کو فالو کرنا پڑ رہا ہے اس معاہدہ کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

کیا سیاست کی ڈاؤن سائزنگ کا مرحلہ آ پہنچا ہے؟

وفاقی وزیر جاوید ہاشمی نے سوئس بنک اکاؤنٹس کے اسکینڈل کی آڑ میں بے نظیر بھٹو کی سیاست سے ریٹائرمنٹ کا مطالبہ کیا ہے۔ کم و بیش اس قسم کا مطالبہ پارلیمانی سیکریٹری ظفر علی شاہ نے بھی کیا جن کی رائے میں بے نظیر بھٹو کے سیاست میں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے۔ بے نظیر بھٹو کے لیے سیاست سے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ مشکل ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ ''میں فائٹر ہوں میں فائٹ کروں گی'' ان کے اس اعلان سے قطع نظر یہ احساس عوام میں ضرور پایا جاتا ہے کہ پاکستان بہت زیادہ پولیٹیا ئز ملک ہے جہاں درحقیقت سیاست کی انتہا ہوگئی ہے۔ اس لیے کسی نہ کسی سطح پر ڈاؤن سائزنگ کرنا پڑے گی۔ جب زندگی کے ہر شعبہ میں ڈاؤن سائزنگ کی مہم چل نکلی ہے تو اس سے سیاست اور سیاستدان کیوں محفوظ رہیں؟ سیاست میں یہ ایڈوانٹج ہے کہ سیاستدان جب چاہتے ہیں ایکٹیو اور جب چاہتے ہیں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ سابق گورنر ریٹائر ائر مارشل نور خان نے اچانک گوشہ نشینی سے نمودار ہو کر فوج میں 25 سے 30 فیصد تخفیف کی تجویز پیش کی تو اس پر خود سیاستدانوں نے بڑے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاستدان بذاتِ خود گھر بیٹھنے کے تصور ہی سے لرز جاتے ہیں۔ بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان ہوں یا ریٹائر ائر مارشل اصغر خان ولی خان یا پیر پگاڑو، کوئی سیاست کو دل سے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جی ایم سید 90 سال سے تجاوز کر گئے تھے مگر آخری سانس

تک سیاستدان رہے۔ سیاست ان کے نزدیک اوڑھنا بچھونا تھی۔

سیاستدان ریٹائر کیوں نہیں ہوں گے؟ اس سوال پر ایک بزرگ سیاستدان نے اپنی کھانسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "پالیٹکس دراصل کھڑ پینچی کا گیم ہے جب تک یہ گیم چل رہا ہے ہماری روزی چل رہی ہے۔ اس لیے سیاست کو ترک کرنا اپنی روزی پر لات مارنے کے مترادف ہے"۔ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان ایک طرف تو جنرل ضیاء الحق کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور دوسری طرف جی ایچ کیو سے واسطہ رکھنے کے علمبردار پیر پگاڑو کے ذریعہ ان کے صدر سے تعلقات قائم تھے بلکہ ان سائیڈرز کے مطابق میڈیکل کالج کا ایک داخلہ بزرگ سیاستدان کو مرد آہن کے قریب لے آیا تھا۔ اس واسطہ کے بدولت نوابزادہ نصر اللہ کی پارٹی کے سندھ کے صدر مشتاق مرزا کو ریکروٹنگ لائسنس ملا۔ جب بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی تو نوابزادہ نصر اللہ نے کشمیر کمیٹی کے ذریعہ اقتدار کو خوب انجوائے کیا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کی کوششیں ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکیں مگر نوابزادہ نے ساری دنیا کی منت سماجت کرلی۔ ایسے بزرگ کس قدر موثر ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے ایک بار انکشاف کیا کہ ان سے جتنے کام نوابزادہ نصر اللہ اور مولانا فضل الرحمن نے کرائے ہیں خود پی پی کے رہنماؤں نے نہیں کرائے۔ مولانا کے لیے آصف زرداری کا ویکلی ٹائم مقرر تھا۔

تحریک استقلال کے رہبر اصغر خان نے نوابزادہ نصر اللہ خان کی طرح اقتدار میں براہ راست اور بالواسطہ شرکت نہیں کی مگر جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی دنوں میں جب وہ ایران گئے تو ان کی پارٹی کے بہت سے لوگوں نے کہا کہ "ائر مارشل کا انٹرویو ہوگیا" سیاست میں جتنے نشیب و فراز اصغر خان نے دیکھے ہیں شاید ہی کسی نے دیکھے ہوں 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پی این اے کی تحریک میں لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ کراچی کے گلی کوچوں میں راشا راشا اصغر راشا کے نعرے گونجتے تھے۔ ان کا طویل جلوس نکلا تھا پھر دس سال بعد 1987ء میں برنس روڈ پر اصغر خان کا ایک

جلسہ ایسا ہوا جس کے لیے ٹریفک تک نہیں رکی تھی۔ ائر مارشل اپنے چند شاہینوں کو خطاب کر کے چلے گئے۔ کراچی کے سیاسی طور پر سرگرم علاقہ برنس روڈ کے دکانداروں نے اصغر خان کے جلسہ کے لیے بجلی تک دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ تحریک استقلال کے لیڈر پریس ریلیز نہ بھیجیں تو کسی کو اندازہ نہ ہو کہ کسی بھولی بسری سیاسی شخصیت نے کراچی کا دورہ کیا ہے۔

دراصل بزرگ سیاستدانوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اب تک ایوب خان کے دور سے نہیں نکل سکے ہیں۔ کچھ ابھی تک دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش میں پڑے ہوئے ہیں یہ جنگ عظیم کے ان سپاہیوں کی طرح ہیں جو دور دراز جنگلوں میں اب تک دشمن سے برسر پیکار ہیں۔ ان میں سے کچھ ماضی کے کنگ میکر، ہیں جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ دنیا بدل گئی ہے اب اقتدار الیکشن کے ذریعہ ملتا ہے۔ بیک ڈور سے سازشوں کے ذریعہ نہیں ملتا۔ مگر اس نسل کے سیاستدان بدستور سرگرم رہتے ہیں۔ سفارتی تقریبات میں باوردی مہمانوں اور سفارت کاروں کے پاس ہجوم انہی کا ہوتا ہے۔

ماضی کے کنگ میکر یوسف ہارون ایسے سیاستدانوں کے سرغنہ ہیں جن کی نظریں راولپنڈی، اسلام آباد پر رہتی ہیں۔ 82 سالہ یوسف ہارون نے سیاست اور اقتدار کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ "سی فیلڈ" ہارون خاندان کی روایتی رہائش گاہ ہے جس کی دیواریں کراچی کی بدامنی کے باعث اونچی کر دی گئی ہیں۔ یوسف ہارون گزشتہ دنوں بمبئی جا کر اپنے پرانے دوستوں سے ملے۔ ایک طویل عرصہ تک ان کے واشنگٹن سے کراچی اور اسلام آباد پہنچنے پر یہ قیاس آرائیاں ہوتی تھیں کہ وہ کوئی فارمولا لے کر آئے ہیں اب یہ اندازہ کر لیا گیا ہے کہ ان کی آمد و رفت کا کسی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قائد اعظم کے قائم کردہ اخبار پر یوسف ہارون کا اپنے چھوٹے بھائی محمود ہارون سے کافی سنجیدہ تنازعہ چل رہا ہے جس کے تصفیہ کے آثار نہیں ہیں۔ اسی تنازعہ نے ہارون فیملی کے بڑوں اور چھوٹوں دونوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ خود بزرگ سیاستدان مسلم لیگ (فنکشنل) کے سربراہ پیر صاحب

پگارا شریف کی سیاسی حیثیت کو ان کے خاندان کے انتشار سے دھچکا لگا۔ طلاق سے ان کا خاندان تقسیم ہو گیا۔ پیر صاحب جو اپنی پھبتیوں اور جملہ بازیوں سے کسی کو نہیں بخشتے تھے جب اپنی اہلیہ رضیہ بیگم کی طرف سے طنز کا نشانہ بنے تو ان کے لیے بڑی مشکل صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پیر پگاڑو راکٹوں کے حملہ سے متاثرہ کنگری ہاؤس کی تعمیر نو کے بعد نیا جیون ساتھی گھر لا چکے ہیں مگر سیاست میں ان کی وہ پوزیشن ختم ہو گئی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر پیر نے اپنے مرید محمد خان جونیجو کو وزیراعظم بنوا دیا تھا جن کے لیے جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ محمد خان ریلوے کے وزیر رہے ہیں۔ وہ ریل کے ڈبہ کی طرح ہیں جدھر انجن لے جائے گا چلے جائیں گے جب جنرل ضیاء الحق نے جونیجو کو گھر بھیجا تو پیر صاحب نے تبصرہ کیا کہ محمد خان خود کو سچ مچ کا وزیراعظم سمجھنے لگا تھا۔

پیر پگاڑو کی جن کو ان کے مرید احترام سے ''قبلہ سائیں'' کہتے ہیں کنگ میکر کی جو حیثیت مارشل لاء کے دور میں تھی جمہوریت میں نہیں رہی۔ مگر سندھ کی سطح پر ان کے بیٹے پیر صبغت اللہ راشدی جوڑ توڑ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ پیر صبغت اللہ کو ہر دفعہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کا امیدوار قرار دیا گیا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم وفاقی وزیر اور وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ایوب خان کے دور سے سیاست میں ہیں۔ وہ سیاسی طور پر بڑے رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ان کو وزیراعظم بننے کا موقع ملا جو انہوں نے مس کر دیا مرتضیٰ کے اصرار کے باوجود جتوئی نے غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ بھٹو خواتین ملک سے باہر تھیں وہی پاکستان پیپلز پارٹی کے کرتا دھرتا تھے جتوئی نے جمہوری قوتوں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا جس نے مسلم لیگ کو سیاست میں زندہ کر دیا۔ جتوئی کے الفاظ میں اگر میں غیر جماعتی الیکشن میں حصہ لے لیتا تو ملک کی سیاست آج کچھ اور ہوتی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نیشنل پیپلز پارٹی کے سربراہ ہیں۔ سینٹ قومی اسمبلی اور سندھ اسمبلی تینوں کی نشستیں ان کے گھر میں ہیں مگر خود جتوئی عملی طور پر اتنے فعال نہیں ہیں۔ ان کی نئی جنریشن سیاست میں آگے آ رہی ہے۔ سردار شیر باز مزاری

اپنی نسل کو سیاست میں اس طرح نہیں لا سکے بلکہ ان کو سیاستدانوں سے چڑ ہوگئی ہے۔ سیاست میں جو منافقت اور مکاری ہے سردار شیر باز مزاری اس سے دور رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ولی خان کی اسیری کے دوران این ڈی پی کو زندہ رکھنے والے اور ایم آر ڈی کی پاکستان بچاؤ کمیٹی کے کنوینز تقریباً گوشہ نشین ہوگئے ہیں۔ کم و بیش یہی کیفیت جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد کی ہے جو پی این اے کی تحریک میں سردار مزاری کے ساتھی تھے۔ پروفیسر غفور احمد کو ان کے مخالفین تک احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کئی مراحل پر انہوں نے جماعت اسلامی کے موقف سے ہٹ کر نقطہ نظر اختیار کیا۔

جنرل ضیاء کے ریفرنڈم میں پروفیسر غفور احمد چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے اور ووٹ ڈالنے نہیں گئے۔ جماعت اسلامی کو میاں طفیل کی امارت میں بے پناہ سیاسی نقصان پہنچا۔ عام آدمی اب تک اس جماعت کو مارشل لاء کا مخالف اور جمہوریت کا حامی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی بیگم نصرت بھٹو کی ریٹائرمنٹ کی عمر ہے۔ بیگم بھٹو انتہائی مظلوم خاتون ہیں شوہر کی پھانسی کے بعد دونوں بیٹوں کی جدائی کوئی ماں برداشت نہیں کر سکتی۔ بیگم نصرت بھٹو کو پہلے ان کی بیٹی بے نظیر نے ان کو پی پی پی کی قیادت سے ہٹا کر صدمہ پہنچایا پھر ان کی بہو غنویٰ نے لاڑکانہ سے ان کے خلاف الیکشن لڑا۔ بے نظیر بھٹو کو سیاست کا زیادہ تجربہ ہے مرتضیٰ بھٹو کی موت کے بعد بیگم بھٹو بے نظیر کے ساتھ ہیں۔ فاطمہ اور ذوالفقار ان کی شکل دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو 1988ء سے قومی اسمبلی کی ممبر ہیں ان کو ہرانا ناممکن ہے۔ لاڑکانہ اور لیاری سے وہ جب بھی کھڑی ہوں گی جیتیں گی مگر اتنے سیاسی اور غیر سیاسی صدموں کے بعد ان کے آرام کا وقت ہے۔ لاڑکانہ میں ایک بار اپنے انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ میں بڑی بدنصیب عورت ہوں۔ شوہر کو پھانسی ہوئی۔ بیٹے جدا ہوگئے، دامادوں پر قتل کے مقدمات ہیں۔ اب میرے پیچھے غنویٰ کو لگا دیا گیا ہے، جب ان سے ان کی یادداشتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو ایک وزیر اعظم کی

اہلیہ اور ایک وزیر اعظم کی ماں رہنے والی خاتون نے کہا "کیا یاد رکھوں میں تو اپنی زندگی کو بھلانا چاہتی ہوں"۔ بیگم نصرت بھٹو جن کا سوئس اکاؤنٹ بے نظیر اور آصف کے ساتھ ہی منجمد کر دیا ہے اب بے نظیر کے بچوں کے ساتھ دبئی میں ہیں۔

بے نظیر کے خسر حاکم علی زرداری کا سیاست سے ریٹائرمنٹ کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا حاکم علی اور آصف علی دونوں نے 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن میں حصہ لیا جس کا بے نظیر بھٹو نے بائیکاٹ کیا تھا۔ حاکم علی زرداری کو اپنے بیٹے کی فکر ہے جو ان کے نزدیک اپنی سیاستدان بیوی کی بدولت سیاست میں گھسیٹ لیا گیا۔ مخالفین کے مطابق زرداری فیملی اسلام آباد سے مفاہمت کے لیے کسی اچھی آفر کی منتظر ہے۔ زرداریوں کو ناپسند کرنے والوں میں بے نظیر کے انکل ممتاز علی بھٹو شامل ہیں۔ ممتاز علی بھٹو کو جو ذوالفقار علی بھٹو کے ٹیلنٹڈ کزن تھے بے نظیر نے اپنی جلا وطنی سے واپسی پر شیخ رشید حفیظ پیرزادہ غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ آؤٹ کر دیا تھا ممتاز بھٹو سندھ میں قوم پرستوں کے اتحاد اور محاذ بنانے کے ماہر ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات سے لے کر 1997ء کے مسلم لیگ انتخابات تک پاکستان کو سیاستدانوں کی ایک نئی نسل مل چکی ہے۔ بے نظیر بھٹو، نواز شریف، شیخ رشید، لیاقت جتوئی، فاروق ستار، آفتاب شیر پاؤ، ذوالفقار مگسی، شہباز شریف، اختر مینگل سمیت بے شمار سیاست دان پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ سیاستدانوں کی صحیح معنوں میں یہ پاکستانی جنریشن ہے اس جنریشن کی کامیابی ضروری ہے مگر کیا اکبر بگٹی، شیر باز مزاری، یوسف ہارون، محمود ہارون، اصغر خان، پروفیسر غفور احمد، پیر پگاڑو، غلام مصطفیٰ جتوئی کا دور ختم ہو گیا ہے۔ سیاست دان کبھی ریٹائر نہیں ہوتا اس لئے ہمیشہ کارآمد رہتا ہے۔ جنرل ضیاالحق کے حادثہ کے روز کراچی ائرپورٹ پر محمود ہارون سے ان کے ایک عزیز نے پوچھا **Party is over** انہوں نے جواب دیا **No. I Don't Thing so**

کہنہ مشق جہاں دیدہ اور گھاگ سیاستدانوں کے لئے پارٹی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ حکمرانوں کو ضرورت ہوتی ہے تو ایسے لوگوں کو بستر مرگ سے اٹھا لاتی ہے کہ مرحوم صدیق سالک نے ایک واقعہ سنایا کہ جب جنرل ضیاء الحق نے جنرل موسیٰ کو کوئی ذمہ داری سونپنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا "سر وہ نہ صحیح سن سکتے ہیں، نہ صحیح بات کر سکتے ہیں، نہ صحیح چل سکتے ہیں۔" جنرل ضیاء الحق یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ اگلے روز جنرل موسیٰ کو گورنر بلوچستان مقرر کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

کراچی کے سیاستدان!

کون کہاں اور کیسے رہتا ہے؟

پیر صاحب پگاڑا پاکستان کے ہنگامہ خیز شہر کراچی کے واحد باشندہ ہیں جن کی رہائش گاہ کنگری ہاؤس کو راکٹوں کے حملہ کا نشانہ بنایا گیا۔ کارساز روڈ پر کراچی کی اولین ہاؤسنگ اسکیم میں واقع اسی قلعہ نما گھر کی مرمت اور تعمیر کی گئی ہے جس پر پیر صاحب پگاڑا نے ایک تقریب منعقد کی تھی۔ اپنے خاندانی تنازعہ کی بدولت پیر صاحب کا زیادہ تر قیام لاہور اور اسلام آباد میں رہا ہے مگر جب وہ کراچی میں ہوتے ہیں کنگری ہاؤس میں بڑی رونق رہتی ہے جس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی نوادرات رکھے گئے ہیں۔ دیواروں پر پاکستان کے تقریباً تمام سیاستدانوں کے پورٹریٹس آویزاں ہیں جن میں سے بیشتر پورٹریٹس خود پیر صاحب نے کھینچے تھے۔ باخبر رہنا پیر صاحب کا مشغلہ ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے گھر پہ ڈش لگوائی۔ ایک طویل عرصہ تک کراچی میں امریکی قونصل خانہ اور کنگری ہاؤس پر ڈش نصب تھی۔ پیر صاحب پگارو اچھے کھانوں کے رسیا ہیں۔ خود بھی بہترین کھانا پکاتے ہیں۔ کڑاہی گوشت اور کریلے قیمہ ان کی پسندیدہ ڈشیں ہیں۔ پیر صاحب آئس کریم کے بڑے شوقین ہیں۔ اپنے مہمانوں کی تواضع آئس کریم سے کرتے ہیں۔ چار ہزار مربع گز پر مشتمل کنگری ہاؤس میں بیک وقت ایک ہزار مہمانوں کی گنجائش ہے۔ جب پیر صاحب کے بیٹے ان کے ساتھ رہتے تھے کنگری ہاؤس کے دو پورشن

تھے۔ بیٹوں کے علیحدہ ہونے کے بعد کنگری ہاؤس میں پارٹیشن ختم کر دیا گیا ہے۔ پیر صاحب پگاڑا اسکیم نمبر 1 کے ابتدائی باسیوں میں سے ہیں جن سے ایک واٹر پمپ موسوم کیا گیا ہے۔ پیر صاحب پگاڑا اپنے مہمانوں کے معاملے میں بڑے محتاط واقع ہوئے ہیں۔ بن بلائے مہمان کو ریسیو کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اپنے ایک لنچ میں پیر صاحب دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ جس کو نہیں بلایا وہ داخل نہیں ہوگا۔ کراچی کے اخبار نویسوں کے ایک گروپ نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے پیر صاحب کے بائیکاٹ کا اعلان کیا مگر بعد میں سب اس پر رضا مند ہو گئے کہ کسی کو بلانا نہ بلانا پیر صاحب کا استحقاق ہے پیر صاحب پگاڑا نے اپنے گھر میں ایک چکی کا انتظام کر رکھا ہے جس کی مدد سے وہ تازہ آٹا استعمال کرتے ہیں۔ برانکائٹس کے پرانے مریض ہونے کے باوجود پیر صاحب سگار نہیں چھوڑتے اپنے دوستوں کو بلانے پر ان سے خبریں سنتے ہیں۔ صرف ایک اخبار کا خود مطالعہ کرتے ہیں، باقی اخبارات کی خبریں سنتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے مخالفین میں پیر صاحب کا شمار ہوتا ہے جن کو انہوں نے اب تک معاف نہیں کیا ہے۔ بھٹو کیس کے دوران پیر صاحب نے اپنے ان ریمارکس سے ان کی پھانسی کی حمایت کی ''بھیڑیئے کو پھانسی لگنے پر بھیڑیں سکون کا سانس لیں گی''۔ پیر پگاڑو نے جن کی سیاسی اور غیر سیاسی قوت کو ذوالفقار علی بھٹو نے چیلنج کیا اپنے مخالف کو کبھی معاف نہیں کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں جی ایچ کیو سے تعلق داری پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان کی سیاست اور اس کا انداز بدل گیا مگر پیر صاحب کا انداز نہیں بدلا ہے۔

70 کلفٹن اور 71 کلفٹن میں واقع ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہی پراسراریت، 70 کلفٹن نے پاکستان کی سیاست کے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ یہاں حکومتیں بنی ہیں اور بگڑی ہیں۔ کبھی قلاش جیالے لکھ پتی بن کر نکلے ہیں تو کبھی لکھ پتی بمشکل جان بچا کر نکلے ہیں۔ 20 ستمبر 1996ء کے بعد سے اس تاریخی گھر میں رینجرز کے مورچے قائم ہیں۔ رینجرز کے جوان ہر آنے جانے

والے اور شاہراہ ایران سے گزرنے والے پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ یہ بھٹو خاندان کی بدقسمتی ہے کہ اس گھر میں رہنے والا کوئی مرد زندہ نہیں بچا۔ ذوالفقار علی بھٹو، شاہنواز بھٹو، مرتضیٰ بھٹو ایک ایک کر کے غیر فطری موت کا شکار ہو کر چل بسے۔ اسی گھر میں بارات لے کر آنے والے دامادوں ناصر حسین اور آصف علی زرداری پر قتل کے مقدمات بنے۔ یہ شاید تاریخ کا انتقام ہے۔ 70 کلفٹن پر ذوالفقار علی بھٹو کی تختی اب تک آویزاں ہے۔ دیواروں پر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کے پورٹریٹس لگے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں سیاہ پرچموں کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ 70 کلفٹن کے لان پر مرتضیٰ بھٹو کی میت کو غسل دیا گیا جب ان کے زرد پاؤں دیکھ کر کئی کارکن بے ہوش ہوگئے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو جن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ہذیانی کیفیت میں مرتضیٰ، مرتضیٰ پکار رہی تھیں۔ وہ اب تک مرتضیٰ کی موت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مرتضیٰ بھٹو 70 کلفٹن میں اپنے لیے علیحدہ اسٹڈی بنوا رہے تھے جس کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی۔ بھٹو فیملی کے روایتی آشیانہ میں بے نظیر بھٹو کے پورٹریٹس اس وقت بھی لگے رہے جب مرتضیٰ نے اپنی برسر اقتدار بہن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اپنی ساری چیزیں 70 کلفٹن سے لے جاؤ، اب تمہارا اس گھر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ شاید مرتضیٰ کی بات صحیح تھی۔ بے نظر بھٹو اپنے دور اقتدار میں صرف ایک بار 70 کلفٹن آئیں۔ ان کی سرکاری کار کھڑی رہی جو بیگم نصرت بھٹو کو لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ کا مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ سے سارا تعلق ختم ہوگیا۔

70 کلفٹن میں ایک راہداری سے گزر کر مہمان ڈرائنگ روم تک پہنچتا ہے جس کی دیواروں پر ذوالفقار علی بھٹو کی تصویریں بدستور لگی ہوئی ہیں۔ 71 کلفٹن میں مین گیٹ سے ملحق دیوار پر بھٹو خاندان کا شجرہ آویزاں رہتا ہے۔ کانفرنس روم میں ذوالفقار علی بھٹو کی شملہ سمجھوتہ پر اندرا گاندھی کے ساتھ دستخط کرتے ہوئے پینٹنگ لگی ہے جس میں حفیظ پیرزادہ غلام مصطفیٰ جتوئی، عزیز احمد اور رفیع رضا نمایاں ہیں۔ ذوالفقار سے لے کر مرتضیٰ تک بھٹو خاندان کے مردوں کو کتابوں کا بڑا شوق رہا ہے جو بڑی لائبریری سے ظاہر ہے۔

کراچی میں جتنی بڑی لائبریری سردار شیر باز مزاری کی ہے کسی سیاستدان کی نہیں ہوگی۔ سردار شیر باز مزاری سیاست میں اتنے رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں کہ ان کو لکھنؤ کا بلوچ نہ کہا جائے تو زیادتی ہوگی۔ مزاری ہاؤس کی لائبریری کے ساتھ اس کے وسیع و عریض خوبصورت لان کی بڑی شہرت ہے جو لانوں کے مقابلہ میں کئی انعامات لے چکا ہے۔ ڈیفنس میں مزاری ہاؤس کے بالمقابل بجارانی ہاؤس ہے جو میر ہزار خان بجارانی کا مسکن ہے۔ ان کے قریب پیار علی الانا اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے گھر ہیں جو مین ڈیفنس بلیوارڈ ہیں۔ ڈیفنس کے مکینوں میں مہاجر رابطہ کونسل کے صدر نصرت مرزا شامل ہیں جن کے گھر پر مسلح افراد پہرہ دیتے ہیں۔ خیابان شمشیر پر جتوئی خاندان کے گھر قطار میں ہیں۔ بڑے بھائی غلام مصطفیٰ جتوئی کا گھر سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی سجاوٹ ان کی اہلیہ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر کلاسیکل پینٹنگز آویزاں نظر آتی ہیں۔ جتوئی ہاؤس سے سمندر کی طرف کمال اظفر اور ممتاز علی بھٹو ہمسائے ہیں۔ کمال اظفر کے گھر میں ان کا دفتر بھی قائم ہے۔ گھر اور دفتر کی ساری آرائش بیگم ناہید کمال اظفر کی کوششوں کی بدولت ہے۔

ممتاز بھٹو کے قلعہ نما گھر پر مسلح چوکیدار متعین رہتے ہیں۔ تربیت یافتہ کتا 24 گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ ممتاز بھٹو کے گھر میں سندھ کا نقشہ لگا رہتا ہے۔ ممتاز بھٹو سندھ کے بارے میں اعداد و شمار اپنے کمپیوٹر میں جمع کرتے رہتے ہیں۔

30 ڈی کہکشاں کلفٹن بلاول ہاؤس ہے۔ ساحل سمندر سے چند سو گز کے فاصلہ پر یہ گھر بے نظیر بھٹو نے خود اپنی نگرانی میں تیار کرایا۔ وہ ہر روز 70 کلفٹن سے جا کر اس گھر کی تعمیر کا جائزہ لیتی تھیں جس کو بلاول ہاؤس کا نام کراچی کے اخبار نویسوں نے دیا۔ بلاول ہاؤس پر پولیس کا پہرہ برقرار رہتا ہے۔ مہمان بیک ڈور سے اور میزبان فرنٹ ڈور سے داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد بلاول ہاؤس پر ملازمت اور پلاٹ کے درخواست گزاروں کے ہجوم نظر نہیں آتے۔ زیادہ دولت مند جیالے پجیرو اور کم دولت مند سوزوکی گاڑیوں میں بلاول ہاؤس کی پارکنگ میں نظر آتے

ہیں۔

کراچی میں جس سیاستدان کے گھر پر اس کی عدم موجودگی کے باوجود بے پناہ رش رہتا ہے۔ عزیز آباد میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کا گھر ''نائن زیرو'' ہے۔ نائن زیرو پر جتنے چھاپے مارے گئے کسی سیاستدان کے گھر نہیں مارے گئے ہوں گے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق نائن زیرو پر چھاپوں کی سنچری مکمل ہو چکی ہو گی۔ 120 مربع گز پر عزیز آباد کی تنگ گلی قائد ایونیو میں اسی گھر نے سندھ کی سیاست کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ ایم کیو ایم کے موجودہ اور سابق مخالفین کی پوری کوششوں کے باوجود الطاف حسین کا گراف کم نہیں ہوا ہے۔ گھر کے در و دیوار پر الطاف حسین کے پورٹریٹس لگے ہوئے ہیں۔

پروفیسر غفور کے گھر پر ڈاکے پڑ چکے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ فیڈرل بی ایریا میں ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی رہائش گاہ ڈاکوؤں سے محفوظ رہی ہے۔ وہ واحد سیاستدان ہیں جو کرائے کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ کرائے کے فلیٹ سے اتر کر سواری کے لیے رکشہ کا انتظار کرتے ہیں۔ نورانی صاحب کی سیاست کا یہی اوڑھنا بچھونا ہے۔

اب نورانی میاں صدر سے کلفٹن منتقل ہو چکے ہیں۔ اپنے گھر کی چھت سے ان کو اپنی والدہ کی قبر نظر آتی ہے۔

اتحادوں کی سیاست

نظریہ ضرورت مخالفین کو اکٹھے بیٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے

سیاسی اتحادوں کی ایک نئی کہانی شروع ہو رہی ہے۔ حکومت کے مخالفین اپنے سیاسی نظریاتی اور مذہبی اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک نکتہ ''نواز ہٹاؤ...... ملک بچاؤ'' پر متحد ہو رہے ہیں۔ حکومت کے حامی کہتے ہیں کہ جب بھی سیاستدان متحد ہوئے ہیں ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ جمہوریت پیچھے چلی گئی ہے۔ مخالف کہتے ہیں کہ ایک خاندان کی حکومت سے ملک کو نقصان ہو رہا ہے۔ حکومت کے مخالف سیاستدانوں کی سرگرمیوں کا محور کراچی لاہور اور اسلام آباد ہیں۔ پاکستان عوامی اتحاد گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس میں بدل دیا گیا ہے۔ پی این اے اور ایم آر ڈی کے بعد عوام کسی اتحاد سے صحیح معنوں میں مانوس نہیں ہوئے ہیں۔ اس وقت سیاسی جماعتوں میں مسلم لیگ پیپلز پارٹی ایم کیو ایم این پی ڈی پی سے ہی واقف ہیں۔ پیر پگاڑو، مولانا شاہ احمد نورانی، ولی خان، اکبر بگٹی، اصغر خان سیاسی اتحادوں سے دور ہیں۔ سردار شیر باز مزاری تو سیاست کو غلیظ قرار دے کر ترک کر چکے ہیں۔ ملک میں سیاسی اتحاد بنانے کے ماہر بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان ہیں۔ یہ حکومت کو خواہ جمہوری ہو یا غیر جمہوری گرانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کو ''بابائے مذاکرات'' کہا جاتا ہے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ عام طور پر گفتگو ایوب خان کے دور سے شروع کرتے ہیں۔ پی این اے کے لیڈر کی حیثیت سے وہ اس

وقت ممتاز ہوئے۔ جب لاہور میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلی۔ اصغر خان نے جیل سے یہ منظر دیکھا۔ طاقتور حکمران بھٹو کا بستر گول کر دیا گیا۔ نوابزادہ نصر اللہ کی سیاسی غلطی جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں شمولیت تھی۔ ان کی پارٹی جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ پاور شیئرنگ میں پارٹنر بن گئی۔ مگر اس سے ان کی ساکھ بہت متاثر ہوئی۔ پی ڈی پی کے قائد سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی وزارت لینے پر آج تک پچھتاتے ہیں۔ پی این اے سردار مزاری کے الفاظ میں پاکستان کے عوام سے غداری کی بدولت ٹوٹ گیا عوام بددل ہوگئے۔ اس تحریک میں عوام نے خود حصہ لیا۔ یہ وہ تحریک تھی جس کی قیادت عوام کے ہاتھوں میں تھی عوام پہلی بار باریش لیڈروں کو سن رہے تھے ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ کلین شیو اور مغربی سوٹ پہننے والے ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلہ میں ان کو مفتی محمود نصر اللہ شاہ احمد نورانی، پیر پگاڑو پسند تھے۔ کراچی میں زاشا زاشا اصغر راشا کے نعرہ کی گونج صبح سے شام تک سنائی دیتی تھی۔ اصغر خان کی مقبولیت آسمان پر تھی۔ کراچی میں ان کا تاریخی جلوس نکالا۔ لاکھوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ برنس روڈ پر ان کی تقریر کے دوران ''پن ڈراپ سائلنس'' تھی۔ کراچی نے دس سال بعد یہ منظر دیکھا کہ برنس روڈ پر ہی اصغر خان کا جلسہ ہو رہا ہے۔ ٹریفک چل رہی ہے دکانیں کھلی ہیں اور شرکاء کی تعداد بیس سے کم ہے۔ سیاست کبھی رخ بدلتی ہے تو سیاستدان پریشان ہو جاتے ہیں۔ اصغر خان اب تک یہی حساب لگا رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ایک الیکشن میں شکست کے بعد انہوں نے کہا لوگ جاہل ہیں، ہمارا منشور پڑھ لیتے تو ہم جیت جاتے۔

پی این اے کی تحریک جمعیت علمائے پاکستان اور پیر پگاڑو کے لیے نظام مصطفیٰ کی تحریک تھی۔ اے این پی این ڈی پی، کے لیے اور دانشوروں کے لیے جمہوریت کی تحریک تھی۔ بھٹو کی آمریت سے نجات کی تحریک تھی۔ اس تحریک میں ملک میں ڈالروں کا سیلاب آ گیا۔ امریکی سفیر پاکستان کی سیاست میں مداخلت کر رہا تھا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو امریکی سفارت کار کی گفتگو سن کر احتجاج کر رہے تھے۔

"Party is not over" مگر پارٹی اوور ہو چکی تھی۔ اسلام آباد کی ایک سفارتی تقریب میں جنرل ضیاء الحق اپنے وزیراعظم کے جانے کے بعد آئے۔ بھٹو نے امریکہ کو سفید ہاتھی کہا۔ وہی ان کی حکومت کو روندتا ہوا چلا گیا۔ اب ماضی کی پی این اے کے قائدین جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔

سردار شیر باز مزاری نے اپنی کتاب میں کئی بزرگوں کے بارے میں انکشاف کیا ہے جو رقم لینے کے لیے تیار تھے کسی کے دام کم تھے کسی کے زیادہ تھے۔ دام سب کے لگے ہوئے تھے۔ پی این اے کی تحریک کامیاب ہوئی مگر جمہوریت ناکام ہوگئی۔ اس تحریک نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار "دوطرفہ تشدد" کا مظاہرہ دیکھا۔ ایک طرف بھٹو کی پولیس اور ایف ایس ایف بے رحمی دکھا رہی تھی۔ دوسری طرف پی این اے کے کارکن اپنے مخالفین کے ساتھ سفاکی کے مظاہرے کر رہے تھے۔ لیاقت آباد میں پیپلز پارٹی کے ایک رہنما کو الٹا لٹکا کر زندہ جلا دیا گیا۔ اس کے خاندان تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ گھر جلانا، دکان جلانا، انسان کو جلانا ایجی ٹیشن کا حصہ بن گیا۔ قوم نے اس وحشیانہ طرزِ عمل کو پسند کیا۔ اس کی سزا معاشرہ آج تک بھگت رہا ہے۔ گھیراؤ جلاؤ اب اپوزیشن کی سیاست کا بڑا ہتھیار ہے۔ رواداری ختم ہوگئی ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معاہدہ طے پانے کے باوجود بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اگرچہ یہ اقدام غلط لگا مگر عوام بہرحال خوش تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے عام آدمی کی طرح آلو پیاز کے بھاؤ سے بات شروع کی۔ 90 روز میں الیکشن کا وعدہ کیا پھر اس وعدہ سے مکر گئے۔ سیاستدان جو آزاد تھے ان کے ساتھ تھے۔ پیپلز پارٹی کی لیڈرشپ جیل میں تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوگئی۔ بھٹو پر جان چھڑکنے کا عہد کرنے والے ہنی مون منانے میں مصروف رہے۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت غیر مقبول ہوگئی تھی۔ اس دوران سوویت یونین نے افغانستان میں فوج بھیج دی۔ اس نے مغربی دنیا کو جنرل ضیاء الحق کی شکل میں واحد سہارا مہیا کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق اتنے مضبوط ہو گئے کہ

امریکی امداد کو ''مونگ پھلی'' اور پاکستانی سیاستدانوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ موقع پرست سیاستدان اس لقب پر برہم نہیں ہوئے مگر کئی جمہوریت پسندوں نے سوچا کہ جنرل ضیاء کو ہٹانے کے لیے متحد ہونا پڑے گا۔

جنرل ضیاء الحق کو بندوقوں کے سائے میں **1985**ء کے غیر جماعتی انتخابات کرانے پڑے۔ ووٹ پڑے مگر اس جمہوریت کو دنیا تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو کا واشنگٹن میں ''بائیوڈیٹا'' تقسیم ہوا جس میں ان کو ''کاشتکار'' کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ بے نظیر بھٹو اسی دور میں جلاوطنی سے واپس ایک طوفان کی طرح آئیں، ان کے اتحادی اس طوفان میں تنکے کی طرح بہہ گئے۔ بے نظیر بھٹو نے موسم خزاں میں الیکشن کا نعرہ لگا کر سولو فلائٹ شروع کی تو جلد ہی کریش لینڈنگ ہوگئی۔ ہر طرف مایوسی کی فضا تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے وزیراعظم کو پر پرزے نکالنے پر نکال دیا اور اپنی کمزوری کا سامان پیدا کردیا۔ اسلام آباد سے ایک آدھ بار باہر نکلنے والے جنرل کا طیارہ بہاولپور کی فضا میں پھٹ گیا۔ امریکہ افغانستان مسئلہ پر یوٹرن لے چکا تھا۔ لیکن جنرل ضیاء الحق تیار نہیں تھے۔ اس اختلاف نے جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ دور کردی۔ **1988**ء کے انتخابات ہوئے تو بے نظیر بھٹو نے ایم آر ڈی کے ساتھیوں کو جن نشستوں کی آفر کی ان کے بارے میں معراج محمد خان نے کہا ہمیں ایم کیو ایم کے ہاتھوں ذبح کرنے کے لیے لیاقت آباد سے ٹکٹ دیا جارہا ہے۔ ناکام ہونے والے فتحیاب علی خان ایم آر ڈی کے واحد متفقہ امیدوار تھے۔ پی این اے **1977**ء کے انتخابات سے منتشر نہیں ہوا تھا۔ ایم آر ڈی **1988**ء کے انتخابات سے بکھر گئی۔ بے نظیر بھٹو نے پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ بھٹو کی پھانسی کا قرض اتارا جا چکا تھا۔ راولپنڈی، اسلام آباد، واشنگٹن دہلی ریاض سب مطمئن تھے۔

اس حکومت کے دوران آئی جے آئی کا اتحاد بنا جس کے لیے مبینہ طور پر فنڈز آئی ایس آئی نے مہیا کیے۔ جنرل اسلم بیگ کا اعتراف اور اصغر خان کا مقدمہ قوم کے

سامنے ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ نے حکومت کے خلاف مخالف سیاستدانوں کو متحد کیا اور ان کی سرگرمیوں کے لیے فنڈ فراہم کیے۔ غلام مصطفیٰ کھر کی مہربانی کی بدولت غلام مصطفیٰ جتوئی نواب شاہ سے ہار کر کوٹ ادو سے جیت گئے۔ سندھی وزیر اعظم کے مقابلے میں اپوزیشن کا لیڈر سندھی تھا۔ پارلیمنٹ میں کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز (سی او پی) وجود میں آ گئی۔ کراچی کی تاریخی شاہراہ قائدین پر جلسہ ہوا تو جتوئی نواز شریف اکبر بگٹی ولی خان الطاف حسین سب ساتھ بیٹھے تھے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہو گئی نواز شریف وزیر اعظم بن گئے۔ بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے رخصتی کے ساتھ ہی آئی جے آئی عملی طور پر رخصت ہو گیا۔ بے نظیر بھٹو سیاست میں آسانی سے ہار ماننے والی نہیں ہیں۔ پی ڈی اے (پاکستان ڈیموکریٹک الائنس) بنا کر اور اپنے کارڈ صحیح کھیل کر نواز شریف کو میعاد پوری کیے بغیر گھر بھیج دیا۔ ایک انٹرویو میں بے نظیر بھٹو نے انکشاف کیا ''میں نے مارگریٹ تھیچر سے پوچھا غلام اسحاق اور نواز شریف کا کیا کروں'' انہوں نے کہا دونوں کو ڈمپ کر دو۔ میں نے وہی کیا۔ ''گو بابا گو'' کا نعرہ لگانے والی بی بی (بے نظیر) نے میاں (نواز شریف) کا عین وقت پر ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

بے نظیر بھٹو کو پھر حکومت مل گئی مگر سارے کھیل میں نواز شریف کی مسلم لیگ ایک بڑی سیاسی قوت بن گئی جس کے ارکان نے فلور کراسنگ نہیں کی اور عرصہ بعد سیاسی کردار کا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ نے تحریک نجات چلائی۔ مسلم لیگ کی خواتین ریل کی پٹریوں پر لیٹ گئیں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کسی تحریک کے بغیر صدر فاروق لغاری نے کرپشن کے الزام میں برطرف کر دی۔ **1997**ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو بڑی کامیابی ملی۔ اپوزیشن کے پی ڈی اے کا صفایا ہو گیا۔ اپوزیشن کے اتحاد نے نواز ہٹاؤ ایجنڈا کا اعلان کر دیا ہے۔ کراچی **1997**ء کے بعد **1999**ء میں پہلی بار اپوزیشن کا شہر بن گیا ہے۔ اپوزیشن کے یوم احتجاج پر سینکڑوں گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ جیل بھرو تحریک خود پولیس چلا رہی ہے۔

اپوزیشن کی لیڈر پی پی پی کی بے نظیر بھٹو واشنگٹن ایم کیو ایم کے الطاف حسین

لندن تحریک انصاف کے عمران خان واشنگٹن لندن کے چکر لگا رہے ہیں۔ نوابزادہ نصراللہ حامد ناصر چٹھہ، اسفند یار ولی، طاہر القادری، حسین حقانی، فاروق ستار، آفتاب شیخ، نسرین جلیل، ناہید خان، نثار کھوڑو، قائم علی شاہ، ملک میں تحریک چلا رہے ہیں۔ ایک نیا اتحاد بن چکا ہے۔ نئی تحریک چل رہی ہے۔ لیڈر شپ باہر ہے۔ تحریک اندر ہے، کیا کوئی خفیہ ہاتھ سرگرم ہے؟ کیا اسٹیبلشمنٹ پھر اپنا گیم کھیل رہی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اتحادوں کی سیاست پروان نہیں چڑھ سکتی۔

باپ بیٹے کی سیاست

پاکستان کے دو بیٹے اپنے اپنے والد کے دفاع کی مہم پر ہیں۔ ایک کے والد پاکستان کے چیف ایگزیکٹو بنے ہیں ایک کے والد چیف ایگزیکٹو کے عہدہ سے برطرف کیے گئے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے صاحبزادہ بلال مشرف انٹرنیٹ کے ذریعہ اپنے والد کے مشن کا دفاع کر رہے ہیں جبکہ برطرف وزیر اعظم نواز شریف کے بیٹے حسن نواز لندن سے اپنے زیر حراست والد کے تحفظ کی کوشش کر رہے ہیں۔ دونوں بیٹوں کا ''کام'' مشکل نظر آ رہا ہے مگر باپ سیاسی ہو یا غیر سیاسی، ایک سعادت مند بیٹے کا یہی فرض بنتا ہے۔ بلال اور حسن دونوں کے لیے موجودہ کردار غیر متوقع ہیں شاید دونوں کو اندازہ نہیں ہوگا کہ حالات اتنی جلدی بدل جائیں گے لیکن ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سیاست میں باپ بیٹے کا یہ کردار نیا نہیں ہے۔ پاکستان کی ہنگامہ خیز سیاسی تاریخ میں جو بیٹا منظر عام پر سب سے پہلے آیا وہ ایوب خان کے صاحبزادے گوہر ایوب تھے۔ یہ بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور الطاف حسین کے سکول کے زمانے کی بات ہے جب گوہر ایوب نے فاطمہ جناح کے خلاف ایوب خاں کی متنازعہ فتح کی خوشی میں کراچی کے گڑبڑ والے علاقہ لیاقت آباد سے ایک جلوس نکالا اس جلوس پر فائرنگ کی گئی جس کی وجہ سے کراچی کے شہریوں میں اشتعال پھیل گیا اس شہر کے لوگ یہ واقعہ اب تک فراموش نہیں کر سکے ہیں جس کو پاکستان میں لسانی سیاست کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ مخالفین گوہر ایوب کا یہ جرم ابھی تک معاف کرنے کو تیار

نہیں ہیں۔

جب عوامی تحریک کے بعد ایوب خان اقتدار سے نکالے گئے تو ان کے بیٹے ان کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ وہ ان کے بچے کھچے حامیوں کی طرح خاموش تماشائی بنے رہے۔ ایوب خان کے بعد یحییٰ خان آئے جن کو پاکستان کے ٹوٹنے کے بعد ذلیل ہو کر اقتدار سے نکلنا پڑا۔ اب اس سانحہ کے 29 سال بعد ان کے بیٹے علی یحییٰ اپنے والد کے دفاع کے لیے نکلے ہیں۔ جن کا موقف یہ ہے کہ میرے والد کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ان کو سیاسی ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ اب وہ کچھ بھی ہیں تاریخ اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ تاریخ کا فیصلہ بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ سیاست کے طالب علم سے لے کر استاد تک اس سے واقف ہیں۔

یحییٰ خان کے بعد پاکستان کا اقتدار مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی شکل میں ذوالفقار علی بھٹو کو ملا۔ بھٹو کا مشن ناممکن تھا۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے جب بھٹو ٹوٹے ہوئے پاکستان کے بکھرے ہوئے ٹکڑے جوڑنے نکلے تو قوم ان کے ساتھ تھی۔ بھٹو بہت سے پاکستانیوں کے لیے ایک حسین خواب کی حیثیت رکھتے تھے۔ برسر اقتدار آ کر بھٹو کا خاندان عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بڑے بیٹے مرتضیٰ بھٹو نے 70 کلفٹن میں ایک کٹیا بنالی جس میں وہ غریبوں کے انداز میں رہنے لگے۔ میڈیا نے اس کو بہت اچھالا تھا مخالفین نے مذاق میں اس کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ مرتضیٰ بھٹو کا اپنا اسٹائل تھا۔ بال بڑھے ہوئے جینز کی پتلون اور ماؤ کیپ میں وہ اس وقت کے طلبا کے آئیڈیل بن گئے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کے لیے اپنے ''فخر ایشیا'' باپ کے اقتدار کا دور سہانا رہا مگر پانچ سال بعد اچانک ان کی دنیا بدل گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ان کے مقرر کردہ چیف آرمی اسٹاف نے تختہ الٹ دیا۔ بھٹو قید ہو گئے اور تاریخ نے اپنا بے رحم کھیل شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لیے مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو نے تحریک چلائی۔ مغربی ممالک اور مشرق وسطیٰ کے دارالحکومتوں میں گئے۔ عالمی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بھٹو کو ایک سیاسی مخالف کے قتل کی سازش

کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔ مرتضیٰ بھٹو نے بی بی سی پر کہا ''میرے باپ نے ملک کو بچایا تھا، اس کو تختہ دار پر لٹکا کر جمہوریت کو لٹکا دیا گیا'' بھٹو کو پھانسی ہوگئی۔ مغربی ذرائع ابلاغ چلا اٹھے۔ بھٹو کی جان بخشی نہیں ہوئی۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو نے اپنے والد کے ''قتل'' کا بدلہ لینے کے لیے دہشت گردی کی تحریک شروع کر دی۔ ایک خفیہ تنظیم ''الذوالفقار'' قائم کی گئی جس میں نوجوان بھرتی کیے گئے جن کو خود کار اسلحہ اور بموں کے استعمال کی تربیت دی گئی۔ پاکستان میں ایک نئے انداز کی سیاست شروع ہوگئی۔ قتل اور بم کے دھماکے ہونے لگے۔ **1981**ء میں عین اس وقت جب پاکستان کی اپوزیشن جمہوریت کی بحالی کی تحریک شروع کر رہی تھی پی آئی اے کا ایک طیارہ اغوا کر لیا گیا۔ اس واردات کے ساتھ ہی جمہوریت کی تحریک ''ہائی جیک'' ہوگئی۔ مرتضیٰ بھٹو دمشق سے کابل منتقل ہو گئے جہاں پی آئی اے کا طیارہ لے جایا گیا تھا۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو ''عالمی مجرموں'' کی طرح دنیا میں پھرتے رہے پھر فرانس کے شہر کانز میں شاہنواز بھٹو پراسرار طور پر ہلاک ہوگئے۔ بھٹو فیملی اس سانحہ کا عرصہ تک جنرل ضیاء الحق کو ذمہ دار ٹھہراتی رہی۔ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی کی لاش لے کر جلاوطنی سے واپس آ گئیں۔ ہزاروں افراد کراچی ائرپورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ گڑھی خدا بخش میں ذوالفقار علی بھٹو کے مزار کے پہلو میں شاہنواز بھٹو کو دفن کیا گیا۔ یہ بے نظیر بھٹو کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے اپنے دوسرے بھائی کو اس وقت سپرد خاک کیا جب وہ پاکستان کی وزیراعظم تھیں۔ فضا میں مرتضیٰ کے قاتل کو پھانسی دینے کے مطالبہ کی گونج تھی۔ مرتضیٰ بھٹو کے دوست ان کے قاتلوں کے پاؤں کے نشانات تلاش کر رہے تھے۔ الزام تراشی کا ٹارگٹ مرتضیٰ کے بہنوئی آصف علی زرداری تھے۔ جب آصف علی زرداری مرتضیٰ کے چہلم کے بعد بے نظیر کی حکومت برطرف ہونے پر گرفتار کیے گئے تو ان کے والد حاکم علی زرداری کو ان کی سلامتی کی فکر پڑ گئی۔ حاکم علی پیر پگاڑو سے لے کر الٰہی بخش سومرو تک ہر ایک سے ملے۔ وہ اپنے بیٹے کی زندگی کی ضمانت چاہتے تھے۔ آصف زرداری کا بیٹا بلاول دبئی سے کراچی جیل فون کر کے اپنے باپ کی خیریت پوچھتا ہے تو 70

کلفٹن پر کمسن ذوالفقار علی بھٹو جونیئر اپنی ٹوائے پستول سے اپنے باپ کے قاتلوں کے نشانے لگاتا ہے۔ سیاست کتنی بے رحم ہے اس کا اب ان خاندانوں کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔

اعجاز الحق کو بڑی عمر میں اس بے رحمی کا اندازہ ہوا۔ ان کے والد جنرل محمد ضیاء الحق کا طیارہ 1988ء میں فضا میں پھٹ گیا۔ ضیاء الحق جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک چلے گئے۔ ان کا مشن پورا کرنے کا عہد کرنے والے نواز شریف بھی پچھلے دنوں اچانک گئے۔ ان کے والد میاں شریف 12 اکتوبر 1999ء کے بعد سے سکتے کی کیفیت میں ہیں۔ شریف فیملی کو اس بھونچال کی کبھی توقع نہیں ہوگی۔ مگر پیر پگاڑو جیسے ستاروں کا علم جاننے والے سیاستدان مستقل خبردار کر رہے تھے کہ جو لائے ہیں وہی لے جائیں گے۔ شاید نواز شریف کے علاوہ سبھی کو یقین تھا کہ وہ جا رہے ہیں۔ خود پیر پگاڑو کو بڑی کمسنی میں صدمہ جھیلنا پڑا تھا۔ ان کے والد پیر صبغت اللہ شاہ کو انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی۔ پیر صاحب کے صاحبزادے صبغت اللہ اور علی گوہر شاہ سیاست میں ہیں۔ صبغت اللہ کو صحیح معنوں میں والد کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔ جب پیر صاحب بول رہے ہوں وہ خاموشی سے سنتے ہیں۔ خاموشی سے باپ کی بات سننا سندھ کی روایت ہے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے بیٹے مرتضیٰ اور عارف سیاسی مذاکرات میں صرف اسی حد تک حصہ لیتے ہیں کہ اپنے والد کو بات چیت کرتا دیکھتے ہیں اگر کوئی سوال کرے تو وہ اپنے جہاندیدہ باپ کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

سندھ کے سیاستدانوں میں سید غوث علی شاہ بڑی تاخیر سے اپنے بیٹے علی حیدر شاہ کو سیاست میں لے کر آئے۔ ان کو مسلم لیگ میں شامل ہوئے چند ماہ نہ گزرے تھے کہ مسلم لیگ کا تختہ الٹ گیا۔ غوث علی شاہ اپنے بیٹے کا سیاسی کیریئر نہیں بنا سکے۔ سندھ کے سیاسی خاندانوں میں جی ایم سید کے بیٹے امداد شاہ اور پوتے جلال شاہ اپنے اپنے محاذوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ یوں تو سیاست اپنے بچوں کو باقاعدہ سکھانے کا رواج ہے مگر چار دہائیوں تک سیاست کرنے والے شیر باز مزاری کو اب سیاست کے لفظ سے نفرت ہو گئی

ہے۔ جاگیردار ہونے کے باوجود ان کے بیٹے نوکری کر رہے ہیں۔ اگر یہ فیصلہ نواب اکبر بگٹی کرتے تو شاید بہتر ہوتا جن کو اپنے بوڑھے کاندھوں پر جوان بیٹوں کے جنازے اٹھانے پڑے۔ ان کے کاندھے جھک گئے مگر ان کا سر اب تک بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ''سردار'' ہیں۔ کبھی بیٹے باپ سے غداری بھی کراتے ہیں۔ ایوب کھوڑو کی ذوالفقار علی بھٹو سے ہمیشہ دشمنی رہی۔ دونوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن اور مخالف سمجھا جاتا تھا مگر ایوب کھوڑو کے بیٹے پاشا کھوڑو نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور پہلی بار کھوڑو ہاؤس پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہرایا۔ ان کی بہن حمیدہ کھوڑو مسلم لیگ میں ہیں اسی کو سیاست کہتے ہیں۔

جلاوطن سیاست کاری نے پاکستان کو کیا دیا؟

جلاوطن سیاستدانوں نے قوم کو مایوس کیا ہے سابق وزرائے اعظم نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے ہمیشہ یہی کیا کہ ہم وطن واپس آ کر قوم کی رہنمائی کریں گے اسے جمہوریت کی منزل سے ہمکنار کریں گے۔ قوم منتظر رہی نہ نواز شریف آئے نہ بے نظیر بھٹو، نواز شریف تو خاموش تھے مگر بے نظیر بھٹو نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے اپنا سامان دبئی سے اسلام آباد بھجوا دیا ہے۔ سامان پہنچ گیا بے نظیر بھٹو نہیں پہنچیں۔ نواز شریف نے یہ دعویٰ کیا کہ جس طرح میرے جانے کا حکمرانوں کو پتہ نہیں چلا میرے آنے کا پتہ نہیں چلے گا۔ جو سیاستدان نواز شریف سے ملنے جدہ جاتے ان سے یہی کہتے کہ میں آؤں گا 10 اکتوبر 2002ء کے انتخابات نے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں کو ایک سنہری موقع وطن واپسی کا فراہم کیا۔ دونوں نے اس جرات کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی ان سے قوم توقع کر رہی تھی۔ اس ''عدم جرات'' سے مسلم لیگ (نواز) اور پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز کو نقصان ہوا۔ دونوں پارٹیاں خاطر خواہ انتخابی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں۔ اس سے اس اسٹیبلشمنٹ کو فائدہ ہوا جسے خود کلثوم نواز جلاوطن میں جانے سے پہلے موثر طریقہ پر چیلنج کر چکی تھیں۔ اب معاملہ بالکل سیدھا ہے۔ اگر نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پاکستان میں آ جاتے تو حکومت کو نہ اتنی انتخابی دھاندلیوں کی جرات ہوتی۔ نہ دونوں پارٹیوں میں اس طرح شگاف پڑ سکتے تھے۔ مسلم لیگ (نواز) تو تقریباً پوری مسلم لیگ (ق) میں منتقل ہو گئی۔ پیپلز پارٹی قائم رہی اس

میں ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے وفادار فیصل صالح حیات، نوروز شکور سکندر اقبال نے خاطر خواہ شگاف ڈال دیئے۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو کے مخالفین کا اصرار ہے کہ سارا معاملہ ان کی رضا مندی سے ہوا اس کے اتنے شواہد نہیں ملے ہیں سوائے اس کے کہ وزیر داخلہ فیصل صالح حیات کی ہدایت پر بے نظیر بھٹو کے بچوں بلاول اور بختاور کو پاکستان آکر اپنے والد آصف علی زرداری سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ بچے اپنے باپ کو ملنے اور باپ بچوں کو ملنے کو ترس رہا تھا۔ بچھڑے ہوئے مل گئے اس سے زیادہ وزیر داخلہ اپنی لیڈر کی کیا خدمت کرسکتے تھے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ سیاست کے کھیل میں بچے زد میں آجاتے ہیں۔ آصف زرداری اپنی سات سالہ قید میں بچوں کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ اگرچہ ٹیلی فون پر آصف بے نظیر بھٹو اور بچوں سے بات کرسکتے تھے ان سے مل نہیں سکتے تھے قیدی باپ سے بچوں کو ملا کر فیصل صالح حیات نے یقینی طور پر بڑی خدمت کی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور بلاول ہاؤس نے اس خدمت کو خفیہ رکھنے کی پوری کوشش کی بلاول نے کراچی کی عرصہ بعد سیر کی باربی کیو سے لے کر بلوچ کی آئس کریم سے لطف اٹھایا۔ بلاول کا کراچی میں اس لحاظ سے اتنا دل نہیں لگا کہ بہنیں بختاور اور آصف ساتھ نہیں تھیں۔ مگر بلاول کے دوست ضرور ساتھ تھے جو ان کو اپنے درمیان پا کر خوش تھے پھر آصف علی زرداری کے بلڈرز اور ڈیولپرز دوست خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ بلاول کی واپسی کے بعد بختاور دبئی سے اسلام آباد پہنچی جنہوں نے اپنے اسیر والد کے ساتھ کئی روز گزارے۔

سیاسی وراثت کی کشمکش نے بے نظیر بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو کے بچوں میں فاصلے پیدا کردیے ورنہ بلاول ذوالفقار علی بھٹو جونیئر سے ملنے کی ضرور کوشش کرتا جو 70 کلفٹن میں رینجرز کے پہرہ میں اپنی والدہ غنویٰ بھٹو کے ساتھ رہتا ہے۔ 70 کلفٹن میں روایتی رونق نیویارک سے فاطمہ بھٹو کی واپسی سے لوٹ آئی جو نیا سال منانے کراچی آئی تھیں۔ فاطمہ بھٹو اپنے والد میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے سانحہ سے اتنی متاثر ہوئی کہ انگریزی کی شاعرہ بن گئی جس کے دو مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ غنویٰ بھٹو کہتی ہیں بے نظیر بھٹو کے 70

کلفٹن میں آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر وہ مہمان کی طرح آنا چاہیں تو ہمارے دروازے کھلے ہیں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ بے نظیر بھٹو پر خود اپنے گھر کے دروازے بند ہیں۔ کراچی میں بھی، لاڑکانہ میں بھی، سیاست کتنی بے رحم ہے۔

بے نظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو کو اندازہ ہے کہ سیاست کی بے رحمی کیا رنگ دکھاتی ہے کیا گل کھلاتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ صنم بھٹو نے بے نظیر بھٹو کے اصرار کے باوجود 10 اکتوبر 2002ء کے انتخابات میں امیدوار ہونے سے صاف انکار کردیا۔ ماضی میں بھی بھٹو خاندان کی واحد غیر سیاسی فرد کو سیاست میں لانے کی انتہائی کوششیں کی گئیں جو کامیاب نہیں ہوئیں۔ صنم نے خود کو صحیح معنوں میں بھٹو کی بیٹی ثابت کر دکھایا ہے۔ صنم بھٹو کا اپنے بچوں کے ساتھ لندن میں قیام ہے سینٹرل لندن میں رہتی ہیں عام لوگوں کی طرح بس اور ٹرین میں سفر اور بازاروں میں خریداری کرتی ہیں پاکستان کے وی آئی پی آڑے وقت میں کس طرح دیار غیر میں عام شہری بن جاتے ہیں۔ نہ کوئی شکایت نہ شکوہ نہ گلہ، وطن کی ان کو ضرور یاد ستاتی ہے۔ لندن میں متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین برطانوی شہری کی حیثیت سے جنوری 1992ء سے مقیم ہیں۔ اپنی شادی وہیں کی بلوچ خاتون فائزہ گبول سے جو ان کی صاحبزادی افضاء کی ماں ہیں۔ الطاف حسین کا لندن سے واپس آنے کا فی الحال ارادہ نہیں ہے۔ بچی کی پیدائش پر الطاف حسین نے کہا کہ میری بیٹی مجاہدہ بنے گی جو حقوق کے لیے جدوجہد کرے گی اکتوبر 2002ء کے انتخابات سے قبل الطاف حسین کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی اہلیہ فائزہ اور سسر ملک فیصل گبول کو ضرور بھیجیں گے جو انتخابات میں ان کے ٹکٹ پر حصہ لیں گے۔ جب دونوں نہیں آئے تو ساری قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں فیصل گبول سندھ اسمبلی میں ارکان کی حلف برداری میں شریک تھے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کی بچی ابھی بہت چھوٹی ہے اس کی اسکول میں داخلہ کی عمر نہیں الیکشن کی عمر بھی نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنما سابق صوبائی وزیر پیر مظہر الحق اس لحاظ سے خوش قسمت قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ برطانیہ میں

سیاسی پناہ لے رکھی ہے۔ اس پناہ کے دوران پیر مظہر الحق لندن سے کراچی آئے اپنی صاحبزادی ماروی کی انتخابی مہم میں شریک ہوئے۔ اپنی صاحبزادی کو سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہوتے دیکھا پھر لندن واپس چلے گئے دوبارہ سیاسی پناہ لے لی۔ اس قسم کا ڈرامہ اتنی دلیری سے صرف پاکستانی سیاستداں کر سکتے ہیں۔ سیاسی پناہ کا قانون یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں اس شخص کو پناہ دی جاتی ہے جو یہ ثابت کرے کہ اس کے لیے اپنے ملک میں حالات انتہائی ناقابل برداشت ہیں۔ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اس لیے وہ دیار غیر میں سیاسی پناہ گزین بننے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اب یہ کیسا پناہ گزین ہے جو آرام سے پاکستان آ گیا انتخابی سرگرمیوں میں شریک ہوا۔ پھر واپس لندن جا کر دوبارہ سیاسی پناہ لے لی۔ سیاسی پناہ میں فائدہ یہ ہے کہ ایک تو گھر بیٹھے وظیفہ ملتا ہے۔ مفت گھر ملتا ہے خود پیر مظہر الحق نے ایک نجی محفل میں کہا کہ دوست کہتے ہیں بہت موٹے ہو گئے وزن بڑھا لیا ہم نے کہا ہم تو سیاسی مہاجر ہیں۔ ایسے پاکستانی سیاستدانوں کو پناہ دینے والے نہیں سوچتے کہ کس طرح ان کی رعایت سے جائز اور ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے امریکہ اور برطانیہ میں ایسے سیاسی پناہ گزینوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں متحدہ قومی موومنٹ مہاجر قومی موومنٹ جئے سندھ اور این جی اوز سے اپنی وابستگی ظاہر کر کے سیاسی پناہ کے طلبگار ہیں۔ سیاسی پناہ طلب کرنے والوں میں سیاسی ورکرز اور رہنما ہی نہیں بیوروکریٹس اور سیاستداں تک شامل ہیں۔ پاکستان کے جو سفارت کار امریکہ اور یورپی ملکوں میں متعین کیے جاتے ہیں اپنی معیاد پوری ہونے پر وہیں کے ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے سابق وزیر اعظم نواز شریف اور ان کے خاندان کو اس لحاظ سے کریڈٹ دینا پڑے گا کہ ہر لمحہ یہی کہا ہے کہ پاکستان اپنی مرضی سے نہیں مجبوراً چھوڑا ہے۔ یہ طے ہے کہ شہباز شریف کو زبردستی بھیجا گیا کسی قیمت پر وطن چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ شریف فیملی آنسو بہاتی پاکستان سے رخصت ہوئی۔ پاکستان نے اس فیملی کو عزت دی

دولت دی اقتدار دیا پھر اس طاقتور فیملی سے اقتدار چھین لیا۔ جسے اس کو یقین ہے وقت پر حاصل کر لے گی۔ یہ خاندان فولاد کی بدولت سیاسی طور پر آہنی خاندان بن گیا۔ جو 1985ء سے 1999ء تک معمولی وقفہ سے پاکستان کے اقتدار میں رہا۔ اب یہ خاندان سعودی عرب میں فولاد کا کارخانہ لگا رہا ہے۔ اگرچہ اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ طیارہ کیس میں سزا یافتہ نواز شریف اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو کس معاہدہ کے تحت سعودی عرب بھیجا گیا۔ یہ ساری دنیا نے دیکھا کہ پاکستان کی عدالت سے سزا یافتہ سیاستداں کا سعودی عرب میں سرخ قالین بچھا کر استقبال کیا جا رہا ہے۔ اسی استقبال کے شور میں نہ صرف طیارہ سازش کیس کی آواز دب گئی بلکہ عدلیہ تک کوئی آواز بلند نہ کرسکی سب خاموش ہوگئے۔ مشرف حکومت کے ترجمانوں نے کچھ عرصہ ''ڈیل'' کا واویلا کیا مگر پھر کوئی ''راز'' منظر عام پر نہیں آیا۔ راز راز ہی رہا۔ ایسے کتنے ہی راز راولپنڈی، اسلام آباد کی فائلوں میں دفن ہیں۔ پھر جلاوطنی مستقل گھاٹے کا سودا نہیں۔ سندھ کے گورنر ڈاکٹر عشرت العباد نے جلاوطنی سے آ کر سندھ کی گورنر شپ سنبھالی یہ جلاوطنی کا کرشمہ ہے۔ بے نظیر بھٹو ہوں الطاف حسین یا نواز شریف پاکستان کے مظلوم اور محکوم عوام ان کے ساتھ ہیں یہ عوام کو چھوڑ چکے ہیں عوام ان کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ غریب اور سادہ لوح عوام 2002ء میں اپنے ان جلاوطن رہنماؤں کے منتظر رہے۔ 2003ء میں بھی انتظار ان کا مقدر ہے۔ یہ انتظار کب ختم ہوگا؟

پاکستان میں عنان اقتدار سیاست کاری اپنوں سے زیادہ غیروں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے حکمران اور سیاستدان برطانیہ، امریکہ، اور بعض یورپی و مشرقی ملکوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔ ایوان اقتدار اور سیاست میں آنکھ مچولی کے اس کھیل کو کھیلتے کھیلتے ہمارے بہت سے بااثر سیاستدان میدان سے باہر نکل چکے ہیں مگر آج کل وہ اپنے ان مہربانوں کے ہاں مقیم ہیں جو ان کی سرپرستی سے کبھی گریزاں نہیں رہے۔ ماضی میں اگر ان کے آقا پاکستان کی تقدیر کے فیصلے کرتے تھے تو آج بیشتر پاکستانی

سیاستدان آقاؤں کے پاس رہ کر اپنی قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہماری ستم ظریفی ہے کہ پاکستان کے ایوانوں میں جاری اس شطرنج کے کھیل میں یہاں مقیم سیاستدان اپنے جلاوطن لیڈروں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں جو اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد پاکستان سے بھاگ گئے اور اب باہر بیٹھ کر دوہرے مقاصد حاصل کر رہے ہیں۔ پاکستانی کی سیاست ان کے فیصلوں کے گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ایسی مثال نہیں ملتی جہاں جلاوطن حکمران اور سیاستدان اپنی پارٹیوں کے ذریعہ فیصلے صادر کرتے ہوں۔ ہمیں یہ سیاسی روش تبدیل کرنا ہوگی۔ کیونکہ جلاوطن لیڈر اگر ملک کے آئین و قانون اور عوام کے ساتھ مخلص ہوتے تو یہاں رہ کر ان پختہ عقیدہ سیاستدانوں کی طرح قانونی و سیاسی جنگ لڑتے جنہوں نے اپنے جمہوری اور اصولی موقف کی خاطر قید و بند برداشت کی لیکن ملک چھوڑ کر بھاگنا منظور نہ کیا۔

پاکستان میں برادر نسبتی کی سیاست

"ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف" کسی نے غلط نہیں کہا ہے برادر نسبتی کو سارے رشتوں میں خاطر خواہ ترجیح حاصل ہے یہ رشتہ عام لوگوں کی طرح سیاستدانوں میں بھی ہے۔ بہنوئی اور برادر نسبتی کا لنک سیاست میں عرصہ سے ہے اب تک ہے، بڑا موثر ہے۔ پیر صاحب پگاڑو 45 سال تک حسن محمود کے بہنوئی رہے۔ ان کی بہن رضیہ بیگم پیر صاحب کی اہلیہ تھیں۔ پھر یہ رشتہ چند ہفتوں میں بکھر گیا رضیہ بیگم نے کہا گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ پیر صاحب شاید اپنے سیاسی کیریئر میں پہلی بار خاموش رہے۔ کبھی بہت بولنے والے کو خاموش ہونا پڑتا ہے حسن محمود سے پیر صاحب کے تعلقات بھی نشیب و فراز کا شکار رہتے ہیں یہی کیفیت نواب اکبر بگٹی اور سردار شیر باز مزاری کے رشتہ کی رہی ہے۔ سردار مزاری کی اہلیہ نواب اکبر بگٹی کی ہمشیرہ ہیں۔ سردار نے قبائلی انداز ترک کر دیا ہے مگر نوابی برقرار ہے۔ دونوں کی سوچ میں فکر میں بڑا فرق ہے۔ سردار مزاری جب جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے نواب اکبر بگٹی اس تحریک کا مذاق اڑاتے تھے۔ سردار نے ہمیشہ یہی کہا کہ ساری سیاست پاکستان کے لیے ہے نواب جب اقتدار میں نہ ہوں تو پاکستان سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ دونوں اس طرح کے برادر نسبتی اور بہنوئی ہیں جن کی کبھی نہیں بنی۔ مگر اختلافات کی وہ شدت کبھی نہیں جو میر مرتضیٰ بھٹو اور آصف علی زرداری کی تھی۔

مرتضیٰ بھٹو نے آصف کو کبھی پسند نہیں کیا نہ یہ بات کبھی پوشیدہ رکھی وہ زرداری فیملی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر یہ ضرور کہتے تھے کہ میرا اختلاف ذاتی نہیں۔ سیاسی ہے جو لوگ لوٹ کھسوٹ کر رہے ہیں میں ان کے خلاف ہوں۔ آصف زرداری اور مرتضیٰ بھٹو کے تنازعہ پر مختلف کہانیاں تک بنائی گئی ہیں۔ یہ ساری کہانیاں مرتضیٰ بھٹو کی موت کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں۔ آصف زرداری کو مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے مقدمہ میں ملوث کیا گیا جب مرتضیٰ قتل ہوئے لاڑکانہ میں لوگ کہتے تھے ''ہمیں معلوم ہے قاتلوں کے قدموں کے نشان کہاں جا کر رکے ہیں''۔ آصف اپنے دفاع میں یہی کہتے تھے ''بندہ بھی ہمارا مار دیا الزام بھی ہم پر لگا دیا'' اب اسی مقدمہ میں آصف زرداری کی ضمانت ہو چکی ہے۔ مرتضیٰ بھٹو نے 70 کلفٹن فائرنگ کے اس واقعہ میں ہسپتال جا کر دم توڑ دیا۔ مگر مرتضیٰ بھٹو کے ایک ساتھی عاشق جتوئی نے کلفٹن روڈ پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ عاشق جتوئی، غلام مصطفیٰ جتوئی کے بہنوئی تھے یہ حالات کی ستم ظریفی کہ سندھ کے طاقتور سیاسی خاندان کے افراد اپنے ایک فرزند کی لاش ہسپتالوں میں تلاش کرتے رہے جو سڑک پر پڑی تھی۔ عاشق جتوئی بہت تحمل مزاج سیاستدان تھے ان کی موت پر جتوئی خاندان صدمے سے نڈھال تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی بہادر سیاستدان ہیں ان کو پہلی بار روتے ہوئے اپنے بہنوئی کی میت پر دیکھا گیا بہن بیوہ ہو گئی تھی۔

سندھ کے پاور فل تالپور خاندان کے میر منور، آصف علی زرداری کے بہنوئی ہیں۔ وہ آصف زرداری کی بہن ''فریال'' کے شوہر ہیں۔ فریال تالپور سمیت آصف زرداری کی بہنیں اپنی بھابی بے نظیر بھٹو کو کتنا پسند کرتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ گھروں میں نند، بھاوج کے جو تعلقات ہوتے ہیں بے نظیر بھٹو اور ان کی نندوں کے ان سے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ ہے کہ زرداری خاندان کو بے نظیر سے کتنا سیاسی اور غیر سیاسی فائدہ ہوا ہے۔ آصف زرداری اپنے بہنوئی میر منور تالپور کو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت میں چیف منسٹر تو نہیں بنوا سکے مگر منسٹر ضرور بنوا دیا۔ یہ منسٹری

بے نظیر حکومت ختم ہونے پر ختم ہوگئی۔

کبھی تاریخ خود کو دہراتی ہے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کا بے نظیر نے بائیکاٹ کیا جس میں زرداریوں نے حصہ لیا تھا۔ جنرل ضیاء کے جانے کے گیارہ سال بعد جنرل پرویز مشرف کی حکومت آئی۔ ایک اور ریفرنڈم کا بے نظیر بھٹو نے بائیکاٹ کیا ان کی نند فریال تالپور نے جنرل مشرف کی حمایت کی ان کا نواب شاہ میں ہر جگہ استقبال کیا۔ ان کے اجلاسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اب فریال تالپور نے اپنے بھائی آصف علی زرداری کی رہائی کے لیے حکومت کو درخواست دے کر بے نظیر بھٹو کو نئی مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اس پر برہمی کا اظہار کیا ہے۔

بزرگ سیاستدان ولی خان اپنے برادر نسبتی اعظم ہوتی پر برہم ہوتے ہیں ''مگر کبھی کبھی'' اعظم ہوتی کو کرپشن کے کیس میں سزا ہوئی۔ اپنے بہنوئی کی خاطر ''اصولی سیاست'' تک بدل کر رکھ دی۔ جس کی بدولت یہ ''اصولی خاندان'' مصلحت کی سیاست کی نذر ہوگیا۔ ولی خان کے لیے اپنے اس کردار کا دفاع کرنا مشکل ہے۔ سویلین ذوالفقار علی بھٹو سے مفاہمت نہ کرنے والے باچا خان کے بیٹے کو اپنی اہلیہ کی خاطر فوجی جنرل پرویز مشرف سے تعاون کرنا پڑا۔ جن کے ریفرنڈم کی حمایت یا مخالفت کا فیصلہ اے این پی نے ورکرز پر چھوڑ دیا ولی خان کی سیاست سے اعظم ہوتی کو مالی فائدہ اور اعظم ہوتی کی سرگرمیوں سے ولی خان کو سیاسی نقصان ہوا ہے مگر ایسے رشتوں میں فائدہ نقصان کہاں دیکھا جاتا ہے۔

دادو کے ملک سکندر طاقتور قبائلی سیاستدان تھے مرحوم بلوچستان کے سردار صالح بھوتانی کے بہنوئی تھے ملک سکندر نے 1970ء میں جی ایم سید کو شکست دی تھی اب ان کے صاحبزادے ملک اسد سکندر سیاست میں سرگرم ہیں بلدیاتی سے قومی سطح تک فعال ہیں۔

مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت علمائے پاکستان کے صدر ہیں جو مہاجر سیاست کے روز اول سے اب تک خلاف ہیں اس مسئلہ پر کسی کمپرومائز کے لیے تیار نہیں ہیں ان کے

بہنوئی محمد احمد صدیقی ہیں جو مولانا نورانی کی پارٹی کے مرکزی سکریٹری اطلاعات ہیں۔ مولانا نورانی کی ہمشیرہ ڈاکٹر فریدہ احمد خواتین کے وفاقی کمیشن کی ممبر ہیں محمد احمد صدیقی کو اپنی مہارت کی بدولت اپنی اہلیہ اور برادر نسبتی دونوں کی خبریں جاری کرنا پڑتی ہیں۔ مگر اس کام سے وہ ناخوش نہیں ہیں۔ جلال شاہ، جی ایم سید کے پوتے ہیں دادو کے محمد شاہ ان کے برادر نسبتی ہیں جلال شاہ سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قریب ہیں یہ رشتے سیاستدانوں تک نہیں ممتاز کالم نویس غازی صلاح الدین پی پی پی کے تاج حیدر کے بہنوئی ہیں دونوں اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز ہیں۔ تاج حیدر نے شادی نہیں کی اس لیے ان کا کوئی برادر نسبتی نہیں۔ پنجاب میں چودھری شجاعت حسین، پرویز الٰہی کے بہنوئی ہیں۔ طاقتور خاندانوں میں آپس میں رشتے کرنے کا رجحان چاروں صوبوں میں ہے۔

کراچی کے ہارون خاندان نے پنجاب کے سہگل خاندان میں رشتہ کیا ہے۔ اس طرح عنبر سہگل کے شوہر حسین ہارون اور حمید ہارون کے بہنوئی ہیں۔

موروثی سیاست صرف پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ دنیائے سیاست میں نمایاں ترین ممالک میں خاندانی سیاست کا رواج عام ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی مثال اس ضمن میں دی جاسکتی ہے۔

وہاں بہت سے خونی رشتے سیاست کو وراثت کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ تاہم برادر نسبتی کی سیاست کا جو پاکستان میں رواج ہے یہ اس قدر پھیل چکا ہے کہ بیشتر مشرقی ممالک میں سیاسی حلقہ اثر کو مضبوط بنانے کے لیے سالا بہنوئی کی سیاست کو ناگزیر تصور کیا جارہا ہے۔ بالخصوص بھارت میں سالا بہنوئی کی سیاست مقامی سطح پر رواج پارہی ہے۔

جمہوری سسٹم کا خاتمہ نہیں چاہتے

پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین مخدوم امین فہیم سے بات چیت

مخدوم امین فہیم سیاست میں وضعداری کے قائل ہیں یہ وضعداری ان کو مہنگی پڑ جاتی ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے ان کو پاور شیئرنگ کی براہ راست آفر کی شرط صرف یہ رکھی تھی کہ مخدوم امین فہیم بے نظیر بھٹو کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں محترمہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ انتخابات کی رات امین فہیم کراچی سے لندن جا کر بے نظیر بھٹو سے ملے انہوں نے کہا کہ آپ حکومت بنانے کے لیے مذاکرات کریں میری طرف سے کوئی بات نہیں ہے آپ کو فری ہینڈ دیتی ہوں۔ امین فہیم نے مسلم لیگ (قائداعظم) متحدہ مجلس عمل سمیت ساری جماعتوں سے مذاکرات کیے۔ ایک مرحلہ پر یہ لگ رہا تھا کہ امین فہیم وزیراعظم ہوں گے۔ ان کی کوششوں کو سبوتاژ منظم طریقہ سے کیا۔ امین فہیم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب خود بے نظیر بھٹو نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ میں تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنے۔ ہم جنرل مشرف کے تحت اقتدار نہیں چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے امین فہیم کو کس قدر صبر آزما صورتحال سے دوچار کیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز کے صدر کی حیثیت سے وہ نہ اقتدار لے سکے نہ اب تک اپوزیشن کے لیڈر بن سکے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے سندھ سے متحدہ مجلس عمل کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کو سینیٹر منتخب کرایا جنہوں نے اپنے انتخاب کے بعد کہا کہ پیپلز پارٹی

کے امیدوار کی لیڈر آف اپوزیشن بننے کی حمایت نہیں کی جائے گی۔

فوج کے جنرلوں سے سیاست کے جنرلوں تک امین فہیم نے بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں جب ان سے پوچھا گیا کہ جنرلوں سے اب بھی رابطہ میں ہیں انہوں نے کہا کہ میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ الیکشن سے پہلے ضرور تھا اس طرح سے مجھے تعجب ہوا جب میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ دو جنرلوں نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط ہے میرا کسی سے رابطہ نہیں ہے۔ جب یہ خبر آئی میں پنجاب میں تھا میں نے اس کی تردید کی ہے۔

سوال: کیا آپ کو اس حکومت کی بساط لپٹتی نظر آ رہی ہے؟

جواب: ہم اس کی کبھی حمایت نہیں کریں گے کہ کوئی غیر جمہوری سیٹ اپ آئے۔ ہم چاہتے ہیں ظفر اللہ جمالی مضبوط ہوں پارلیمنٹ مضبوط ہو یہی جمہوریت ہے۔ آئین کو بحال کریں جس شکل میں 9 اکتوبر 2002ء کو تھا اس کو واپس لائیں سارے مسائل خود حل ہوجائیں گے۔ ورنہ میں خبردار کرتا ہوں کہ ایل ایف او کے مسئلہ پر پارلیمنٹ میں جو احتجاج ہو رہا ہے سڑکوں پر آجائے گا اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ بساط لپیٹ دی جائے جمہوری سسٹم ختم ہوجائے۔ یہ المیہ ہوگا مگر یہ نہ فراموش کیا جائے کہ پاکستان میں جس حکمراں نے خود کو مضبوط سمجھ کر پارلیمنٹ کو توڑا ہے وہ خود ٹوٹ گیا ہے۔ جنرل ضیاء نے جونیجو کو نکالا خود چلے گئے غلام اسحاق کے ساتھ کیا ہوا فاروق لغاری نے قومی اسمبلی توڑی تو خود پاورفل نہیں رہے اقتدار سے محروم ہوگئے۔

سوال: ڈیڈلاک کیسے ختم ہوگا جس میں حکومت اور اپوزیشن پھنسی ہوئی ہے؟

جواب: اس ڈیڈلاک کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں حکومت ہے۔ گیند حکومت کی کورٹ میں ہے حکومت پہل کرے تو مسئلہ حل ہوگا۔ میرے خیال میں واحد راستہ یہی ہے کہ بامقصد بات چیت کی جائے اس کے بغیر بات کیسے بنے گی۔ ہم نہیں چاہتے غیر جمہوری قوتوں کو موقع ملے ہم نے ہمیشہ جمہوریت کی بات کی ہے۔ ہم جمالی کو طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں یہ خود ان کے مفاد میں ہے۔

سوال: جنرل پرویز مشرف کے بیک وقت صدر اور آرمی چیف رہنے کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

جواب: جب تک اوپن مائنڈ سے بیٹھ کر بات چیت نہیں کریں گے اس وقت جو خلیج ہے اسے ختم نہیں کریں گے مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ لچک ہونا چاہیے دونوں فریقوں حکومت اور اپوزیشن کی طرف سے۔ ورنہ معاملات بگڑ جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حالات بہتر ہوں عوام کے بھوک جہالت بے روزگاری کے مسائل حل ہوں۔

اس سوال پر کہ وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی کو آپ کیا مشورہ دیں گے انہوں نے کہا کہ میں یہی کہوں گا کہ ایل ایف او کو فلور آف دی ہاؤس لے کر آئیں اگر اسمبلی پاس کر دے تو ہم قبول کر لیں گے۔ یہ دو تہائی اکثریت سے ہونا چاہیے جو آئینی ضرورت ہے۔

مخدوم امین فہیم کو باور کرایا گیا کہ پیپلز پارٹی نے اکتوبر کے انتخابات کے بعد دھاندلیوں کا الزام لگا کر نئے الیکشن کا مطالبہ کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ اس وقت ہمارا مطالبہ صحیح تھا کیونکہ اس طرح دھاندلی کھل کر کی گئی تھی کہ جیتے کو ہرایا گیا تھا ہارے کو جتایا گیا تھا ہم اسے کیسے مان سکتے تھے اب کیا کرتے الیکشن کے نتائج کو تسلیم کر لیا۔

مخدوم امین فہیم ان گنے چنے سیاستدانوں میں سے ہیں جو اقتدار کے بہت قریب ہو کر پھر دور ہو جاتے ہیں کئی بار ایسے مرحلے آئے جب یہ نظر آیا کہ مخدوم خاندان کو بالآخر اقتدار مل جائے گا پھر کسی خفیہ ہاتھ نے کام دکھا دیا یہ ہاتھ کبھی اپنے تھے کبھی پرائے۔ امین فہیم کو شکوہ کرنے کی عادت نہیں ہے وہ شاعر ہیں تیر کھا کر اپنے ہی دوستوں سے ملاقات کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کی شرافت اور وضعداری ان کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر وہ بے اصول ہوتے تو جمالی کی جگہ وزیر اعظم ہوتے مگر انہوں نے مخدوم خاندان کی روایت کے تحت بے نظیر بھٹو سے وفاداری نبھائی اپنے والد کی اس نصیحت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ بھٹو فیملی کو کبھی مت چھوڑنا۔ اس لحاظ سے امین فہیم مخدوم خاندان کے سربراہ کی حیثیت مسلسل وفاداری نبھا رہے ہیں اس کا انہوں نے عارضی صلہ تک نہیں مانگا ہے اقتدار ان

کے سامنے پڑا تھا۔ جنرل مشرف نے کہا آپ سنبھالیں ملک۔ ہم مل کر کام کر سکتے ہیں بے نظیر بھٹو کو چھوڑیں۔ انہوں نے اس اقتدار کو ٹھوکر ماری جسے سیاستدان پلکوں سے اٹھاتے ہیں۔ مخدوم امین فہیم سیاست کے اس چیختے چلاتے شور مچاتے ماحول میں خاموش سیاستدان ہیں۔ ان کی خاموشی کبھی رنگ لائے گی جنرل ضیاء الحق سے جنرل پرویز مشرف تک اقتدار ان کے پاس سے کئی بار گزرا وہ اپنا دامن بچا گئے ان کے بعض وفادار ساتھی تنگ آ کر کہتے ہیں امین سائیں کے ہاتھ میں پاور کی لکیر نہیں ہے مگر دیکھنے والوں کو ان کے ہاتھ میں پاور اسٹار نظر آ گیا ہے۔

میں سوشلسٹ ہوں

اوورسیز پاکستانی طارق علی کی باتیں

بائیں بازو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی طارق علی اپنے لیکچر کے لیے مقامی ہوٹل میں داخل ہوئے تو بنیان اور خاکی جینز میں ہونے کے باوجود ان کو اندازہ ہوگیا کہ کراچی کا موسم گرم ہے اور ہوٹل کا ائرکنڈیشنڈ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ ان کی آمد سے پہلے ایک شخص نے مائیک چیک کرنے کے بہانہ نصف گھنٹہ تک بے مقصد خطاب کر کے حاضرین کو پریشان کر دیا تھا۔ طارق علی نے پانی کی بوتل کھلوائی پھر ٹی وی کیمرہ کی لائٹ آف کرنے کی درخواست کی انہوں نے حاضرین کی طرف نظر دوڑائی پہلی صف میں اردشیر کاؤس جی اپنے مخصوص انداز میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ عبدالحئی بلوچ کو دیکھ کر وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے معراج محمد خان اقبال حیدر عبدالرزاق جونیجو پہلی صف میں تھے۔ طارق علی نوٹس کے بغیر بولنے آئے انہوں نے کہا میں 1969ء کے بعد پہلی بار خطاب کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ لاہور میں اپنی ماں کو ملنے تک یہ دورہ محدود رکھوں گا۔ پھر مجھے لیکچر کی اسلام آباد لاہور پھر کراچی میں دعوت دے دی گئی میں اس اجتماع کی تعداد دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں انہوں نے کہا اس بارے میں کوئی شک نہ کریں کہ عراقی عوام امریکہ کی مزاحمت کریں گے۔ ایک خودمختار عرب ملک پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ آئندہ دنیا کا نیا نقشہ اس لحاظ سے بنے گا۔ میں اس خیال کو قبول نہیں کرتا کہ عراق پر قبضہ تیل کی خاطر کیا گیا ہے۔ 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد امریکہ دنیا کا نقشہ از سر نو بنا رہا ہے ایرانیوں اور شامیوں سے کہے گا کہ بغداد کا حشر یاد رکھو۔ اقوام متحدہ کمزور ہے کوئی انٹرنیشنل کمیونٹی نہیں ہے صرف امریکن ایمپائر ہے پاکستان میں صرف ایم ایم اے نے امریکہ کے خلاف مارچ

کرایا۔ باقی کیوں سو رہے تھے۔ طارق علی نے خبردار کیا کہ لطیفوں سے یہ نہ سمجھیں کہ بش کوئی بے وقوف آدمی ہے اس کے پیچھے سامراجی لیڈر شپ ہے جس کا مقصد دنیا پر بالادستی قائم کرنا ہے۔ امریکیوں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عراق کی مزاحمت کی قدیم تاریخ ہے۔ امریکہ نے کٹھ پتلی حکومت بنائی تو اس کا حشر ماضی کی حکومتوں کی طرح ہوگا۔

انہوں نے خبردار کیا کہ عراقی مزاحمت سے انقلاب کی جو لہر آئے گی ان ملکوں کی حکومتوں کو بہا لے جائے گی جو امریکہ کی کاسہ لیسی کر رہے ہیں۔ مزاحمت میں ایک سال لگے دو سال دس سال مگر سب سے بڑی ایمپائر مفلوج ہو جائے گی۔ افغانستان میں کٹھ پتلی حکومت ہے جس کا اثر کابل سے آگے نہیں ہے۔ پاکستان میں امریکہ آرمی کے ذریعہ رول کرتا ہے امریکی ملٹری سے ڈیل کر لیتے ہیں اس طرح دس بارہ سال نکل جاتے ہیں۔ یہ سائیکل ختم کرنا پڑے گا کہ کبھی سیاستدان آتے ہیں پھر ان کو نکال کر فوجی آ جاتے ہیں۔ طارق علی نے صدر جنرل پرویز مشرف کے پاکستان فرسٹ کے نعرہ کا خوبصورتی سے جواب دیا انہوں نے کہا کہ یہ نعرہ پاکستان فرسٹ نہیں پاکستان آرمی فرسٹ ہے پاکستان میں اور پاکستان آرمی میں فرق ہے۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو 1971ء میں ملک ٹکڑے نہ ہوتا۔ پاکستان کو ٹوٹنے سے امریکہ نے نہیں بچایا۔

طارق علی نے ایک واقعہ سنایا کہ بولیویا میں پانی پرائیوٹائز کر دیا گیا جس کے تحت غریبوں پر پابندی لگا دی گئی کہ بارش کا پانی تک جمع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ عوام میں مزاحمت کا جذبہ بیدار کرنا ضروری ہے۔ لاطینی امریکہ کے ایک ملک میں نوجوان فوجیوں نے فوجی انقلاب کو مسترد کر دیا جو اپنے پاپولر رہنما کو دوبارہ لے آئے۔ جب سوال جواب کا سیشن ہوا تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ سوشلسٹ ہیں انہوں نے کہا کہ میں بدستور سوشلسٹ ہوں میرے خیالات وہی ہیں مگر سوویت یونین اور چین کا سوشلزم کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے یہ تباہی آئی کہ یہ سسٹم اندر سے تباہ ہو گیا خود پاکستان میں جس طرح سوسائٹی آرگنائز ہے اس میں خامیاں ہیں۔ اس وقت اوکاڑہ میں کسانوں کی تحریک چل

رہی ہے چار عام کارکن جو مجھ سے اسلام آباد میں ملے انہوں نے کہا کہ ہم مزاحمت کر رہے ہیں کسانوں کو مرنے نہیں دیں گے۔ مجھے ان لوگوں نے بتایا کہ رینجرز کے جنرل چٹھہ نے ان سے کہا اس ملک میں کوئی قانون نہیں ہے۔ صرف وردی قانون ہے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ القاعدہ اور مسلم بنیاد پرست جس طرح امریکہ کے خلاف مہم چلا رہے ہیں یہ صحیح ہے۔ انہوں نے کہا میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح سامراج کو شکست دی جائے گی امریکی شہریوں کو ہلاک کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ سوال جواب کا سیشن ختم ہوا تو طارق علی کو اس کے مداحوں نے گھیر لیا۔ جو ان سے ان کی کتاب پر آٹوگراف لے رہے تھے اس دوران کراچی کی ایک خاتون وکیل نے جو اپنی جوانی کے زمانہ میں روسی سفارتخانہ میں کام کر چکی تھیں ان کو گھیر کر پوچھا کہ آپ پاکستان کے ہمیشہ سے خلاف ہیں اب بھی آپ نے مخالفت کی ہے طارق علی مسکرا کر جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے مگر انہوں نے یہ پیشکش تھینک یو، کہہ کر مسترد کر دی کہ آپ پاکستان واپس آ کر عوام کی قیادت کیوں نہیں کرتے طارق علی نے سارے سوالوں کے جوابات دیئے مگر یہ سوال ان کو لاجواب کر گیا تھا۔

طارق علی کی طرف سے متحدہ مجلس عمل کی حمایت حیران کن تھی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ عراق پر امریکہ کی جارحیت کے خلاف صرف متحدہ مجلس عمل نے پاکستان میں احتجاج کیا باقی جماعتیں سوتی رہیں نہ بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی نے کچھ کیا نہ نواز شریف کی مسلم لیگ نے صرف متحدہ مجلس عمل آگے آئی طارق علی کے ان ریمارکس سے وہ انقلابی مایوس ہو گئے جو سوچ رہے تھے کہ انقلابی رہنما مجلس عمل پر برس پڑیں گے اور اسے بے نظیر بھٹو کی طرح اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار قرار دیں گے۔ طارق علی نے خبردار کیا کہ عراقی عوام کی مزاحمت سے جو تحریک شروع ہوگی وہی دنیا میں انقلاب برپا کرے گی یہ وارننگ بروقت ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ جو حکومتیں امریکہ کا ساتھ دے رہی ہیں اس انقلاب میں ایک روز بہہ جائیں گی۔

کسی کا مخالف نہیں صرف جمہوریت مانگتا ہوں

بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان سے ملاقات

بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان اپنے روایتی حقہ کے کش لے رہے تھے سامنے میز پر اخبار پڑا تھا جس میں صدر جنرل پرویز مشرف کا نیوز ویک والا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ نوابزادہ سے گفتگو کا آغاز اسی انٹرویو کے حوالے سے بات چیت سے ہوا۔

سوال: کیا پاکستان میں جمہوریت ناکام ہوگئی ہے؟

جواب: نہ جمہوریت ناکام ہوئی ہے نہ سیاستدان۔ کسی اسمبلی کو معیار پوری کرنے نہیں دی گئی، سیاستدانوں کو کیسے الزام دیا جا سکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں جنرل پرویز مشرف آخر چاہتے کیا ہیں۔ کیا بے اختیار ربراسٹمپ اسمبلی لانا چاہتے ہیں یہ تو یتیموں کا اجتماع ہوگا۔ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔

سوال: جنرل پرویز مشرف نے خود کہا ہے کہ وہ اگلے کئی سالوں تک پاکستان کے صدر رہیں گے؟

جواب: آئینی طریقہ تو یہ ہے کہ جنرل مشرف پہلے فوج سے ریٹائرمنٹ لیں دو سال انتظار کریں تاکہ قانونی تقاضہ پورا ہو سکے پھر وہ صدارتی امیدوار بن سکتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور چاروں صوبوں کی اسمبلیاں ان کو منتخب کریں اکثریت حاصل ہو جانے پر ہم ان کو صدر تسلیم کر لیں گے۔ اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

سوال: کچھ سیاستدان اور دانشور زمینی حقائق کی بات کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں فوج ایک حقیقت ہے اسے تسلیم کرلیا جائے؟

جواب: پھر جو آ کر بیٹھ جائے اس کا قبضہ تسلیم کرلیا جائے۔ ہمارے لاہور میں قبضہ گروپ ہوتا ہے کراچی میں بھی ہوگا۔ جس کی زمین پر چاہا قابض ہوگیا ایسے غاصبانہ قبضہ کو کون تسلیم کرے گا کوئی نہیں کرے گا۔ فوجی حکمران یہ نہیں سوچتے کہ یہی حالات ہوتے ہیں جن میں مایوس عناصر علیحدگی پسند 1940ء کی قرارداد اور کنفیڈریشن کے نعرے لگاتے ہیں۔ میں مانتا ہوں یہ نعرے پاگل پن پر مبنی ہیں مگر جمہوریت نہ ہو تو آپ کسی کی زبان کیسے روک سکتے ہیں۔

سوال: بحران کا کیا حل ہے۔ قوم کیسے اس بحران سے نکلے گی؟

جواب: ہمارا مطالبہ ہے کہ فوری طور پر الیکشن ہوں ایسے الیکشن کمیشن کی نگرانی میں ہوں جس پر قوم کو اعتماد ہو۔ الیکشن کمیشن آزاد اور خود مختار ہو۔ مرکز اور صوبوں میں نگراں حکومتیں قائم کی جائیں جو مختصر عرصہ تین ماہ کے لئے ہوں یہ حکومتیں الیکشن کرائیں الیکشن منصفانہ ہوں کسی قسم کی دھاندلی انتظامیہ نہ کر سکے جو حکومت آئے اسے مینڈیٹ پورا کرنے دیا جائے۔ یہی واحد راستہ ہے۔

سوال: آپ کا طویل سیاسی کیریئر ہے کیا آپ آج مطمئن ہیں کہ سیاستدان کے طور پر آپ نے جو کچھ کیا آپ کے لیے تسلی بخش ہے؟

جواب: میں مطمئن ہوں میرا بنیادی حق ہے اختلاف کرنے کا۔ یہ اختلاف ہے، دشمنی نہیں ہے۔ نواز شریف کے دور میں میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہوئی مگر جب نواز شریف کو طیارہ میں زنجیر کے ساتھ سیٹ سے باندھا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ ہم دنیا پر کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک سابق وزیر اعظم کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں تھا میری سیاست ذاتی سیاست نہیں ہے۔ میں قومی مفاد کو جمہوریت کے مفاد کو ترجیح دیتا ہوں مجھے احساس ہے یہ کہا جاتا ہے کہ ہر حکومت کے مخالف ہوں میں تو جمہوریت کا

حامی ہوں کسی کا مخالف نہیں ہوں۔

سوال: آپ کی طرح جو سینیئر پارلیمنٹرین ہیں ان کا کیا مستقبل سیاست میں ہوگا؟ آپ کیا دیکھتے ہیں؟

جواب: میں پیشین گوئی نہیں کرتا۔ بزرگ سیاستدان پیر صاحب پگاڑو پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ میں سیاسی کارکن ہوں۔ میرا ضمیر مطمئن رہتا ہے یہ جمہوریت ہے جس کی خاطر پاکستان کے عوام نے قربانیاں دی ہیں۔

سوال: بے نظیر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی اور نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ اے آر ڈی کے اتحاد میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کب وطن واپس آئیں گے؟

جواب: یہ فیصلہ خود ان کو کرنا ہے کہ کب واپس آئیں گے۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف پاکستان کے معزز شہری ہیں۔ وہ واپس جب آنا چاہیں آنے دیا جائے۔ یہ ان کا حق ہے۔ عوام نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان کو مینڈیٹ دیتے ہیں یا نہیں۔

سوال: آپ طویل عرصہ سے سیاست میں ہیں۔ بعض قوم پرست رہنما پنجاب کو سارے بحران کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ رجحان کب ختم ہوگا؟

جواب: پنجاب کا قصور یہ ہے کہ اس کے عوام پان اسلام ازم کی بات کرتے ہیں۔ پنجاب میں علامہ اقبال کی فکر اور قائداعظم کے پیغام کے اثرات گہرے ہیں۔ پنجاب کے عوام کی سوچ قومی ہے وفاقی ہے جمہوری ہے۔ جب دریائے سندھ کے خشک ہونے کا مسئلہ اٹھا تو میں نے ایک لیڈر سے بات کی تو اس نے کہا پنجاب میں پانی کی بہتات کی بات اس لیے کرتے ہیں کہ کون پنجاب جا کر دیکھے گا۔ المیہ یہ ہے کہ صوبائیت کے حامی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ حقائق کو چیک کرنے کا تصدیق کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ غریب اور سادہ لوح عوام جو سنتے ہیں اس پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

سوال: کیا آپ اتفاق کریں گے کہ ملک نہایت مشکل دور سے گزر رہا ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک پر تنہائی مسلط ہے۔ اصل مسئلہ فارن پالیسی میں

ناکامی ہے اس میں ہمارا اپنا قصور ہے۔ افغان پالیسی میں ''یوٹرن'' لے لیا گیا ہے۔ آغا شاہی نے انکشاف کیا ہے کہ جرمنی میں ایک امریکی سینیٹر نے جولائی 2001ء میں ان کو بتایا تھا کہ اکتوبر میں امریکہ افغانستان پر حملہ کردے گا اس وقت تک 11 ستمبر کا واقعہ نہیں ہوا تھا یہ فیصلہ پہلے ہوگیا تھا کہ افغانستان پر حملہ ہوگا۔

پاکستان کا اس صورتحال سے متاثر ہونا فطری ہے۔ پاکستان اس یلغار میں فرنٹ لائن اسٹیٹ بن گیا۔ ہر ملک کے لیے اپنی سیکورٹی کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے افغانستان کے ساتھ پاکستان کی سولہ سو میل لمبی سرحد ہے جنگ اور اس کے اثرات سے بچنے کی کوشش موثر اور مثبت انداز میں ہونا چاہیے تھی۔ آغا شاہی نے اگر کوئی بات کی تھی تو حکومت کا اس کا فی الفور نوٹس لینا چاہیے تھا۔ نہ نوٹس لیا گیا نہ کسی فورم پر آواز اٹھائی گئی افغان پالیسی میں یکایک تبدیلی کرلی ۔یوٹرن لے لیا۔ یہ تک بھول گئے کہ آپ نے افغانستان کو تسلیم کیا ہوا ہے خود سعودی عرب نے کہا کہ پاکستان کی ایما پر اس نے تسلیم کیا تھا۔ امریکہ سے کوئی شرط منوائے بغیر تعاون فراہم کردیا گیا۔ تاثر یہی رہا کہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نیوکلیئر پروگرام کو بچایا، کشمیر کے مسئلہ کے حل کی صورت نکل آئی ہے۔ پھر کیا ہوا جی یہ دیکھ لیں۔ میں نے جنرل پرویز مشرف سے ان کی بریفنگ میں صاف کہا کہ جہاں تک ہمارے نیوکلیئر پاور ہونے کا سوال ہے۔ نیوکلیئر ہتھیار جارحانہ ہتھیار نہیں ہے۔ یہ ایٹمی جنگ کو روکنے کا ڈیٹرنیٹ ہے۔ حالت اب یہ ہے کہ نیوکلیئر صلاحیت ہماری کیا حفاظت کرے گی ہم نیوکلیئر صلاحیت کی حفاظت کر رہے ہیں اسے چھپا رہے ہیں۔ یہ افسوسناک صوتحال ہے۔

سوال: آپ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین رہے ہیں مسئلہ کشمیر کا کیا بن رہا ہے ہر طرح کی قیاس آرئیاں ہورہی ہیں؟

جواب: ہم نے کیا حاصل کیا۔ جن کو فریڈم فائٹر کہتے تھے ان کو دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ امریکہ نے جس کی ہر بات مان رہے ہیں کشمیر پر ثالثی سے انکار کردیا ہے۔ یہ اقوام متحدہ

کے چارٹر میں ہے کہ مسئلہ مذاکرات سے حل نہ ہو تو تیسرے فریق کی ثالثی ہوگی بھارت اسے سرے سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بھارت اس صورتحال سے فائدہ اٹھا رہا ہے، نئی دہلی میں پارلیمنٹ پر حملہ کو جواز بنا کر سرحدوں پر جارحانہ انداز میں فوج لگا دی گئی بھارت نے اپنی فوجوں کو ریڈالرٹ کیا ہوا ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ اتنا کڑا وقت ہم پر نہیں آیا تھا۔ جنرل پرویز مشرف جتنے جتن کر رہے ہیں بھارت کوئی مثبت جواب نہیں دے رہا ہے۔ جنرل صاحب نے بیان دیا کہ واجپائی مذاکرات نہیں کرتے تو نہ کریں ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ مگر کھٹمنڈو میں خود واجپائی سے ہاتھ ملایا اس کی رعونت میں سرے سے کوئی کمی نہیں آئی پھر آپ نے بھارت اور امریکہ کے ایما پر لشکر طیبہ جیش محمد حرکت المجاہدین پر پابندی عائد کر دی ان کے فنڈز فریز کر دیئے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر بھارت کے الزام کا اعتراف کر لیا۔ پاکستان کا مستقل موقف تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں تحریک خالصتاً اندرونی ہے ہم صرف سیاسی اخلاقی اور سفارتی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم یہ بھول گئے کہ بھارتی غاصبانہ قبضہ کے خلاف کشمیری مثالی جدوجہد کر رہے ہیں۔ 80 ہزار شہید ہو گئے۔ کشمیری خواتین کی اجتماعی آبروریزی کی گئی، مساجد کے تقدس کو پامال کیا گیا۔

سوال: بعض لوگ لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد میں تبدیل کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کا اس پر کیا موقف ہے؟

جواب: لائن آف کنٹرول انٹرنیشنل بارڈر نہیں ہے۔ ہم اسے قوم کو تقسیم کرنے والی دیوار برلن کی طرح سمجھتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں بسنے والے ہر کشمیری کو حق ہے کہ اس تحریک میں حصہ لے سکے۔ کشمیریوں کو یہ حق دینا چاہئے کہ اپنی آزادانہ مرضی سے پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔ کشمیری پورے پاکستان میں ہیں۔ کراچی میں بھی سب جگہ ہیں۔ یہ کشمیری آزاد کشمیر اسمبلی کے لیے ووٹ دیتے ہیں۔ ان کا مقابلہ افغان مہاجرین کی طرح نہیں ہے۔ جو حق افغانوں کو نہیں دیا کشمیریوں کو دیا۔

سوال: جہاد کے بارے میں حکومت پاکستان نے جو موقف اختیار کیا ہے آپ کیا اس

سے مطمئن ہیں؟

جواب: میں ہرگز مطمئن نہیں ہوں۔ جہاد کے لفظ سے پسپائی اختیار کی جا رہی ہے اسے نفرت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جہاد دہشت گردی نہیں ہے۔ جہاد ظلم کے خلاف مدافعت کا مزاحمت کا نام ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔ جنرل صاحب نے اعتراف کرلیا ہے کہ لفظ جہاد سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جنرل صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت علامہ اقبال اور قائد اعظم کی بات کی ہے علامہ اقبال نے جہاد کے بارے میں یہ کہا ہے باطل کے خال و خد کی حفاظت کے واسطے مغرب زرہ میں ڈوب گیا باندھ کے کمر میں پوچھتا ہوں شیخ کلیسا نواز سے مغرب میں جنگ خیر ہے مشرق میں کیوں ہے شر۔

سوال: قومی سلامتی کی صورتحال پر آپ کا کیا موقف ہے ملک کو درپیش خطرات سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے؟

جواب: 1965ء میں قوم متحد تھی بھارت کو شکست دی 1971ء میں قوم تقسیم تھی ملک دو لخت ہوگیا فوج خود اپنا دفاع نہ کرسکی 90 ہزار جنگی قیدی بن کر بھارت چلے گئے۔ آج حالات کیا ہیں۔ مہنگائی ہے۔ بے روزگاری ہے۔ قوم میں اتحاد نہیں ہے۔ کوئی محفوظ نہیں ہے معاملہ خودکشیوں تک پہنچ گیا ہے ایسے حالات میں فوج کبھی تنہا ملک کا دفاع نہیں کرسکتی۔ قوم تقسیم در تقسیم ہوگئی ہے میں صاف بات کرتا ہوں پاکستان سیاسی عمل کے ذریعہ بنا تھا اس میں فوج کا کوئی کردار نہیں تھا جب بھی سیاسی عمل کو محدود کیا گیا قومی سلامتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

سوال: فوجی حکومت نے آئندہ انتخابات کے لیے جو آئینی پیکج دیا ہے اس کے کیا اثرات ہوں گے؟

جواب: حکومت تو اسمبلیوں کی جگہ یتیم خانے لانا چاہتی ہے ان یتیموں کا بھی انٹرویو لیا جائے گا داخلہ کے لیے، بے اختیار اسمبلیاں کیا کریں گی۔ پارلیمنٹ آزاد اور خودمختار نہ ہو تو بے کار ہے۔ ایک شخص سارے اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر رہا ہے اس سے کیا ملے

گا؟ یتیم خانہ ہی بنے گا میں نے تو کہا ہے کہ جنرل صاحب ایک لسٹ جاری کردیں کہ کن رہنماؤں کو اسمبلیوں میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ وزیر داخلہ علماء کو جاہل قرار دے چکے ہیں۔ اپنی قیادت لانے کا اختیار عوام کو ہے کسی فرد واحد کو یہ اختیار بھی نہیں دیا جاسکتا۔ یہی حال گریجویشن کی شرط کا ہے یہ کہیں نہیں ہے نہ بھارت میں ہے نہ امریکہ میں نہ برطانیہ میں پاکستان میں کیوں لگائی جارہی ہے۔

سوال: جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف میں آپ نے کیا فرق پایا ایک کے خلاف آپ نے تحریک چلائی دوسرے کے خلاف چلانے کی تیاری کررہے ہیں؟

جواب: مجھے سارے ملٹری ڈکٹیٹروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، فوجی طالع آزماؤں میں قدر مشترک سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ہے آمریت مسلط ہو تو اس سے جمہوری روایات دم توڑ جاتی ہیں۔ جمہوریت تو پودے کی طرح ہے اسے روز اکھاڑ کر دیکھیں کہ پودا بڑھ رہا ہے یا نہیں تو پودا کبھی پنپ نہیں سکے گا مرجھا کر مرجائے گا۔

سوال: اس ساری جدوجہد کا آپ کو کیا صلہ ملا؟ کیا حاصل ہوا؟

جواب: میرا کام کوشش کرنا ہے میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے اپنی زندگی عظیم مقصد کے لیے صرف کی ہے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ جمہوریت شہری آزادی بنیادی حقوق آزاد صحافت آزاد عدلیہ کلیسا، اس کے لیے میں نے جدوجہد کی ہے جدوجہد کررہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ میں مطمئن ہوں سکون سے سوتا ہوں میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میرے لیے یہی بڑا صلہ ہے۔

منافقت کی سیاست کب ختم ہوگی

سیاست میں سیاستدانوں کو کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں جس کو بھائی کہتے ہیں اس سے دشمنی کرنا پڑ جاتی ہے جس کا منہ دیکھنے کے روادار نہ ہوں اس کے ساتھ بیٹھنا پڑ جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو جب پہلی بار اقتدار میں آئیں اپنے پورے لشکر کے ساتھ عزیز آباد گئیں۔ آصف علی زرداری ان کے ساتھ تھے بے نظیر نے کہا میں بھائی کے گھر آئی ہوں۔ عزیز آباد میں آصف زرداری کو دولہا بھائی کہا گیا۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم میں 31 نکاتی معاہدہ طے پا گیا جس کو بعض نے فطری تو کچھ نے غیر فطری اتحاد قرار دیا۔ یہ اتحاد اختلافات کی نذر ہوگیا۔ مگر اس معاہدہ کی موجودگی میں ہی ایم کیو ایم نے آئی جے آئی سے اتحاد کرلیا۔ اس بار عزیز آباد جانے کی باری نواز شریف کی تھی۔ نواز شریف نے الطاف حسین کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کہا اس بھائی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ عزیز آباد میں نعروں کی گونج ختم نہیں ہونے پاتی تھی۔ پھر کیا ہوا۔ نواز شریف کی حکومت کے دور میں ہی ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن ہوا۔ پھر بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی پھر آپریشن ہوا۔ نواز شریف کا دور آیا تو ایم کیو ایم کو حکومت میں شامل کیا گیا حکیم سعید کے قتل کے پس منظر میں ایم کیو ایم حکومت سے الگ ہوگئی۔ اپوزیشن میں چلی گئی۔ حالات نے پلٹا کھایا تو مسلم لیگ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی تینوں اے آر ڈی کے اتحاد میں شامل ہیں۔ تینوں حریف حلیف بن گئے۔ خود پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ میں سخت اختلافات تھے۔ بے نظیر بھٹو نواز شریف کو

گوالمنڈی کا بندہ کہتی تھیں نواز شریف ان کو سیکورٹی رسک کہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سب سے کرپٹ قرار دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر حالات تبدیل ہوئے تو حکومت کے خلاف دونوں ایک ہو گئے۔ دونوں اے آر ڈی میں ساتھ ہیں مگر دل نہیں ملے ہیں ٹیپ اسکینڈل پیپلز پارٹی منظر عام پر لائی اس کے کردار مسلم لیگ کے وزراء اور جج تھے اس اسکینڈل سے دونوں اتحادی پارٹیوں میں پھر اختلافات پیدا ہو گئے۔ پنجاب اور سندھ کے وزراء اعظم کے ساتھ الگ الگ سلوک کا مسئلہ کھڑا ہوا پھر مصلحت کے باعث دب گیا اس اتحاد کو بزرگ سیاستداں نوابزادہ نصر اللہ ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں اس کے لیے کسی حد تک جانے کو تیار ہیں بلکہ بعض اوقات چلے جاتے ہیں جب نواز شریف اپنے خاندان کے ساتھ حکومت سے معاہدہ کر کے سعودی عرب چلے گئے تو نوابزادہ نصر اللہ نے برہمی کے عالم میں شکوہ کیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہو گیا۔ نواز شریف تاجر نکلے۔ ان کی بات سے لوگ سمجھے کہ بزرگ اتحادی سیاستداں کبھی نواز شریف کی شکل تک نہیں دیکھیں گے مگر نوابزادہ نصر اللہ کا غصہ رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ گیا اب انہوں نے نواز شریف کی تصویر کے نیچے بیٹھ کر اے آر ڈی کے اجلاس کی صدارت کی ہے۔ ان کے ایک طرف جاوید ہاشمی دوسری طرف امین فہیم بیٹھے تھے۔ یہی نوابزادہ نصر اللہ کی کامیابی ہے۔ روٹھے ہوئے اور ناراض اور ایک دوسرے کے مخالف سیاستدانوں کو ملا دیتے ہیں۔ پی این اے میں یہی کام کیا ایم آر ڈی میں یہی خدمت انجام دی جی ڈی اے میں یہی فرض پورا کیا اب اے آر ڈی میں کر رہے ہیں۔ ان سے ایک سیاسی اجتماع میں پوچھا گیا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں۔ ہر حکومت کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تو نوابزادہ نصر اللہ نے برہم ہو کر کہا میں کیا چاہتا ہوں۔ میں صرف جمہوریت چاہتا ہوں میرا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے نوابزادہ نصر اللہ ذوالفقار علی بھٹو سے اپنے اختلاف کے باوجود ان کی بیوہ بیگم نصرت بھٹو کے گھر 70 کلفٹن پہنچ گئے دوسرے رہنماؤں میں سردار شیر باز مزاری غوث بخش بزنجو اور معراج محمد خان شامل تھے۔ یہ سب سیاستداں پیپلز پارٹی کے سخت مخالف تھے۔ پھر پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ

کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پی پی پی جو اپنے اقتدار میں ان رہنماؤں کی نظر میں اچھی نہیں تھی اچھی ہوگئی۔ ایم آر ڈی کے سیاستداں جنرل ضیاء الحق کے خلاف متحد ہوئے تھے۔ یہی آئی جے آئی میں بے نظیر بھٹو کے خلاف متحد ہوگئے پھر جی ڈی اے میں نواز شریف کے خلاف ہوئے۔ نواز ہٹاؤ ملک بچاؤ، تحریک چلائی۔ جب نواز شریف ہٹا دیئے گئے تو یہی سیاستداں حکومت کے خلاف متحد ہو کر اے آر ڈی میں بیٹھ گئے۔ تحریک کی منظوری دی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی لیڈر شپ نے قوم سے اپنی زیادتیوں اور غلطیوں کی معافی مانگی۔ بیگم کلثوم نواز نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ ظلم ہوا ہے بے نظیر بھٹو نے کلثوم نواز کو مظلوم قرار دیا۔ پھر کلثوم نواز چلی گئیں تو بے نظیر بھٹو نے کہا جمہوریت کے متوالوں کے ساتھ دھوکہ ہوگیا۔ جیالے احتجاج کے عالم میں ماتم کرتے رہے۔ افسوس کرتے رہے کہ شریف فیملی ہاتھ سے نکل گئی۔ بے نظیر نے کہا لاہور کے لیے قانون الگ ہے۔ لاڑکانہ کے لیے الگ ہے۔ یہ احتجاج لمحاتی ثابت ہوا۔ بے نظیر کے لیے شریف فیملی کا ساتھ چھوڑنا آسان نہیں تھا۔

اب آر ڈی اے کے پلیٹ فارم سے پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ موجودہ حکمرانوں کے خلاف تحریک چلانا چاہتی ہیں سارے اختلافات ماضی اور حال کے پس پشت ڈال دیئے گئے۔ جب سیاستداں اس طرح متحد ہوتے ہیں لوگ کہتے ہیں یہ اپنے مفاد میں ایک ہوگئے ہیں۔ یہ بھی تاریخ ہے کہ سیاستداں غیر منتخب حکومت میں متحد رہتے ہیں منتخب حکومت آتے ہی منتشر ہوجاتے ہیں۔ اس میں کوئی رولز ریگولیشنز نہیں ہیں۔ اس وقت اے آر ڈی میں جو جماعتیں ہیں ایک دوسرے کے نجی طور پر خلاف ہیں مگر اے آر ڈی کے اجلاسوں میں ان کے رہنما ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر فوٹو کھنچواتے ہیں۔ تحریک چلانے کے اعلانات کرتے ہیں گھروں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے خلاف پلاننگ کرتے ہیں ان کو احساس ہے ان کا اتحاد عارضی ہے وقتی ہے محض حکومت کو پریشان کرنے کے لیے ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو سیاستداں موجودہ حکومت کے خلاف ہیں اس کو قانونی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ حکومت کے سربراہ سے ملنے کے لیے کیوں بے چین رہتے ہیں۔ اسلا

آباد سے ایک کال پر سب ملنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے خود اعلان کیا کہ جنرلوں سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔ مخدوم امین فہیم نے مذاکرات کیے بات نہیں بنی تو حکومت کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ یہ طے ہے کہ اے آر ڈی اس حکومت کو تحریک سے ہٹانے کی پوزیشن میں نہیں مگر روز یہی اعلان کیا جاتا ہے کہ حکومت کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ بے نظیر بھٹو نواز دور میں یہی کہتی تھیں کہ نواز شریف کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے چند دن چند سال میں بدل گئے جب ایک نجی تقریب میں ایک جیالے نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ آپ کہتی ہیں نواز شریف جا رہے ہیں وہ تو نہیں جا رہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ اگر یہ نہ کہوں تو وڈیرے ایئرپورٹ پر آنا چھوڑ دیں گے۔ سیاستداں کبھی سچ بولتے ہیں۔

یہ سچ بولنے کا ڈر ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے سیاستداں اپنی یادداشتیں لکھنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں سچ لکھیں گے تو وہ بھی ان کے بارے میں سچ لکھنا شروع کر دیں گے۔ اس لیے باہمی مفاہمت برقرار رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سردار شیر باز مزاری اور پروفیسر غفور احمد سمیت چند سیاستداں ہی حقائق لکھنے کی ہمت کر سکتے ہیں باقی میں حوصلہ نہیں ہے۔ بنیادی طور پر ملک میں جھوٹ کی سیاست ہے ایک بار بیگم نصرت بھٹو کراچی سے پی آئی اے کی پرواز پر لاڑکانہ جا رہی تھیں ایک اخبار نویس ایک کتاب لے کر ان کی طرف لپکے۔ بیگم صاحبہ اپنے دستخط کر دیں۔ انہوں نے کتاب کا ٹائٹل دیکھ کر کہا یہ وہی رائٹر ہے جس نے بھٹو کے خلاف کتاب لکھی تھی۔ اب ان کے حق میں لکھی ہے۔ انہوں نے دستخط کیے اور طیارہ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ شاید بیگم بھٹو ہی سچی سیاستداں ہیں مگر وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہیں۔

میری شناخت بھٹو ہے

غنوئی بھٹو سے انٹرویو

70 کلفٹن کے ڈرائنگ روم میں دیواروں پر تلواریں لٹکی ہوئی تھیں یا بھٹو فیملی کے مردوں ذوالفقار، مرتضیٰ اور شاہنواز کی پینٹنگز، بے نظیر بھٹو کی تصویر غائب تھی جو مرتضیٰ بھٹو کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ غنوئی بھٹو سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے بے نظیر کے 70 کلفٹن میں داخلہ پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ میں نے کوئی پابندی نہیں لگائی بے نظیر ایک مہذب مہمان کی طرح آ سکتی ہیں مگر مہمان جب میزبان کی سر عام توہین کرے گا تو کون میزبان برداشت کرے گا۔ ویسے بے نظیر تو پاکستان آنے کو تیار نہیں 70 کلفٹن کیا آئیں گی ان کو پتہ ہے کہ آئیں تو سیدھی جیل جائیں گی۔

سوال: آپ کا بیگم نصرت بھٹو سے کوئی رابطہ ہے جو عرصہ سے دبئی مین بیمار ہیں؟

جواب: ہمارا رابطہ نہیں ہے ہمیں نہیں پتہ وہ کس حال میں ہیں کیسی ہیں، بیگم صاحبہ مرتضیٰ کے بچوں فاطمہ اور ذوالفقار کو ملنے کو ترستی ہوں گی وہ ان کو دیکھ لیں تو ان کی حالت بہتر ہو جائے۔

سوال: فاطمہ ان دنوں کیا کر رہی ہے وہ تو انگریزی کی اچھی شاعرہ ہے؟

جواب: فاطمہ امریکہ واپس چلی گئی ہے جہاں یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھ رہی ہے اس نے 99 فیصد نمبر امتحان میں لیے ہیں۔

سوال: ذوالفقار جونیئر کے کیا مشاغل ہیں؟

جواب: وہ ابھی اسکول میں ہے۔ جانوروں سے بڑی محبت کرتا ہے جانوروں کو کوئی ستائے یا مارے اسے برداشت نہیں ہوتا ہے۔ تاریخ اور فکشن سے شوق ہے ہیری پوٹر پڑھتا ہے سینکڑوں ڈرائنگز بناتا ہے میں ساری سنبھال کر رکھتی ہوں میں ماں ہوں یہ بچے میرا اثاثہ ہیں۔

سوال: پاکستان میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو انصاف نہیں ملا؟

جواب: انصاف تو کہیں نہیں ہے۔ مگر میرا فرض ہے کہ پوری کوشش کروں کہ مرتضیٰ کیس کے مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچایا جائے۔ میں مایوس نہیں ہوں، ناامید نہیں ہوں، میں نے انصاف کی حصول کی جدوجہد ترک نہیں کی ہے نہ کروں گی نہ عوام کریں گے۔ صرف یہ میرا کیس نہیں ہے ساتھ دوسرے کیس بھی ہیں ایک (حق نواز ایس ایچ او کلفٹن جو پراسرار طور پر ہلاک ہوئے) کا کیس بھی ہے۔ ہزاروں کیس ہیں جو پولیس نے مس ہینڈل کیے ہیں۔ ہماری سوسائٹی کا کیا فرض ہے؟ بھٹو کیس ہے، شاہنواز کیس ہے، کینیڈی کیس ہے یہ کیس غائب تو نہیں ہوئے۔ چلی میں کیا ہوا۔ پنوشے پر مقدمہ چلا ہے ہیگ میں ملاسووچ کا ٹرائل ہو رہا ہے۔ ظلم کو ہوا میں نہیں اڑا سکتے۔ ایسی چیز کبھی غائب نہیں ہوجاتی۔ امریکہ کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

سوال: بھٹو فیملی کے مردوں کے اس انجام سے آپ ڈرتی نہیں کیا بچوں فاطمہ اور ذوالفقار کو سیاست میں لائیں گی؟

جواب: میں ان کو پاکستان کی سیاست میں ضرور لاؤں گی جو میری ذمہ داری ہے پوری کروں گی۔ یہ پاکستان کے عوام کی طرف سے میرا فرض ہے جسے میں نے نبھانا ہے۔ میرا بیٹا، بھٹو جونیئر ہی بھٹو کی سیاسی وراثت کا اصل حقدار ہے۔

سوال: خود آپ کے والدین شروع میں آپ کی سلامتی کے بارے میں بہت فکر مند تھے آپ کے یہاں رہنے کے حق میں نہیں تھے؟

جواب: خطرہ تو ہے، زندگی میں خطرات ہیں۔ ہم نے لبنان میں طویل خانہ جنگی دیکھی ہے، ہمارے لیے بہت ساری چیزیں نئی نہیں ہیں۔ مگر بھٹو میرا تشخص ہے میری شناخت ہے میں یہاں رہتی ہوں میرے بچے ہیں۔ بھٹو لبنانی شامی یا امریکی نہیں ہیں پاکستانی ہیں ان کا مرنا جینا پاکستان میں ہم بھٹو ہیں۔ حالات کٹھن ہیں مگر مقابلہ کر رہے ہیں۔

سوال: پاکستان اس وقت اندرونی اور بیرونی خطرات سے گھرا ہوا ہے پاکستان نیشنل کانفرنس کی سربراہ اور پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کی چیئرپرسن کی حیثیت سے آپ کیا سمجھتی ہیں بحران سے کیسے نکلا جائے؟

جواب: ملک کی سیاسی صورتحال گھمبیر ہے، غیر یقینی ہے مگر اس میں سیاست کے لیے بڑا اسکوپ ہے ماضی میں سیاست پس منظر میں چلی گئی تھی اب آگے آ رہی ہے۔ سیاستدانوں کو محنت کرنا پڑے گی۔ نواز شریف اور بے نظیر ناکام ہوئے ہیں لیڈرشپ کا خلا ہے یہ پورا ہوگا۔ متبادل لیڈرشپ ہے، عوام اسے آگے لائیں گے۔ یہ ہوگا جو خود کو سیاستدان کہتے ہیں ان کی آزمائش ہے۔ تبدیلی آئے مگر کیا حکومت بدل جائے، یہ کافی ہے۔ مگر میں پوچھتی ہوں کیا تشدد کی راہ اختیار کرنا صحیح ہے یہ ٹھیک نہیں، تشدد سے بہت نقصان ہوا ہے۔ اب حالات بدل گئے ہیں اس لیے میں کہتی ہوں صرف سیاستدان نہیں دانشور وکیل صحافی، سوشل ایلیٹ سب آگے آئیں اپنا کردار ادا کریں۔ عام آدمی تبدیلی کے لیے تیار ہے۔ اس کی رہنمائی کرنا ہے ون مین شو انفرادی لیڈرشپ کا وقت گزر گیا ہے۔ اجتماعی لیڈرشپ کا دور ہے۔

سوال: بے نظیر اور نواز شریف کا کھیل ختم ہوگیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں متبادل لیڈرشپ آ رہی ہے عوام دونوں سے عاجز ہیں مگر ہم جلسے کرنا چاہتے ہیں تو پابندیاں ہیں۔ صوبوں میں گیپ ہے یہ کیسے ختم ہوگا۔ موجودہ حکومت نے اس کو کم نہیں کیا۔ قابو نہیں پایا اس خلیج کو خود حکومت وسیع کر رہی ہے۔ صوبائی خودمختاری کا مسئلہ ہے اسے حل کرنا پڑے گا۔ جو جس کا حق بنتا ہے اسے دے دو، اس طرح صوبے

ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کریں گے اسی سے قومی یکجہتی بڑھے گی ملک مضبوط ہوگا۔

سوال: آپ کیا چاہتی ہیں کیا ہونا چاہیے صوبوں کو مطمئن کرنے کے لیے؟

جواب: میں نہیں کہتی کہ مشترکہ لسٹ ختم کردی جائے۔ مگر صوبائی لسٹ کو بڑھایا جائے۔ صوبوں کو مالی خودمختاری حاصل ہونا چاہیے۔ سیاسی آزادی اقتصادی آزادی ہونا چاہیے۔ یہ ضروری ہے مگر ہم ملک کا بھی سوچتے ہیں ملک بھی ہے۔ جب جنرل سیلز ٹیکس کے خلاف ہڑتال کی گئی ہم نے مخالفت کی تاجر کیوں ٹیکس نہ دیں آخر اس کا کیا جواز ہے۔ آخر ٹیکس کلچر کب آئے گا۔ کیسے آئے گا۔ حکومت کو اپنے اخراجات میں کمی کرنا ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔

سوال: بھارت کے ساتھ تعلقات کیسے معمول پر لائے جائیں، حکومت کیا کرے؟

جواب: صدر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کے معاملہ میں جو کیا مجھے اس پر فخر ہوا ہے صدر آگرہ گئے، میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ وہ دورہ ناکام تھا۔ بہت کچھ حاصل ہوا تھا۔ پاکستانی صدر نے بھارتی عوام سے بات کی اپنا پیغام پہنچا دیا کسی منتخب صدر نے نہیں کیا اس سے بھارتی صحافیوں اور دانشوروں میں اچھا تاثر قائم ہوا۔ پھر کھٹمنڈو میں واجپائی سے خود جا کر ہاتھ ملایا، اس طرح کے اقدامات سے تعلقات کو ٹھیک کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈرامائی لمحوں میں کبھی معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ شملہ میں جب بھٹو صاحب گئے اندرا گاندھی سے الوداعی ملاقات نے مذاکرات کو بچا لیا۔ کوشش کرنا چاہئے۔ اصل بات یہ ہے کہ بات چیت بحال ہو، ٹرین روڈ سروس بحال ہو۔ عوام کا آپس میں رابطہ ہو، حالات بہتر ہوں گے۔ 13 دسمبر 2001ء کے واقعات کے بعد بھارت نے منفی اقدام کیے اس سے اچھا تاثر نہیں ہوا ہے۔

سوال: کیا آپ کو امید ہے کہ مستقبل میں پاکستان اور بھارت کے مذاکرات سے دونوں ملکوں میں مفاہمت ہوگی۔ جنگ کے خطرات ختم ہو سکیں گے؟

جواب: دیکھیں کور ایشو کشمیر ہے بھارتیوں کو بات چیت پر کنونس کرنا ہے۔ مگر ہمیں مذاکرات کے اکا دکا دور سے بہت زیادہ توقعات نہیں کرنا چاہئیں۔ پھر مذاکرات ہو کر

معاہدہ ہو بھی جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اگر نیک نیتی نہ ہو خلوص نہ ہو۔ اسرائیل اور فلسطین میں معاہدہ ہوا تھا۔ یاسر عرفات کے ساتھ دیکھ لیں کیا ہو رہا ہے کہاں گیا معاہدہ؟ جب تک ذہن تبدیل نہ ہوں بات نہیں بنے گی۔ یہ کیا کہ کسی کو مستقل دشمن سمجھ لیا۔ ایسے خول سے نکلنا ہوگا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کو دشمن سمجھے جا رہے ہیں۔ دنیا آگے جا رہی ہے۔ اس لیے میں کہتی ہوں مذاکرات ہونے چاہئے۔ یہی واحد راستہ ہے یہی آپشن ہے۔ یہ دیکھ لیں کبھی بیوروکریسی بھی تصفیہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔ بہت سے لوگ نہیں چاہتے کہ تصفیہ ہو۔ ان کو ناکام بنانا ضروری ہے۔

سوال: کیا آپ جنرل پرویز مشرف کو آئندہ معیاد کے لیے صدر تسلیم کرنے کو تیار ہیں؟

جواب: ایشو یہ نہیں ہے ان کو صدر مان کر کمپرومائز کرنے کے لیے کون تیار نہیں ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ صدر کون ہو یا رہے۔ بے نظیر تو فاروق لغاری کو اپنا صدر سمجھ کر لائی تھیں پھر کیا ہوا؟ اس نے ان کو نکال دیا۔ مسئلہ صدارت کا نہیں ہے جمہوریت کا ہے ملک کو صحیح سمت میں لے جانے کا ہے۔

سوال: کیا آپ ایسے سیاسی اتحادوں کو اوائڈ کرتی ہیں جن میں بے نظیر بھٹو شامل ہیں؟

جواب: بات کسی کی ذات کی نہیں۔ سیاسی ایجنڈہ کی ہے ملک کو بحران سے نکالنے کی ہے۔ پاکستان نیشنل کانفرنس کا چھ نکاتی ایجنڈہ بالکل سیاسی ہے مسائل سیاسی ہیں۔ اب تو ضلعی حکومتیں موجود ہیں آئندہ الیکشن میں پانی بجلی گیس سڑک مسجد اسٹریٹ سے آگے کی بات کرنا پڑے گی قانون سازی کے لیے اسمبلیاں بنتی ہیں۔ خالی مسائل کی بات ہو تو ضلعی حکومتیں مسائل حل کر رہی ہیں پھر اسمبلیوں کی کیوں ضرورت پیش آئے گی۔

غنویٰ بھٹو نے اپنی بات ختم کی تو میں نے پوچھا آپ صدر مشرف سے ون ٹو ون ملی ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں ملی۔ صدر نے جو سیاستدانوں کی کانفرنس بلائی تھی اس میں شریک تھی۔ میری تقریر کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی نے میری تعریف کی مجھ سے عربی میں

گفتگو کی میں بہت متاثر تھی۔

70 کلفٹن کے در و دیوار پر خاموشی طاری تھی پہرے برقرار تھے سامنے مرتضیٰ بھٹو کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ بھٹو فیملی کے اس گھر نے سیاست اقتدار سانحہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اس کے در و دیوار کے اندر انتقام کی خاموش گونج ضرور سنائی دیتی ہے۔

کیا سیاستداں کرپٹ ہیں؟

فلپائن کے اسٹراڈا انڈونیشیا کے عبدالرحمٰن واحد بھارت کی جے للیتا پاکستان کی بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی جوڑی میں کیا قدر مشترک ہے؟ یہ ہمارے سیاستدان ہیں۔ ان پر کرپشن کے الزامات ہیں بعض کو سزا تک ہو چکی ہے مگر یہ سب اپنے عوام میں بے پناہ مقبول ہیں یہ بڑی عجیب بات ہے جس پر ان کے مخالفین حیران ہوتے ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف آج الیکشن لڑیں تو کامیاب بھاری اکثریت سے ہو جائیں گے دونوں تیسری بار اپنی حکومت تک بنا سکتے ہیں۔ عوام جانتے ہیں یہ فرشتے نہیں ہیں کرپشن میں باقاعدہ ملوث رہے ہیں۔ بے نظیر بھٹو خوش قسمت ہیں کہ نواز حکومت نے بھونڈے انداز میں کیس چلایا ایک جج کو اتنا بے نظیر اور زرداری کے پیچھے لگا دیا کہ سپریم کورٹ تک کو کہنا پڑ گیا کہ اس کیس میں تعصب اوپر تیرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جج کے بارے میں فیصلہ میں کہا گیا کہ کیس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوا حالانکہ ان کے حامی تک اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بھی کورٹ سے آسانی سے سزا ہو سکتی تھی ایک جج کے ذریعہ اتنے جتن کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی معاملہ نواز شریف کا تھا۔ حکومت طیارہ کیس کے پیچھے پڑ گئی۔ اس سے نواز شریف کو فائدہ ہوا ان کو معلوم تھا کہ حکومت سے بات چیت ہو رہی ہے۔ ہیلی کاپٹر کیس میں اپیل تک نہیں کی اس میں کسی کو شک نہیں کہ نواز شریف نے اپنے عہدہ کا غلط استعمال کیا۔ اپنے دوستوں کے اس مشورہ کو نظر انداز کیا کہ

اقتدار میں رہیں تو اپنے کاروبار کو الگ رکھیں۔ نواز شریف نے اس مشورہ کو نہیں مانا۔ خود وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا اپنے دوستوں کو بھی اس کی اجازت دی اس سے ان کو نقصان ہوا۔ یہ نقصان مالی طور پر ہوا سیاسی طور پر نہیں ہوا۔ نواز شریف آج بھی لوگوں میں مقبول ہیں۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ لوگ کرپٹ سیاستدانوں کو کیوں پسند کرتے ہیں۔ کرپٹ سیاستدان کی یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ خود بھی فائدے اٹھاتا ہے اپنے حامیوں کو بھی فائدے پہنچاتا ہے اس سے ایک بڑا سرکل بن جاتا ہے کرپٹ آدمی بااثر ہوتا ہے انتظامیہ اور پولیس اس کی بات سنتی ہے بیوروکریٹس بینک ایگزیکٹیوز اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ عام لوگ اس بندہ کو پسند کریں گے جو پلاٹ دلا سکے نوکری فراہم کرے قرضہ کی منظوری کرا دے۔ یا اس کو کریں گے جو نہ خود کوئی فائدہ اٹھائے نہ کسی کو اٹھانے دے۔ یہ کرپشن کا کلچر ہے اس سے جو باہر ہے بیکار ہے غیر موثر ہے ایسے سیاستدان ہیں جو فخر سے کہتے ہیں کسی کو نوکری نہیں دلائی نہ کسی کا کام کرایا ہے یہ لوگ گھروں میں تنہا بیٹھے اپنے پرانے انٹرویوز پڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس اخبار نویس تک نہیں پھٹکتے۔ جو فائدے پہنچا سکتے ہیں ان کے پاس ہجوم نظر آئیں گے خواہ اقتدار میں ہوں یا نہ ہوں۔ اب بھی بیشمار لوگوں نے نواز شریف کو چھوڑا ہے نہ بے نظیر کو۔ فوجی حکمران یہ اعلان کر کے تھک گئے کہ ان کو آنے نہیں دیں گے۔ کوئی اس پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو بندہ جائز ناجائز طریقہ سے سرمایہ اور پراپرٹی بناتا ہے اس کے حامی کہتے ہیں اس کے کاروبار میں برکت ہے مخالفین کہتے ہیں اس نے غلط طریقے اختیار کیے۔ مگر کوئی سنتا نہیں ہے۔ سرمایہ سے انسان میں بڑا اعتماد آجاتا ہے نواز شریف کو طیارہ کیس میں جب عمر قید کی سزا سنائی گئی عدالت کے احاطہ میں جب بیگم کلثوم نواز اور سائرہ حسین سے اخبار نویسوں نے پوچھا کہ آپ کی پراپرٹی ضبط کر لی گئی ہے تو انہوں نے کہا بھٹو نے ہماری پراپرٹی ضبط کی تھی سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اللہ نے

اتنا دیا کہ ہم سنبھال نہیں سکتے۔ اللہ اور دے گا۔ اس نوعیت کی بات بے نظیر بھٹو نے کی جب حکومت میں تھیں سرے اسکینڈل منظر عام پر آیا تو پہلے انکار کیا پھر کہا لندن کے اخبار پر مقدمہ کروں گی آخر میں یہ کہا کہ میں جدی پشتی جائداد والی ہوں۔ اپنے پیسے سے پراپرٹی لی ہے۔ یہی شریف فیملی نے کہا لندن کے فلیٹوں کے وجود سے پہلے انکار کیا۔ پھر اقرار اس سارے معاملے میں حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ پاکستان کے یہ سیاستدان اپنے حامیوں کی حمایت سے محروم نہیں ہوئے۔ لوگ حکومت پر بھروسہ نہیں کرتے کس طرح کریں۔ نواز دور میں سیف الرحمٰن، شرلاک ہومز بنے ہوئے تھے۔ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے کرپشن کو روز بے نقاب کر رہے تھے کروڑوں ڈالران کے خلاف ثبوت جمع کرنے پر خرچ کر دیئے سزا تک ہوگئی۔ پھر کیا ہوا، سپریم کورٹ نے نواز حکومت ختم ہونے پر ری ٹرائل کا حکم دیا۔ خود سیف الرحمٰن نے اب آصف زرداری کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لی۔ لوگ پوچھتے ہیں سیف الرحمٰن اب صحیح ہیں یا اپنی حکومت میں صحیح تھے سچ کب بول رہے ہیں۔ اسی معاملہ میں نقصان سچائی کا ہوا۔ موجودہ حکمرانوں نے وہی کیا جو بے نظیر اور نواز کے دور میں ہوا۔

یہ حکومت جب آئی شروع میں یوں لگا کہ کوئی کرپٹ سیاستدان تاجر صنعتکار بیوروکریٹ نہیں بچے گا۔ بہت سے پکڑے گئے۔ پورے ملک میں خوف و ہراس تھا عام لوگ کہتے تھے کرپٹ بندوں کی شامت آگئی اب سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ فوجی حکمران ڈنڈا سنبھال چکے ہیں۔ فوجی حکمران واشنگٹن لندن اور پیرس کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں کے انویسٹرز کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ غریب نادہندہ کی نوٹس کے بغیر بجلی کٹنے لگی دولتمند نادہندہ کو سالوں کی ریلیف ملنے لگی۔ لوگوں کا اس احتساب پر سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ پاکستان میں کسی بندہ کو خریدنا مشکل نہیں ہے۔ ہر بندہ کی قیمت مقرر ہے ہر ایک کا پرائس ٹیگ ہے۔ جہاں جج تک اپنی تاریخ پیدائش میں گڑبڑ کریں گے پلاٹوں کے لیے جھوٹے حلف نامے داخل کریں گے وہاں کسی بڑے آدمی کا کیسے محاسبہ ہوگا ریلوے کالونی کے باشندوں اور اورنگی میں بجلی کے کنڈے لگانے والوں کا ہی محاسبہ ہوگا۔

یہ روپیہ کا سائیکل ہے جو کبھی رکتا نہیں ہے۔ نواز شریف نے عدالت میں کہا میرا پیشہ سیاست ہے۔ آصف زرداری نے بے نظیر کی حکومت میں کہا پیسہ بنانا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جب بڑے لوگ یہ باتیں کریں گے تو عام آدمی کو کیسے روکا جا سکتا ہے کراچی میں محکمہ تعلیم کے ایک افسر کا قاصد ہر ملاقات کے ایک سو روپے وصول کرتا ہے یہ اس کا ریٹ ہے سب نے قبول کر لیا ہے خود افسر کے یہ معاملہ نوٹس میں ہے انٹی کرپشن کمیٹی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اس طبقہ کے محاسبہ کے لیے جو کلرکوں چپڑاسیوں جونیئر افسروں پر مشتمل ہے، کیا کرے گی۔ یہ کیسا محاسبہ ہے جس میں اربوں روپے کے قرضے منظور جاری اور معاف کرنے والے کسی بینک افسر کو سزا نہیں ہوتی۔ یہ کیسا احتساب ہے اور نگرانی ہے جس میں آفتاب شیر پاؤ، لیاقت جتوئی اس دور میں فرار ہو گئے۔ سلمان فاروقی اور سراج سلیم شمس الدین حکام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چلے گئے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں فوجی افسروں کے چودہ چودہ پلاٹوں کی فہرست شائع ہو گئی کس کا کیسے صحیح محاسبہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت جن کو کرپٹ کہتی ہے عوام میں ہیرو کہے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اسے جمہوریت کا تحفہ کہتے ہیں **1985**ء سے جو پارلیمانی جمہوریت کا نظام آیا ملک کو قلاش کر گیا۔ زر مبادلہ کے ذخائر ختم ہو گئے ہزاروں کارخانے بند ہو گئے۔ سرکاری اداروں کے پاس تنخواہیں دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں ترقیاتی ادارے ترقیاتی کام بند کر کے اپنے ملازمین کی تنخواہوں کے لیے وسائل ڈھونڈ رہے ہیں۔ حکمراں کہتے ہیں بے نظیر اور نواز شریف نے ملک کا یہ حشر کیا ہے ان کو آنے نہیں دیں گے۔ عوام کہتے ہیں انہی کو لائیں گے۔ بے نظیر اور نواز شریف اے آر ڈی کے الائنس میں متحد ہیں دونوں نے ساتھ تحریک چلانے کا ارادہ کیا ہے۔ دونوں کہتے ہیں عوام کی طاقت سے آئیں گے۔ حکومت جسے جتنا کرپٹ کہتی ہے عوام میں اتنا ہی مقبول ہے یہی ان کی سیاست کی کامیابی ہے۔

سیاستدانوں کے سموسے

استاد کی پلیٹ میں دو سموسے رکھے تھے دونوں پر کیچ اَپ ڈال رہے تھے۔ استاد نے سموسے کھانا شروع کیے تو میں دو مہمانوں کی اوٹ میں ہوگیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے استاد اس طرح کھاتے اچھے نہیں لگے کیمسٹری کے ٹیچر تھے بہت ظالم تھے کوئی جرنل میں انسانی ہاتھ تک بنادے تو خفا ہو جاتے تھے۔ ہاتھ کو بڑھا کر پورا انسان بنا دو پھر لیبارٹری بنا کر اس میں مجھے دروازہ سے داخل ہوتا ہوا دکھا دو۔ وقت کتنی تیزی سے گذرتا ہے۔ اسکول کے بعد کالج پھر یونیورسٹی استاد سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر دیکھا تو ایک تعلیمی کانفرنس میں نظر آئے۔ سوچا جا کر سلام کروں بات کروں پھر رک گیا۔ سموسے رکاوٹ بن گئے۔ استاد بڑے انہماک سے کھا رہے تھے۔ میں نے بھی پلیٹ اٹھا کر سموسوں سے بھر لی تھی۔ اخبار نویسوں کو ایڈوانٹج ہے ہر پروگرام میں اسنیکس کا انتظام میزبان کرتے ہیں خواہ عورت فاؤنڈیشن کا سیمینار ہو یا کسی اسپتال کی تقریب یا کسی سیاستداں کی پریس کانفرنس سموسے کے بغیر شاید ہی کوئی پروگرام ہوتا ہوگا۔ بلاول ہاؤس کا کچن بے نظیر بھٹو کی غیر موجودگی کے باعث بند ہے اس لیے سموسے بازار سے منگوائے جاتے ہیں۔ جتوئی ہاؤس میں بنوائے جاتے ہیں۔ نائن زیرو، لانڈھی، ادارہ نورحق اور رضا لائبریری میں سموسے لازمی طور پر ہوتے یں۔ نصرت مرزا کی آل پارٹیز کانفرنس سموسے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ جلیبی اور دہی بڑے بھی ہوتے ہیں مقررین انہی کے درمیان خطاب کرتے رہتے ہیں۔ مشتاق مرزا

بھی سیاستدانوں اور اخبار نویسوں کے لیے سموسے کا انتظام کرتے ہیں اس طرح سموسے پکوڑوں پر چھا گئے ہیں۔ پکوڑے رمضان المبارک میں ہی نظر آتے ہیں البتہ جتوئی ہاؤس اور بلاول ہاؤس میں پکوڑے ضرور بنتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کو پسند ہیں۔ پکوڑوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام آباد میں اس وقت کے آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کی اسلام آباد کی رہائش گاہ میں جا کر پکوڑے کھائے تو بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے کی راہ ہموار ہوئی۔ وہ شاید اب بھی پکوڑے تلنے کو تیار ہیں مگر جنرل مشرف کو شاید اتنا شوق نہیں ہے۔ جنرل ضیاء الحق کو ایک بار ایک تقریب میں سموسے اتنے پسند آئے کہ خود میزبان سے فرمائش کی کہ سموسے باندھ کر دے دیں۔ انہوں نے کہا ''میں گھر کے لیے لے جاؤں گا'' ان کے صاحبزادے اعجاز الحق کو بھی سموسے پسند ہیں اس لحاظ سے ملک کے وزیر اعظم بننے کے سارے امیدوار سموسے پسند کرتے ہیں جن میں ظفر اللہ جمالی، فاروق لغاری غلام مصطفیٰ جتوئی، عمران خان اور میاں اظہر نمایاں ہیں۔ حکومت کے مخالف سیاستداں بھی سموسوں کے مخالف نہیں ہیں۔ نوابزادہ نصر اللہ قاضی حسین احمد اور امین فہیم صدر کی دعوت میں گئے تو سموسے ضرور کھائیں گے۔ دو بار وزیر اعظم بننے والی بے نظیر بھٹو کو برگر آلو چھولے اور آئس کریم بھی پسند ہیں۔ چاکلیٹ کی رسیا ہیں کہیں مدعو ہوں تو کھانے سے پورا انصاف کرتی ہیں۔ نواز شریف روایتی کھانوں کے شوقین ہیں۔ ملک میں فارن انوسٹمنٹ کی حوصلہ افزائی کی خاطر بیف اور چکن برگر بنانے والی کمپنیوں کے آؤٹ لیٹ پر گئے۔ کلفٹن میں کے ایف سی گئے مسلم لیگ کے رہنما ساتھ تھے باہر نکلے تو پھول بیچنے والے جمع ہو گئے۔ نواز شریف نے لوگوں سے ہاتھ ملایا کچھ کو انعام دیا۔ پھر ان کی حکومت ہی ختم ہو گئی۔ بے نظیر ان کی حکومت میں سندھ کلب باقاعدگی سے سنڈے برنچ کے لیے جاتی تھیں۔ اب ان کو سندھ کلب گئے برسوں بیت گئے۔ بے نظیر بھٹو کو آسانی سے کہ سیاسی رہنماؤں سے فون اور ای میل پر رابطے میں رہتی ہیں اس طرح ان کو میزبانی کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ نواز شریف ای میل کے نہ عادی ہیں نہ شوقین، ان کا رابطہ مسلم لیگی رہنماؤں

سے فون پر رہتا ہے۔ کراچی میں مخدوم شاہنواز میاں صاحب سے رابطے میں رہتے ہیں۔ مخدوم شاہنواز اپنے کزن کے برعکس اچھے میزبان ہیں مگر مہمانوں کو چائے سموسے کے بجائے کھانا کھلانے کے قائل ہیں۔ اس لحاظ سے پیر پگاڑو کے جانشین ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے پسندیدہ سیاستدانوں اور مہمانوں کا خود انتخاب کرتے ہیں۔ کراچی کے ضیا عباس سیاستدانوں کو مدعو کرتے ہیں مگر اہم قومی مسئلہ پر۔ سیاستدانوں اور اخبار نویسوں دونوں کا خیال رکھتے ہیں۔ جوں جوں سیاست میں گرمی آ رہی ہے انتخابات قریب آ رہے ہیں۔ گھما گھمی بڑھ رہی ہے حکومت کے حامی اور مخالف دونوں مسلم لیگی سرگرم ہو رہے ہیں۔ مسلم لیگ (ق) کے حلیم صدیقی روایتی مہمان نوازی پر یقین رکھتے ہیں ان کے گھر کا انڈے کا حلوہ بہت پاپولر ہے، ان کے دوستوں کو دیکھ کر ان کا ملازم حلوہ لینے چلا جاتا ہے۔ سیاستدانوں کی خوش خوراکی پر ڈاکٹروں کو اعتراض ہوتا ہے اگر یہ لوگ پرہیز کریں گے تو ڈاکٹروں کو مریض کہاں سے ملیں گے۔

پاکستانی سیاستدانوں کی قلابازیاں



سیاستدانوں کے اصول و رموز اور مشاغل اور حرکات پر نظر رکھنا صحافیوں کیلئے چیلنج ہوتا ہے۔

یوسف خان کا نام پاکستان کے ان چند صحافیوں میں شمار ہوتا ہے جو پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مشاہدات کو تحریر کر رہے ہیں اور ان تحریروں میں انتہائی درجے کا توازن موجود ہے۔ ان کی تحریریں پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہیں اور ان میں کسی ایک پارٹی کی طرف جھکاؤ نظر نہیں آتا۔ یقیناً یہ امر خودغرضی اور لالچ سے بالاتر ہو کر ہی ممکن ہے۔

زیر نظر کتاب پاکستان کے ملکی حالات کی آئینہ دار ہے جو سیاستدانوں، طالب علموں، لائبریریوں اور ہر گھر کی ضرورت ہے۔

مقصود احمد چغتائی [illegible]